فکشن ہاؤس کا کتابی سلسلہ (27)

سہ ماہی

تاریخ

خاص نمبر: [illegible] اکبر

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ لاہور
فون: 7249218-7237430
E-mail:FictionHouse2004@hotmail.com

مجلّہ "تاریخ" کی سال میں چار اشاعتیں ہوں گی

خط و کتابت (برائے مضامین)

بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ

فون:6665997

ای میل:.lena@brain.net.pk

خط و کتابت (برائے سرکولیشن)

پبلشرز	☜	فکشن ہاؤس
	☜	18-مزنگ روڈ، لاہور
فون	☜	7249218-7237430
قیمت فی شمارہ	☜	150 روپے
سالانہ	☜	400 روپے
قیمت مجلد شمارہ	☜	200 روپے
بیرون ممالک	☜	2000 روپے (سالانہ معہ ڈاک خرچ)

رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام فکشن ہاؤس لاہور، پاکستان

اہتمام	☜	ظہور احمد خاں
کمپوزنگ	☜	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	☜	حاجی حنیف پرنٹرز لاہور
سرورق	☜	عباس
تاریخ اشاعت	☜	اکتوبر 2005ء

اکبر اور اس کا ہندوستان

مرتب : پروفیسر عرفان حبیب

ترجمہ : پروفیسر ریاض صدیقی

فکشن ہاؤس

18-مزنگ روڈ لاہور

فون:7249218-7237430

E-mail:FictionHouse2004@hotmail.com

فہرست

ابتدائیہ	ڈاکٹر مبارک علی	7
حرفِ اول	پروفیسر ریاض صدیقی	9
اداریہ	پروفیسر عرفان حبیب	19
1- حکمراں سرداروں کے خلاف اکبر کی ابتدائی مہمات	احسن رضا خان	21
2- اکبر اور راجپوت رجواڑے: سلطنت کے ساتھ ان کا الحاق	ایس عنایت۔اے۔زیدی	37
3- اکبر اور سندھ کا الحاق	سونیتا زیدی	51
4- سندھ کا مغل سلطنت سے الحاق: سفارتی اور فوجی تاریخ	فاطمہ زہرا بلگرامی	62
5- سکہ سازی کا غائب ہو جانا	نجف حیدر	90
6- اکبر کے فرامین کا سفارتی تناظر میں مطالعہ	اقبال حسین	99
7- اکبر کی شخصیت، خوبیاں اور دنیا کے بارے میں نقطہ نظر بہ نظر تنقید	اقتدار عالم خان	116
8- اکبر اور جین	پشپا پرشاد	138
9- اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں سائنس اور توہمات: علم فلکیات کے نظام کا مشاہدہ	شیریں موسوی	154

10- ابوالفضل کی آئین اکبری میں سائنسی تصورات	اقبال غنی خان	169
11- اکبراور ٹیکنالوجی	پروفیسر عرفان حبیب	181
12- اکبر کی سرپرستی میں مصوری بطور بیانیہ فن	سوم پرکاش ورما	209
13- فتح پور سیکری کا سفرِ مکرر: چند عمارتوں کی تشریح	سید علی ندیم رضوی	225
14- اکبراور موسیقی	فرانسوے نالینی ڈیل وو	238
15- ہندوستان کا ادراک: اکبراور ابوالفضل کے حوالوں سے	ایم۔اطہر علی	276
16- زمانہ وسطیٰ کا بنگالی ادب: عہد اکبری کے بنگال کے مطالعے کا ایک ماخذ	انیرودّھ ارے	291
17- اکبر کے زمانۂ اقتدار کے دوران سکھ تحریک	جے۔ایس۔گریوال	315
18- اکبراور سمندری بیوپار کی قلمرو میں پرتگالیوں کا عروج	کے۔ایس۔ماتھیو	330

دستاویزات

1- اکبر کا ایک فرمان 1558ء	سید ظہیر حسین جعفری	343
2- رام داس اور ماسٹر دیر کے حق میں اکبر کے ابتدائی فرامین	پروفیسر عرفان حبیب	348
3- سلطنت دکن 1591ء کے محصولات کا ایک تخمینہ	شیریں موسوی	369
4- ہندستانی کپڑوں کے موضوع پر 1603ء کی ایک ڈچ یادداشت	عشرت عالم	378
5- مقالہ نگاروں کے بارے میں		383

ابتدائیہ

اکبر تاریخ میں ایک متنازعہ شخصیت ہے۔ ہر وہ فرد کہ جو مروجہ روایات کے خلاف ہو، انہیں چیلنج کرے، ان پر سوالات اٹھائے، اور نئے خیالات و افکار کی بات کرے ایسا شخص ہمیشہ ہی ناپسندیدہ ہو جاتا ہے۔ خصوصیت سے ان لوگوں میں جو روایت پرست اور قدامت پسند ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے ہی لوگ اپنے خیالات سے معاشرے کے جمود کو توڑتے ہیں، خیالات کو آگے بڑھاتے ہیں، اور معاشرے میں تبدیلی لاتے ہیں۔

خیالات و افکار کی یہ توڑ پھوڑ جاری رہتی ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں نیا ذہن تخلیق ہوتا ہے۔ ادب، سائنس، معیشت، اور ٹیکنالوجی میں اضافے ہوتے ہیں۔ اگر معاشرہ قدامت پسندی اور قدیم روایات کو محفوظ رکھتے ہوئے ایک جگہ ٹھہرا رہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس معاشرہ کی سوچ اور فکر ٹھہر کر رہ گئی ہے۔

اکبر پاکستان کے معاشرے میں ایک ناپسندیدہ شخص ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کی وفات کے چار سو سال گذرنے کے باوجود ہماری روایت پرستی اپنی جگہ مضبوط ہے۔ ہم آج بھی اکبر یا ابوالفضل کے خیالات و افکار کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ ہماری تاریخ میں اکبر کے مقابلہ میں مجدد الف ثانی احمد سرہندی ہیں، جو مذہبی انتہا پسندی اور قدامت پرستی کے نقیب ہیں۔ ہماری تاریخ میں ان دو شخصیتوں کے بارے میں مورخین کی آراء اور ان کے فیصلوں سے ہماری ذہنیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اکبر کی وفات اکتوبر 1605ء میں ہوئی تھی۔ اس مناسبت سے ہم تاریخ کا یہ شمارہ اس کی یاد میں نکال رہے ہیں، چونکہ ہمارے ہاں مغل تاریخ پر اس عرصہ میں کوئی خاص کام نہیں ہوا،

اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ اکبر کے بارے میں ان تحقیقی مقالوں کا ترجمہ کرائیں جو 1992ء میں اکبر کی 450ویں سالگرہ کے موقع پر علی گڑھ یونیورسٹی کی ایک کانفرنس میں پڑھے گئے تھے۔

ان مقالات کی روشنی میں اکبر کی شخصیت کو اور بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی
25-اکتوبر 2005ء
لاہور

حرفِ اوّل

پروفیسر ریاض صدیقی

ہمارے یہاں پڑھے لکھے طبقے کا وہ حلقہ جو مختلف معلومات کے بارے میں سوچتا ہے اور ان کا موازنہ نئے زمانے کے مختلف مرحلوں سے خصوصاً یورپی صنعتی انقلاب اور ہندوستان پر نوآبادیاتی سامراج کے دوسرے دور (1800ء کے بعد کے) کرتا ہے۔ اس حلقے میں ان حوالوں سے زیادہ اہم، نمایاں اور موثر کردار دانشوروں اور مورخوں کا ہے۔ مختلف اور ایک دوسرے سے متضاد زمانوں سے موازنے کا یہ طریقہ کار یقیناً زندگی، توانائی اور آگے کی طرف بڑھت کی دلیل ہے بشرطیکہ موازنے کے بعد نتائج کا تعین حقائق کے تناظر میں کیا گیا ہو۔ بدقسمتی سے رواں دھارے کے بیشتر دانشوروں اور مورخوں کا انداز نظر اس حوالے سے نمایاں حد تک مایوس کن ہی دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے ماضی کے تاریخی حقائق کو بہت زیادہ مسخ کر دیا ہے۔ بٹوارے سے پہلے اکثر مورخوں اور دانشوروں نے اپنی پسند کی سیاسی تحریک کو جواز فراہم کرنے کے لئے زبان کی تاریخ، تہذیب کی تاریخ اور ماضی کے حکمرانوں کی تاریخ کے ساتھ بھی اسی طرح زیادتی کی تھی۔ جمہوری سامراجیت کی سیاست میں مذہب اور زبانوں وثقافتوں اور ماضی کی سیاسی تاریخ کو مفادات اور عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال کرنے کی روایت نے علمی معیار اور کلچر کی ساکھ کے اعتبار کو بہت دھچکا پہنچایا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تاثر وقت کی آواز بن گیا کہ برصغیر میں مسلمانوں کا بدترین دشمن صرف ہندو اور ہندستان ہے، اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، یورپ اور نوآبادیاتی سامراج ترقی، جدیدیت اور بہترین حکمرانی کی جامع مثال ہیں اور ان کے مقابلے میں ماضی کا ہندوستانی سماج پسماندہ، ٹھہرا ہوا، تصور پرست، توہمات کے جال میں گرفتار اور تعلیم سے محروم تھا۔ بیسویں صدی کے زیادہ تر مسلمان مورخوں

اور دانشوروں نے اپنی قوم کی رہنمائی کی بنیاد اول الذکر تاثر کو بنایا ہے اس طرح اصل کھری حقیقت کہ ہندستان میں مسلمانوں کے بدترین دشمن انگریز حکام، دانشور اور مورخ تھے مٹی کے نیچے دفن ہوگئی ورنہ ہندی کو ہندوؤں کی اور اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دینے، مذہب کی بنیاد پر دونوں میں دشمنی کی بنا استوار کرنے اور ماضی کے مسلمان حکمرانوں کو ہندوؤں کا دشمن ثابت کرنے کا مکمل اور کامیاب کردار انگریز حکام، دانشوروں اور مورخوں نے ادا کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ اگر موازنے کے لئے یورپ اور سابق نوآبادیاتی سامراج کے ترقی پذیر اور اب ترقی یافتہ زمانوں کو بنیاد بنایا جائے تو ماضی کے مطالعے کا یہ طریقہ کار ہی غیر سائنسی ہے۔ یہ تو پھر ریل گاڑی سے بیل گاڑی کا موازنہ ہی ہو کر رہ جائے گا جو کہ ایک مذاق سے زیادہ کوئی معنی نہیں رکھتا ہے ہاں اگر اسی زمانے کی بیل گاڑی کا مقابلہ اسی زمانے کی یورپی بیل گاڑیوں سے کیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بیل گاڑی اسی زمانے کے تناظر میں آوت جاوت کا ایک ترقی یافتہ ذریعہ تھی اور برصغیر میں بیل گاڑی کا استعمال سات ہزار برس پہلے اس زمانے میں ہوتا تھا جب یورپ تاریخ کی حدود سے غائب تھا۔ کسی عہد کا موازنہ اگر کسی دوسرے خطے کے زمانے سے کیا جائے تو لازم ہے کہ یہ معاصر زمانے ہی ہونا چاہئیں۔ قدیم ہندستان کے زمانے سے لے کر اٹھارہویں صدی کی شروعات کی تاریخ کا موازنہ ان ہی زمانوں کی یورپی تاریخ سے کیا جانا چاہئے۔ تب ہی صحیح نتائج کا تعین کیا جا سکے گا۔

ہمارے مورخوں اور دانشوروں کی اس غلط روی کے نتائج ملک اور قوم دونوں کے لئے نقصان کا باعث ہوئے اور اس گھاٹے کا بوجھ ابھی تک ملک اور قوم بھگت رہے ہیں کیونکہ تاریخ کے یہ مسخ بیانیے نہ صرف طالبعلموں کو پڑھائے جاتے ہیں بلکہ حکمراں طبقہ دولتمندوں کی اقلیت اور مذہبی ملاؤں کے جملہ مفادات کو جواز فراہم کرنے کے لئے بھی تاریخ کے ان بیانیوں کو سند کا درجہ دے کر ان کو استعمال کیا جاتا ہے۔

یورپی ملکوں اور امریکہ کی ترقی اور جدیدیت جس سے ہندستان اور پاکستان نے استفادہ کیا ہے ایک حقیقت ہے اور اس قسم کے استفادے کی مذمت کرنا جیسے کہ اردو کے بہت معتبر اور اردو دانوں کے ایک حلقے میں مقبول دانشور حسن عسکری نے کی ہے فکری دیوالیئے پن پر دلیل ہے لیکن جب ہم مرکنٹائیلیت کے مرحلے میں پہنچنے سے پہلے کے برطانیہ کی تاریخ پر نظر ڈالتے

ہیں تو یہ علاقہ اور یورپ کے دوسرے ممالک اس زمانے کے برصغیر کے مقابلے میں ہر اعتبار سے پسماندہ دکھائی دیتے ہیں۔ پاکستان کے حکمرانوں، علماء، دانشوروں اور مورخوں نے اس پہلو سے معاملہ نہیں کیا ہے بلکہ صنعتی انقلاب کے بعد کے یورپی ملکوں کے مقابلے اپنی ماضی کی تاریخ کو پسماندہ قرار دے کر اسے رسوا کیا ہے۔ ان کے اس موقف میں صحت کا صرف اتنا ہی عمل دخل ہے کہ یہ حقیقت ضرور ہے مگر بعد کے زمانے کی اس حقیقت کو ماضی میں تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ماضی کا اسی ماضی کے معاصر ماضی کے ساتھ موازنہ کیا جانا چاہئے تھا۔ اس حقیقت کے باوجود جو ہے اور جس کا اول الذکر اہل الرائے چرچا کرتے ہیں وہ اکیسویں صدی کے انتہائی ترقی یافتہ زمانے سے اپنے ملک کا موازنہ کیوں نہیں کرتے ہیں۔ اس وقت بھی جب امریکہ کے ماہر سائنس دانوں نے نظام شمسی میں دسویں سیارے کو تلاش کرلیا ہے آپ کو اپنے ملک میں ان دیہاتوں کا جنگل ملتا ہے جہاں ملک کی بہت بڑی اکثریت اب بھی سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں جیسی زندگی بسر کر رہی ہے۔ پاکستان میں چھوٹے بڑے شہروں کی تعداد دس فی صد جبکہ اول الذکر دیہاتوں کی تعداد نوے فی صد ہے۔ پچھلے برس (2004ء) میں کراچی سے صرف نوے کلومیٹر دور براد آباد ریلوے اسٹیشن پر شالیمار ایکسپریس کا حادثہ ہوا تھا۔ یہاں زخمیوں کے لئے پینے کا پانی دستیاب نہیں تھا۔ دو گھنٹے پیاس سے پریشان ہونے کے بعد بہت سے دیہاتی پانی لے کر آئے اور زخمیوں سے کہا کہ وہ صرف ایک ایک گلاس پانی کا پئیں کیونکہ علاقے میں میلوں تک باقی نہیں ہے۔ وہ کئی میل دور سے بہت مشکل سے پانی جمع کر کے لائے ہیں۔ براد آباد کے ویران اسٹیشن سے کوٹری اور حیدرآباد کے شہر صرف تیس کلومیٹر دور تھے مگر وہاں تک حادثے کی اطلاع پہنچنے میں کئی گھنٹے لگے تھے۔ اس قسم کے حادثات ہمارے یہاں روزمرہ کا معمول ہیں۔ پچھلے دنوں (اگست 2005ء) میں تو ایک ایک ایسا حادثہ بھی ہوا جو ترقی کے دعوے داروں کے منہ پر ایک طمانچہ تھا۔ گوٹکی سے کچھ دور ایک ویران اسٹیشن سرحد پر کوئٹہ سے آنے والی ریل گاڑی کھڑی تھی۔ دوسری طرف سے آنے والی تیز رفتار کراچی ایکسپریس نے اسے ٹکر ماری تو دونوں گاڑیوں کے کئی ڈبے الٹ کر دوسری ریلوے لائن پر جا گرے، کچھ دیر گزرنے کے بعد جب کراچی سے آنے والی تیز گام اپنی پوری رفتار کے ساتھ آئی تو وہ بھی گرے ہوئے ڈبوں سے ٹکرا کر حادثے کا شکار ہوگئی تین ٹرینوں کا اس طرح یکے بعد دیگرے

ٹکرانا اور کم یا زیادہ دو سو مسافروں کی موت کس قدر مضحکہ خیز واقعہ ہے۔ اس کے برعکس یورپی ملکوں اور امریکہ میں دیہاتوں کی تعداد بہت کم ہو چکی ہے اور جو دیہات ہیں وہ بھی ترقی یافتہ ہیں۔ اسی طرح اول الذکر جیسے حادثات کا اب وہاں کوئی تصور باقی نہیں رہا ہے۔

اس معروضی تناظر میں ضروری ہو جاتا ہے کہ ہمارے دانشور اور مورخ ماضی کی تاریخ کی بڑھت اور جائزہ کاری کا موازنہ صرف اسی زمانے کے یورپی ملکوں سے کریں اور دیکھیں کہ زمانہ مرکنٹائیلیت اور صنعتی انقلاب سے پہلے کے یورپ کا کیا منظر تھا اور اسی زمانے کے برصغیر کا کیا منظر تھا جہاں شہر آگرہ کی آبادی اس وقت کے شہر لندن سے زیادہ تھی۔ تیرہویں صدی میں پیسا کا مینار بننے سے پہلے ہندستان میں قطب مینار بن چکا تھا۔

ماضی کی تاریخ کا تقابلی مطالعہ اگر سائنسی طریقہ کار کی بنیاد پر ہو تو پھر سورج برصغیر اور چین کے افق پر چمکتا ہوا دکھائی دے گا جو ان دنوں کے یورپی ملکوں کی راتِ کے چاند کو روشنی مہیا کرتا تھا۔ 1700ء کے ختم سے پہلے برصغیر اتنی ہی بڑی عالمی اقتصادی، صنعتی، مالیاتی، کاروباری اور سیاسی و دفاعی قوت تھا جس قدر کہ اب امریکہ ہے۔ اس زمانے کی عالمی قوت برصغیر نے یورپی ملکوں کو ان کی روزمرہ کی ضروریات کا مال فراہم کرنے کے باوجود برصغیر سے باہر جا کر دوسرے ملکوں کے وسائل پر قبضہ کرنے کا کردار نہیں ادا کیا اور غالباً یہی وجہ تھی سمندر کی سیاسی اہمیت کا یہ قوت ادراک نہیں کر سکی حالانکہ سمندری جہاز بنانے کی صنعت ہندستان میں موجود تھی۔ اکبر کے زمانے میں جہاز بنانے کی صنعت لاہور میں تھی جہاں سے تیار ہونے والے جہاز دریا کے ذریعہ سمندر کو بھیجے جاتے تھے۔ ایک نئے تیار ہونے والے جہاز کو دریائے راوی میں اتارنے کا افتتاح کرنے کے لئے اکبر خود گیا تھا۔ اس کے باوجود ہندستان کے سمندری جہازوں نے یورپی ملکوں کی طرح پندرہویں اور سولہویں صدیوں کے دوران کھلے سمندروں پر قبضہ جما کر لوٹ مار کا بازار گرم نہیں کیا اور اپنی اس غلطی کا قرض بھی ان کو ادا کرنا پڑا جب پرتگال کے سمندری لٹیروں نے سولہویں صدی میں برصغیر کے پوربی سمندری ساحل کے بعض مقامات پر قبضہ جما لیا تھا۔ مغلوں نے لڑائی کے لئے دریائی لڑاکا کشتیوں کا بیڑہ ضرور تیار کر لیا تھا مگر سمندری لڑاکا جہازوں کا بیڑہ انہوں نے نہیں بنایا تھا بلکہ اکبر سے پہلے کے بادشاہوں نے سمندر کو دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ اکبر کو بیرم خاں جب وہ سندھ کے ایک

علاقے کو فتح کر چکا تھا سمندر دکھانے کے لئے کراچی لے گیا تھا جہاں بادشاہ کشتی میں بیٹھ کر منورا جزیرے پر گیا تھا۔ اسی نے پہلی بار محسوس کیا تھا کہ لڑائی کے سمندری جہاز ہونا چاہئیں چنانچہ اس قسم کے جہازوں کی تیاری کا اس نے حکم بھی دیا تھا مگر بہت دیر ہو چکی تھی اور پرتگال کے لڑاکا بحری جہازوں کا طاقتور بیڑہ اپنی اجارہ داری قائم کر چکا تھا۔ تمام دنیا کے ملکوں میں ہندستانی بیوپاریوں نے اپنے بیوپاری مراکز بنا رکھے تھے جہاں وہ ہندوستانی عملہ بھی رکھتے تھے۔ بہت سے ملکوں میں انہوں نے بازار بھی بنا لئے تھے۔ ان کے بینکار باہر کے ملکوں کے سرکاری امراء اور خود سرکار کو سود پر قرضے بھی دیا کرتے تھے۔ ابتدائی زمانے میں ہندستان کی ایسٹ انڈیا کمپنی بھی بینکار ہندستانیوں سے ہی سود پر قرضے لیا کرتی تھی مگر اپنی اس نمایاں طاقتور حیثیت سے باہر کے ملکوں میں انہوں نے سیاسی کھیل کھیلنے کی کوشش نہیں کی۔ بعض جدید دانشور اور مورخ تو اسے ان کی بیوقوفی ہی سمجھتے ہیں لیکن یہ سمجھنا ان کی کردار کشی ہے۔ اس رویئے کو اس زمانے کے ہندستان کے تناظر میں دیکھنا چاہئے جہاں وہ سب کچھ تھا جو یورپی ملکوں میں نہیں تھا اور یہ سب کچھ جو تھا ہندستان ہی کے وسائل اور اس کی دولت کی دین تھا ہندستان کو باہر کے سرمائے اور وسائل پر اکتفا کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان کو ننگے بھوکے اور پسماندہ یورپ پر قبضہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ ابتدائی زمانے یعنی سولہویں، سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں کے دوران ہندستان میں پرتگالیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں کے بیوپار کو انہوں نے بیوپاری تعلقات کے تناظر ہی میں دیکھا اس کے پیچھے ان کے جو سیاسی عزائم کارفرما تھے اس تک پہنچنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ہندستان کی دولت کا اندازہ کرنا محال تھا۔ 1591ء میں احمد نگر جیسی چھوٹی سی دکنی سلطنت کی سالانہ جمع ایک ارب چوالیس کروڑ تنگے تھی۔

ماضی کے حقائق کی شان وشوکت اپنی جگہ مگر یہ سمجھ لینا کہ اس زمانے کے بادشاہ، راجے اور مہاراجے بہت عوام دوست ہوا کرتے تھے صحیح نہیں ہے۔ ان کا انداز حکمرانی بھی سامراجی ہی قسم کا تھا۔ وہ بھی عوام پر مظالم توڑتے تھے۔ ان میں سے چند ہی ہوں گے جنہوں نے عوام دوستی کا مظاہرہ بھی کیا تھا جیسے کہ اپنے زمانہ دوم کا اشوک اعظم، محمد بن قاسم، شیر شاہ اور اکبر وغیرہ۔ لیکن بیشتر ان خوبیوں سے عاری تھے۔ اس کے باوجود بھی جب ہم ان کے مظالم اور

ناانصافیوں کا موازنہ آج کے زمانے کے یورپی اور امریکی حکمرانوں سے کرتے ہیں جیسے (سابق نوآبادیاتی سامراج، جرمنی کا ہٹلر اور امریکہ کے ٹرومین اور بش خاندان) تو ان کے مقابلے میں چنگیز خاں، ہلاکو، نادر شاہ، احمد شاہ وغیرہ شرمندہ دکھائی دیتے ہیں۔ آزادی، جمہوریت اور انسانی حقوق کے پرچارک امریکہ کے صدر ٹرومین نے اگست 1945ء میں ایٹم بمب گرا کر جاپان کے دو بڑے شہروں کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا تھا اور لگ بھگ تین لاکھ بے گناہ جاپانی مردوں، عورتوں اور بچوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ یہ سب کچھ صحیح ہے مگر اپنے ماضی کی شان و شوکت کے رومانس میں موجودہ زمانے کے لوگوں کا مبتلا ہونا ایک ایسا رویہ ہے جس کی مذمت جتنی بھی کی جائے کم ہے۔ ہمیں یہ محسوس کرنا چاہئے کہ ہمارے آباواجداد اگر سلطان تھے تو ہوں گے اب ہم کیا ہیں اور کس حالت میں ہیں۔ ماضی کی مذمت کر کے اسے اٹھا کر پھینک دینا اور ماضی کی شان و شوکت کو خود پر سوار کر کے اس پر فخر کرنا دونوں مریضانہ رویئے ہیں۔ ماضی کی شان و شوکت اسی صورت میں قوم کی پہچان ہو سکتی ہے جب وہ اپنے زمانے کے عالمی معیار کے مطابق ترقی کر کے خود کفیل ہو چکی ہو۔ بدقسمتی سے پاکستان اور دوسرے مسلمان ممالک اب بھی نیم پسماندہ اور عالمی امریکی قوت کے طفیلی ہیں جبکہ جاپان، ہندستان اور چین ایشیا کے بڑے ترقی یافتہ ممالک بن چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے ماضی کی تاریخ کی شان و شوکت کے تسلسل میں اپنے زمانے کے تقاضوں سے مطابقت پیدا کی اور ان کی تکمیل کر لی۔

ہمارے بیشتر مسلمان مورخوں نے یہ غلطی بھی کی کہ ماضی کے تاریخی بیانیوں سے صرف ان اجزا کو مستعار لیا جو حکمراں طبقہ کے سیاسی مفادات اور مذہبی علماء کے نقطہ ہائے نظر کے لئے کارگر تھے۔ اس سے ہٹ کر انہوں نے انگریز مورخوں، دانشوروں اور سفرنامہ نویسوں ہی کے موقف پر انحصار کیا اور اسی کو سند جانا حالانکہ یہ موقف سراسر جھوٹ کا انبار ہے جس کو انہوں نے منطقی جواز فراہم کر کے سچ بنا دیا۔ ایسا کرنا ہندستان پر حکمراں نوآبادیاتی راج کے مفادات کا مسئلہ تھا۔ وہ ایک اجنبی قوم کی حیثیت سے ہندستان پر قابض ہوئے تھے۔ ان کا مقصد ہندستانی بادشاہوں کی طرح ہندستان کا مفاد نہیں تھا بلکہ ہندستان کی بے پناہ دولت، قیمتی وسائل اور خام مال کے ذخائر کو سمیٹ کر برطامیہ کو منتقل کرنا تھا سو اپنی حکمرانی کو جواز فراہم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہندستان کی تاریخ کے منہ پر بھی کالک ملیں۔ انہوں نے آریائی نسل کا نظریہ

تراشا اور دعویٰ کیا چونکہ وہ بھی آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ہندستانی آریائی نسل سے ان کا رشتہ فطری ہے۔ اپنے اقتدار کو مزید مستحکم کرنے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو لڑایا جائے چنانچہ انہوں نے ہندستان کے مسلمان حکمرانوں کی کردار کشی کی اور یہ ثابت کیا کہ ان مسلمانوں نے ہندو اکثریت پر مظالم ڈھائے ان کے مندروں کو تباہ کیا اور زبردستی ان کو مسلمان ہونے پر مجبور کیا۔ اس طرح انہوں نے بہت بڑی ہندو اکثریت اور مسلمان اقلیت کے وجود کا شعور مستحکم کیا۔ اپنے انتظامی معاملات میں بھی انگریزوں نے زیادہ ترجیح ہندوؤں کو دی۔ مسلمانوں کو ہندستانی قوم کے رواں دھارے سے الگ کرنے اور ان میں جوش و ولولے کو ابھارنے کے لئے انگریز حکام اور مورخوں نے محمود غزنوی، محمد بن قاسم، اورنگ زیب، ملا بدایونی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کو بطور مسلمانوں کے مثالی ہیرو سربلند کیا جب کہ ماضی کے فارسی بیانیوں میں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اس قسم کی ترغیبات نہیں ملتی ہیں۔ ہمارے دانشوروں اور مورخوں میں بیشتر کا یہ موقف ہے کہ ہندستان میں جدید طریقے سے تاریخ نویسی کی بنا انگریز مورخوں نے استوار کی ہے جس کا مقابلہ ماضی کے تاریخی بیانیوں اور سفرناموں سے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ موقف بھی پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ ہم اگر یہ کہیں کہ ماضی کے مورخوں نے بادشاہوں اور امراء کے مفادات کو تقویت پہنچانے اور جواز فراہم کرنے کے لئے تاریخ مرتب کی تو انگریز مورخوں کے زیر نظر بھی نوآبادیاتی سامراج اور عیسائیت کے پرچار جیسے مفادات تھے۔ انہوں نے جو کام عوام کا حوالہ دے کر کیا ہے اس کا مقصد بھی مختلف علاقوں میں علاقائی، نسلی، ثقافتی اور لسانی بنیادوں پر اختلافات کے شعور کو ہوا دینا تھا۔ اس موضوع پر ان کے موقف میں تضادات ہیں مثلاً سندھ میں انہوں نے مقامی سندھی زبان کی کمر تھپتھپائی تھی اور اس کے رسم الخط کو متعین کیا تھا مگر دوسری طرف پنجاب میں انہوں نے اردو زبان کی کمر تھپتھپائی اور پنجابی کی طرف توجہ نہیں دی۔ پنجاب کے مسلمانوں کے خلاف انگریز حکام سکھوں کو مستحکم کیا تھا اور پنجاب میں رنجیت سنگھ کے راج کو ہر طرح تقویت پہنچائی تھی وغیرہ۔

اس موضوع کا احاطہ کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ تاریخ نویسی، سفرنامہ نگاری اور تجرباتی سائنس کے اولین بانی عرب مسلمان تھے جنہوں نے یونان کے غیر

عملی علوم اور سائنسی ذخائر کا عربی میں ترجمہ کروا کر ان سے استفادہ کیا تھا۔ سائنس میں تجربہ کا رواج یونانیوں میں نہیں تھا یہ اہم اضافہ اور تجربہ گاہوں کے قیام کا کارنامہ عرب مسلمانوں ہی کی دین ہے۔ یورپ کے علماء نے تاریخ نویسی، سفرنامہ نگاری اور تجرباتی سائنس کا راستہ ان ہی عرب مسلمانوں کی انگلی پکڑ کر کیا تھا۔ ہندستان سے متعلق اولین مستند بیانیہ البیرونی کا کتاب الہند ہے۔ ہندستان کے بارے میں بھی انگریزوں سے پہلے جتنا کچھ لکھا گیا تھا اور جس کی مقدار خاصی زیادہ ہے وہ سب ہندستان کے مسلمان قلمکاروں ہی کا کام ہے۔ ہندستان کے بارے میں جب انگریزوں نے قلم اٹھایا تو ماضی کے ان ہی تمام بیانیوں سے انہوں نے بھی استفادہ کیا تھا یہی وجہ ہے کہ ماضی کے تمام بیانیوں اور سفرناموں کے ذخیرے کو انہوں نے ترجمہ کر کے فارسی سے انگریزی میں منتقل کیا تھا۔ ان بیانیوں کے ترجموں میں جب جہاں ان کو موقع ملا انہوں نے بین السطور بارودی سرنگیں بچھا دیں مثلاً فارسی بیانیوں کے ذخائر میں سے کسی میں بھی رام مندر کو گرا کر بابری مسجد کی تعمیر کا حوالہ نہیں ہے حتیٰ کہ تلسی داس جی نے ایودھیا ہی میں تھے اپنی رامائن میں بھی رام مندر کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ایک انگریز محترمہ بیورج نے جنہوں نے اکثر فارسی بیانیوں کا ترجمہ کیا ہے اپنے ایک ترجمہ میں رام مندر اور بابری مسجد کا شوشہ چھیڑا تھا اور اسی ترجمے سے یہ مسئلہ کٹر پنتھی ہندو سیاست کے ہاتھ لگا جس کو بنیاد بنا کر 1951ء میں کچھ کٹر پنتھی ہندوؤں نے بابری مسجد کے اندر مورتیاں رکھ دی تھیں اور پھر یہ قصہ بابری مسجد کے انہدام پر تمام ہوا۔ ماضی کے ان فارسی بیانیوں کے ذخائر اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہیں جس قدر کہ انگریز مورخوں اور دانشوروں نے ان کو سمجھا ہے۔ اپنی بہت کمزوریوں کے باوجود جیسا کہ رومیلا تھاپر نے بھی لکھا ہے ان بیانیوں سے ہمیں بہت کچھ حقائق بھی ملتے ہیں اور جب ان کا تقابلی مطالعہ انگریزوں کے بیانیوں سے کرتے ہیں تو بہت سے تضادات کی گود سے حقائق کا تعین ہو جاتا ہے۔ ماضی کی تاریخ کے بارے میں بہت کچھ بے سروپا بھی لکھا گیا ہے جن کی حیثیت محض خیالی کہانیوں کی ہے مثلاً انارکلی کا قصہ۔ انارکلی تو اصل میں اکبر کی ایک منکوحہ کنیز تھی جو شہزادہ سلیم کے زمانے میں ہی جوانی کی حدود سے گزر چکی تھی۔ انارکلی اور سلیم کی عشقیہ داستان کے خیالی قصے کو انارکلی ڈرامہ لکھ کر امتیاز علی تاج نے خوامخواہ کی سند فراہم کی۔

اس کے بعد فلم سے منافع کمانے والوں نے اس خیالی قصے کو فلما کر اسے امر کر دیا۔ اسی

طرح یہ موقف بہت عام ہے کہ تاج محل کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد شاہ جہاں نے محنت کش معماروں کے ہاتھ کٹوا دیئے تھے۔ تاریخ کے حوالے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ تاج محل کی تعمیر مکمل ہونے میں بائیس سال کا عرصہ صرف ہوا تھا اور اس پر چار کروڑ اٹھارہ لاکھ اڑتالیس ہزار آٹھ سو چھبیس روپیہ سات آنے چھ پائی خرچ ہوا تھا۔ تاریخی حوالے میں ان تینتیس ہندو اور مسلمان محنت کش مزدوروں کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان معماروں کو اُن کی محنت کا جو معاوضہ ملتا تھا وہ آج کے پاکستانی راج کو ملنے والے معاوضے سے کئی گنا زیادہ تھا۔ مثلاً امانت خان طغرا نویس کو ایک ہزار روپیہ، چرنجی لال پچی کار کو آٹھ سو روپیہ۔ سب سے کم معاوضہ منوہر سنگھ پچی کار اور موہن لال پچی کار کو صرف دو سو روپیہ ملتا تھا۔ اکبر آبادی نے یہ تفصیلات ماضی کی انتیس کتابوں کے حوالے سے قلمبند کی ہیں۔

یہ ہے وہ معروضی تناظر جس میں عرفان حبیب کی مرتبہ کتاب ''اکبرس کا ہندوستان'' کا زیرِ نظر اردو ترجمہ ''اکبر کا ہندوستان'' ایک قیمتی سرمائے کی صورت میں پہلی بار ڈاکٹر مبارک علی کی تحریک پر شائع ہو کر پاکستان میں تاریخ پڑھنے والوں، مورخوں اور تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کے سامنے آ رہا ہے۔

زیرِ نظر کتاب اصل میں تاریخی تحقیق کے اس جدید سائنسی منصوبے کے زیرِ اہتمام مرتب کی گئی ہے جو ہندوستان میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس میں تاریخ پر تحقیق کرنے والے معتبر دانشوروں کے مختلف پہلوؤں پر مطالعہ شامل ہیں جن کے ساتھ کچھ اہم دستاویزات بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ ان مضمونوں کے پڑھنے کے بعد پڑھنے والے اس حقیقی اکبر سے ملیں گے جو کہ وہ اپنی مجموعی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ تھا۔ یہ نہ ہندوؤں کا ہیرو اکبر ہے جو دینِ الٰہی، راجپوت عورتوں کے ساتھ بیاہ، ہندو رسومات کی ادائیگی کی وجہ سے ان کا ہیرو بن گیا اور نہ وہ اکبر ہے جو ان ہی وجوہات کی بنا پر مسلمانوں کے لئے راندہ درگاہ بن گیا۔ اصل میں وہ ایک سنی مسلمان، صوفی، روشن نظر، تعقل پسند، عوام دوست، دردمند دل رکھنے والا، دانشور اور علم و ادب کا ذوق و شوق رکھنے والا اکبر ہے جس نے موجودہ دور کے ہنرمند اور منجھے ہوئے حکمرانوں کو اپنی عملی مثال کے ذریعہ اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ ایک کثیر الثقافتی اور کثیر العقائد سماج پر جس میں بہت بڑی اکثریت کا ایک کٹر عقیدہ ہو ایک اچھے اور سمجھ دار مسلمان کو کس طرح حکومت کرنا چاہیئے۔ اکبر ہی کی یہ عطا کی ہے کہ اس نے ایک ایسے دیس میں مسلمانوں کے

اقتدار کو استحکام اور اعتبار بخشا اور ہندستان کی مسلمان اقلیت کے وجود کو مستقبل فراہم کیا۔ برصغیر کے مسلمانوں کو تو اصل میں اکبر کا مرہون منت ہونا چاہیے جس نے محفوظ مستقبل عطا کیا ورنہ اگر وہ اس وقت جبکہ ابھی بالغ بھی نہیں ہوا تھا راجپوت ہیمو سے ہار جاتا تو ہندستان میں مسلمانوں کا وجود بھی آٹے میں نمک کے برابر ہی ہوتا۔ ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی طرف جو مذہبی کٹر پنتھیت تھی اس کے طوفان میں ایک تیسرا متبادل راستہ پیدا کرنا اکبر کے ذاتی عقیدے کا معاملہ نہیں اس کی سیاست کا ہُنر تھا۔

اپنے اقتدار کے ابتدائی زمانے میں وہ کٹر سنّی تھا اور اپنے اقتدار کے آخری مرحلے میں ایک بار پھر اس نے اپنے سنّی عقیدے کا اظہار کر دیا تھا۔ درمیانی زمانے میں جب اس پر یہ الزام لگ چکا تھا کہ وہ مسلمان نہیں رہا ہے اور اس کے درباری مورخ جو خود کٹر پنتھی مسلمان تھا ملا بدایونی نے جی بھر کر اس کی کردار کشی کی تھی اس نے ایک عجیب ڈراما رچایا جس کے ذریعہ اس نے خاموش انداز میں یہ تاثر دیا کہ اسلام ہی سچا دین ہے۔ اس ڈرامے کا تعلق سورج گرہن سے ہے جس کے متعلق یہ توہم عام تھا کہ اگر گرہن سے پہلے بادل آ کر سورج کو نہ ڈھانپ لیں تو یہ گرہن بادشاہ پر بھاری پڑتا ہے۔ شاہی محل کے متعلقین نے جب اکبر کو اس سے آگاہ کیا تو اس نے حکم دیا کہ سب برہمنوں کو بلاؤ اور ان سے کہو کہ وہ اپنا ہون اور اپنی وہ رسومات ادا کریں کہ بادل سورج کو آ کر ڈھانپ لیں۔ تمام کوشش کے باوجود وہ ناکام ہو گئے اور بادشاہ کے پیروں پر گر کر معذرت کرنے لگے۔ بادشاہ نے ان کو کچھ نہیں کہا اور خود صوفی بزرگ بن کر بارگاہ الٰہی سے لو لگا کر بیٹھ گیا اور دعا مانگتا رہا۔ اس عمل کے بعد بادل آ گئے اور سورج کو ڈھانپ لیا۔ یہ واقعہ صحیح ہے یا غلط مگر بادشاہ نے اگر واقعہ صحیح ہے اینٹ کا جواب پتھر سے اس طرح دیا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

زیر نظر اردو ترجمہ جس کا اصل انگریزی متن بھی دستیاب ہے تاریخ کے قبلہ میں جو ٹیڑھا پن پیدا ہو گیا ہے اسے سیدھا کرنے میں موثر وسیلہ ثابت ہو سکتی ہے بشرط کہ مورخوں اور دانشوروں نے اس کا مطالعہ اپنے روایتی تعصبات سے بچ کر کیا جس کا امکان کم ہی ہے۔

❀❀❀❀❀

اداریہ

اکبر کی چار سو پچاسویں سالگرہ کے حوالے سے 1992ء میں قومی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ان تقاریب کا ایک منافع یہ بھی ہوا کہ انہوں نے اکبر اور اس کے زمانہ اقتدار پر تحقیق کے لئے جس تحریک کی ضرورت تھی اس کو مہیا کر دیا۔ اس حوالے سے جو تحقیقات ہوئیں ان کے نتائج سے متعلق کچھ جامع مضامین زیر نظر جلد میں یکجا کر کے پیش کئے گئے ہیں۔ اس مجموعے میں جن مضمونوں کے اصل متون کو شامل کیا گیا ہے وہ اکتوبر 1992ء میں منعقد ہونے والے تاریخ کے وسیع تر مطالعے کے مرکز (Centre of Advance Study in History) کے زیر اہتمام سیمینار میں پڑھے گئے تھے جو علی گڑھ یونیورسٹی کی سرپرستی میں ہوا تھا۔ اس سیمینار کا کوارڈینیٹر راقم تھا۔ اس کے علاوہ جو مطالعاتی مواد جس میں کچھ مقالے، بیشتر دستاویزات اور تاریخ کی کتابوں پر تبصرے ہیں وہ خصوصی طور پر اس مجموعے کے لئے بھیجے گئے تھے۔

زیر نظر مجموعے کو پروگرام کے مطابق "تاریخ کے وسیع مطالعے کے مرکز" ہی کے زیر اہتمام شائع ہونا تھا۔ بطور اس مجموعے کے مدیر کے میرا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا لیکن مئی 1996ء میں مجھے زیر حوالہ مرکز سے اچانک علیحدہ کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سیاسی فضا کا موڑ تھی[1] مرکز سے باہر ہو جانے کی بنا پر اس مجموعے کی اشاعت کے پروگرام میں بھی تبدیلی کا باعث ہوا۔ بہت سے ٹیکنیکی کام کو دوبارہ مکمل کرنے اور مجموعے کے عکسی مسودے کی تیاری کے بعد اب یہ مجموعہ شائع ہو رہا ہے جو کہ اجتماعی مطالعات کا پہلا سلسلہ بھی ہے۔ ان کا ہر موضوع قدیم زمانے کے مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔

---

1. غالباً مرتب کا اشارہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی سرکار کی طرف ہے۔

یہ نشان زد کرنا مفید ہوگا کہ یہاں ترجمے کے جس نظام کو ترجیح دی گئی ہے جس کو اپی گرافیا انڈیکا نے ہندستانی زبانوں اور اسٹائن گاس نے فارسی کے لئے فارسی انگریزی لغت میں استعمال کیا تھا۔ باوجود اس کے جہاں کہیں مقالہ پیش کرنے والوں نے دوسرے جانے مانے نظاموں سے استفادہ کیا ہے اور مقامی حروف والفاظ کو عموماً تبدیل نہیں کیا گیا ہے۔ جگہوں کے ناموں کے لئے جدید ہجّوں کو ترجیح دی گئی ہے۔

اس مجموعے کے متن کو پڑھنے کی ذمہ داری حضرات شعیب احمد اور منیر خاں نے ادا کی ہے۔ ان ہی دونوں نے مسودے کی عکسی کاپی بھی تیار کی ہے۔

اکبر اور اس کا ہندستان کی اشاعت کے آخری مرحلے میں جو کہ مشکل مرحلہ تھا مجھے حضرات پروفیسر ایم اطہر علی، پروفیسر اقتدار عالم خاں اور شیریں موسوی کی پُرخلوص توجہ اور ان کا تعاون حاصل رہا تھا۔ میں مرکز کی شاندار لائبریری کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے مجھے اپنا سمجھا۔ میں تمام مقالہ نگاروں جنہوں نے مقالات بھیجے اور آکسفورڈ یونیورسٹی کا بھی شکرگزار ہوں جنہوں نے اس کام کی اہمیت کو سمجھا اور تعاون پیش کیا۔

علی گڑھ — پروفیسر عرفان حبیب
فروری 1997ء

حکمراں سرداروں کے خلاف اکبر کی ابتدائی مہمات

احسن رضا خان

طاقتور جنگجو اپنی حکمرانی کے علاقائی حدود میں اضافہ کرتے رہتے تھے جس کے نتیجے میں نسبتاً کمزور حریف حکمرانوں کی حکمرانی کا تختہ الٹنا یا ان کو اپنا تابعدار وفادار بنا لینا ہندستان کی تاریخ میں سلطنت سازی (یا ایمپائر سازی) کی روایت کا لازمی حصہ تھا۔ زمانہ قدیم کے ہندستان میں بھی موجودہ زمانے کے مورخوں نے دریافت کیا ہے کہ سلطنت ساز جنگجو حکمرانوں علاقائی توسیع کی مہمات سر کرتے تھے جس کی وضاحت ان مورخوں نے کی ہے۔ ان کا عزم یہ ہوتا تھا کہ اہم مرکزی قلعوں، چوکیوں، آوت جاوت کے راستوں اور سمندر تک جانے والے راستوں پر کنٹرول حاصل کریں کیونکہ تجارت اور ویاپار پر کنٹرول یا ان پر محصولات لگانے کے لئے سمندری راستے ضروری ہوتے تھے۔

مغل سلطنت بن جانے کے بعد جب اس کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خودمختار اور نیم خودمختار سرداروں کے کنٹرول میں بہت سے علاقے بھی تھے جن پر ان کا موروثی راج قائم تھا۔ اس لئے راجاؤں، راناؤں، راوتوں، راؤں اور بہت سے دوسرے اصطلاحی نام رائج تھے لیکن فارسی بیانیہ نگاروں نے ان مختلف ناموں کے لئے ایک ہی لفظ زمیندار استعمال کیا ہے۔ ان مقامی حکمرانوں کا ایک مضبوط قلعہ تھا۔ اکبر کے زمانہ اقتدار میں ان کی حیثیت اور ان کا

☆ اس مقالے کی تیاری کے دوران میرے اپنے ہم پیشہ ساتھی چیتن سنگھ سے جو تبادلہ خیالات ہوا تھا اس سے میں نے بہت فائدہ حاصل کیا تھا۔

کردار کیا تھا؟ اس کا ذکر کسی دوسرے مضمون میں آئے گا۔(1) ان میں سے بعض مقامی حکمرانوں کی سلطنت کا طول وعرض کئی سوکلومیٹرز میں تھا۔ جس کے حوالے ابوالفضل نے دیئے ہیں۔ ان پر اعتبار کیا جائے یا نہ کیا جائے یہ ایک علیحدہ معاملہ ہے۔ بہت سے حکمرانوں کی کمان میں پیدل فوج کی تعداد اکبر کے بڑے سے بڑے منصب دار سے زیادہ تھی۔ اپنے زمانہ اقتدار میں اکبر نے ان مقامی حکمرانوں سے معاملات طے کرنے کے لئے ایک پالیسی وضع کی تھی جو کسی بنیادی بدلاؤ کے بغیر مغل سلطنت کے زوال تک جاری رہی۔(2)

اکبر کے ماتحت سرداروں کو زیر کرنے اور سلطنت کا وفادار بنانے کا طریقہ کیا تھا؟ کیا یہ بے ترتیب باہمی لڑائیوں کا تھا یا کسی مفاہمتی کوشش سے طے پانے والا کوئی طریقہ تھا؟ بتایا گیا ہے کہ ہندستان کو دوبارہ فتح کرنے کے لئے ایران سے چلتے ہوئے شاہ ایران نے ہمایوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ افغانوں کے بجائے راجپوتوں سے تعلقات بنانے کی کوشش کو ترجیح دے کیونکہ راجپوت زمیندار تھے اور بغیر زمینداروں کو رام کئے اور ان پر کنٹرول حاصل کئے ہندستان جیسے دیس میں سانس لینا مشکل ہوگا۔ اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے جب ہمایوں نے اپنا گنوایا ہوا تخت وتاج دوبارہ حاصل کرلیا تھا تو اس نے ایرانی بادشاہ کے مشورے کو اپنی وفات سے پہلے وصیت کے ذریعہ اپنے بیٹے اکبر تک پہنچا دیا تھا۔(3) اس کے بارے میں یہ سوال کہ اکبر نے اس راجپوت زمیندار طبقے کی اہمیت کو محسوس کیا تھا اور ان سے اقتدار کے معاملات پر رابطے رکھے تھے موزوں نہیں ہوگا بلکہ یہ اندازہ کرنا زیادہ بامعنی ہے کہ معروضی حالات جو اسے ان زمینداروں سے رابطے میں لائے تھے محض مختلف حالات کے تقاضوں کی دین نہیں تھے بلکہ ہمایوں کے نام نہاد وصیت کی تعمیل بھی اس کی وجہ تھی۔ اس مقالے کی حدود اسی لئے یہ معلوم کرنے تک محدود ہیں کہ وہ کون سے حالات تھے جنہوں نے اکبر اور راجپوت حکمراں زمینداروں کے مابین محاذ آرائی کے ابتدائی مرحلے کو جنم دیا تھا۔ گوکہ اس محاذ آرائی کے ساتھ ساتھ ان سے تعلقات کا بھی اہتمام کیا جاتا رہا تھا۔ یہ مطالعہ 1580ء میں بنائے جانے والے لاہور، دہلی، آگرہ، اودھ، الٰہ آباد اور بہار کے صوبوں تک ہی محدود ہے۔ مطالعہ پہلے ہم پنجاب سے شروع کریں گے۔ (یعنی صوبہ لاہور) جہاں کوہستان شمالی کے حکمراں سردار اکیلے دس ہزار سواروں اور ایک پیدل (پیادہ) فوج کی قوت اکٹھا کرسکتے تھے۔(4) ان

کے خلاف اکبر کی محاذ آرائی اس کے اقتدار کی ابتدا ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ ان دنوں جب اکبر ہیمو کے ساتھ محاذ آرائی میں جٹا ہوا تھا سکندر خاں سور نے پنجاب کے پہاڑی علاقوں کے زمینداروں کی مدد سے پنجاب کے محصولات پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کی بنا پر اکبر کو مجبور ہو کر پنجاب کے پہاڑی علاقوں کے حکمرانوں کی طرف بھی توجہ دینا پڑی تھی۔ (5) سب سے پہلے نگر کوٹ کے راجا دھرم چند نے اکبر کے سامنے سرنگوں ہو کر اسے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس کے سرِ تسلیم خم کرنے کی تفصیلات رقم کرتے ہوئے ابوالفضل لکھتا ہے کہ سکندر خان سور کا پیچھا کرنے کی پیر محمد خان کی مہم کے بعد جب شہنشاہ دھمیری کے مقام پر خیمہ زن تھا دھرم چند سمیت بہت سے زمیندار شہنشاہ کی باریابی کے لئے حاضر ہوئے تھے اور ملاقات کے لئے انتظار کیا۔ ان معاصر سرداروں میں طاقت کے اعتبار سے دھرم چند کو اہم مقام حاصل تھا۔ (6)

راجا نگر کوٹ اور بعض دوسرے زمینداروں کا جن کے الگ الگ نام نہیں قلمبند کئے گئے ہیں اکبر کے سامنے سرنگوں ہونا ابھی ابتدا کا مرحلہ تھا کیونکہ اب بھی بہت سے زمیندار حکمراں سکندر خان سور کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ سکندر خان سور کے وفادار زمینداروں کو توڑنے کے لئے شہنشاہ نے نصیر الملک کو پہاڑوں کی طرف بھیجا تھا اور اسے ہدایت کی تھی کہ وہ زمینداروں پر حملہ کرے اور ان کو لوٹ لے۔ پہاڑوں کے بہت سے راجاؤں کو زیر کرنے میں کمانڈر کو کامیابی حاصل ہوئی اور ان کا مال ہاتھ آ گیا جس کے بعد مجبور ہو کر انہوں نے سکندر سور کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ (7) پنجاب کے پہاڑوں کا معروف سردار جس نے دوسرے سال جلوس کے دوران سکندر سور کو شکست دے دی تھی ماؤ کا راجا بخت مَل تھا۔ اس نے مغلوں کو بھی اس وقت نقصان پہنچایا تھا جب سکندر خان سور مَن کوٹ کے قلعہ میں محصور کر دیا گیا تھا۔ (8)

اسی برس گھکو کے طاقتور سردار آدم خان نے بھی شہنشاہ کی وفاداری کا اعلان کر دیا تھا وہ بھی سکندر سور کے خلاف مہم میں شریک رہا تھا۔ آخر میں سکندر خان سور نے بھی سرِ تسلیم خم کر دینے اور قلعہ پر اکبر کا قبضہ ہو جانے کے بعد آدم خان نے بھی ہوا کے رخ کو بھانپ لیا تھا اور خود کو لاہور جا کر بادشاہ کے حضور پیش کر دیا تھا۔ (9)

سکندر خان سور کے خلاف اکبر کی محاذ آرائیوں کے دوران ہی اس کی توجہ کا مرکز پنجاب کے پہاڑوں کا آخری سردار جموں کا راجا کپور چند ہو گیا تھا۔ آگرہ کی واپسی سے پہلے شہنشاہ

نے خواجہ عبداللہ اور تلکونری کے دوسرے جاگیرداروں کی کمان میں ایک فوج کپور چند کے خلاف بھیجنے کا اہتمام کیا تھا۔ راجا نے جموں قلعہ کے اندر اپنی طاقت کو یکجا کر رکھا تھا۔ شاہی فوج نے اس پر حملہ کر کے شاندار فتح حاصل کی اور لوٹ کا بہت زیادہ مال سمیٹ لیا۔ (10)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کے بیشتر معروف سردار جیسے نگر کوٹ کے راجا دھرم چند، ماؤ کا بخت مل، گھکو کا آدم خان اور جموں کا راجا کپور چند مع دوسرے راجا جن کے علاقوں کے ناموں کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے سکندر سور کے خلاف لڑائیوں کے دوران اکبر کا مرکز نظر بنے تھے۔ ان میں سے بعض کو شہنشاہ نے زیر کر لیا تھا، ان کے علاوہ کچھ کو سزائیں دی گئی تھیں یا انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

پنجاب کے پہاڑوں کے راجاؤں کے شہنشاہ کی دوسری لڑائی بیرم خاں کے حوالے سے اقتدار کے پانچویں برس کا واقعہ ہے جب بیرم خان نے بغاوت کر دی تھی۔ جب شہنشاہ کو خبر ملی کہ بیرم خان تلوارہ کے راجا گنیش کی پناہ میں ہے تو شہنشاہ نے تلوار کی طرف کوچ کیا تھا۔ بادشاہ کے سوالک کیمپ سے بڑھنے والی فوج کے ایک حصہ نے جیسا کہ ابوالفضل کے الفاظ ہیں ہندو فوج اور ان کے پہاڑی سرداروں (راجائے کوہی) کو گھیر لیا تھا۔ راجاؤں کو شکست ہوئی، بہت سے مارے گئے تھے اور جو بچ رہے تھے بھاگ لئے تھے۔ (11)

بعض راناؤں اور زمینداروں نے خود کو اکبر کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ بعد میں گیارہویں سال جلوس 1566ء میں پنجاب پر مرزا حاکم کی گھس بیٹھ کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے پنجاب گیا تھا۔ پنجاب سے مرزا حاکم کے بھاگنے کے بعد شہنشاہ نے لاہور میں اپنے وزن کی تقریب میں شرکت کی تھی۔ یہاں اتری علاقے کے کچھ سردار بھی آئے تھے، انہوں نے بادشاہ کو خراج عقیدت اور قیمتی تحفے پیش کئے تھے۔ ان کے علاوہ بادشاہ کو اپنی حمایت اور وفاداری کا یقین دلانے کے لئے بعض مقامی حکمرانوں نے اپنے بیٹوں اور سفیروں کو تقریب میں بھیجا تھا۔ (12) اس کے بعد جب 1578ء میں بادشاہ نے ٹوڈرمل کو صوبہ لاہور میں مقرر کیا تھا تو ہم دیکھتے ہیں کہ مغلوں نے ایک بار پھر پنجاب کے سرداروں پر نظر رکھنا شروع کیا تھا۔ چونکہ اتری پہاڑوں کے سرداروں یا مرزبانوں نے اس وقت تک بادشاہ کی وفاداری کا اعلان نہیں کیا تھا چنانچہ ٹوڈرمل کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ان سے

نبٹے۔اس کے نتیجے میں بہت سرداروں یا بومیوں نے اکبر کی وفاداری کا اعلان کر دیا تھا۔ جنہوں نے نافرمانی کی تھی ان کو یا تو سزا دی گئی یا پھر ان کے علاقوں سے انہیں محروم کر دیا گیا تھا۔(13) مغل اقتدار کے خلاف بغاوت اور خلاف ورزی کے واقعات عموماً رونما ہوا کرتے تھے۔ پینتیسویں، سینتیسویں، اکتالیسویں اور سینتالیسویں سال جلوس میں بڑے پیمانے کی سورشیں ہوئی تھیں۔(14)

مختصراً ہم دیکھتے ہیں کہ صوبے میں ابتدائی پانچ برسوں کے دوران جو مغل حملے ہوئے تھے وہ اصل میں سکندر خاں سور کے خلاف فوجی کارروائیاں تھیں۔اس کے علاوہ ایک وجہ بیرم خاں کی بغاوت بھی تھی۔ گیارہویں برس میں جو بغاوتیں ہوئی تھیں ان کی وجہ مرزا حاکم کے خلاف فوجی مہمات تھیں۔ان خطرات پر قابو پا لینے کے بعد مغلوں نے اپنی توجہ براہ راست دوسرے سرداروں کی طرف مبذول کی تھی۔

اب ہم صوبہ جات دہلی، آگرہ، اودھ اور الہ آباد کی طرف آتے ہیں۔ان صوبوں میں بھی افغان اور مغل امراء نے بغاوتیں برپا کر رکھی تھیں۔ مغلوں نے پہلے ان بغاوتوں کو ختم کرنے کے لئے دو دو ہاتھ کئے تھے۔صوبہ دہلی میں دو بڑے طاقتور سردار اکھنور کے راجہ متر سین کھیر یا اور راجا کماون تھے۔متر سین کے بارے میں حوالوں کے مطابق لکھا گیا ہے کہ وہ سنبھل کے علاقے سے تعلق رکھنے والے نمایاں زمیندار تھے اور جو بادشاہ ہمایوں کے زمانے سے اپنے علاقے پر حکمران تھے۔(15) سنبھل پر بھی اس نے قبضہ کر لیا تھا۔(16) کماون کا سردار یا مرزبان کے بارے میں حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندستان کے بھومیاؤں میں سب سے بڑا تھا۔(17) فرشتہ کے بقول اس کی کمان میں اسی ہزار فوج تھی جس میں پیدل اور توپ بند فوجیں دونوں شامل تھیں۔اس کا شمار اتری ہندستان کے پانچ بڑے راجاؤں میں ہوتا تھا جو دوسرے کئی راجاؤں پر بھی حکومت کرتا تھا یعنی راجاؤں کا راجا یا مہاراجا تھا۔(18)

متر سین 1560ء میں اکبر کی نظر میں اس وقت آیا تھا جب وہ سکندر شاہ سور کے بیٹے اور غازی خاں تنوار کی سورش کی حمایت کر رہے تھے۔ یہ سورش سنبھل کے علاقے میں برپا ہوئی تھی۔ان کے خلاف مقابلے کے لئے بادشاہ نے محمد صادق خاں کو بھیجا تھا اور جیسا کہ ابوالفضل کا بیان ہے مخالف دشمنوں کے وہ ہتھے چڑھ گیا تھا اور سزا بھی کاٹی تھی۔(19)

راجا کماون پر بھی اس کے باوجود کہ اس کی تحویل میں بڑے وسائل تھے اکبر کی توجہ نہیں تھی تاہم 1581ء میں بادشاہ نے اس کی طرف توجہ مبذول کی تھی کیونکہ سنبھل کے علاقے میں عرب بہادر کی بغاوت اور توسیع کی کارروائیوں کے ساتھ راجا کماون نے رام ساہ، مکت سین، راجا کرن اور دوسرے زمینداروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرلیا تھا۔ مغل طاقت نے اس کی ان کارروائیوں کو محسوس کرلیا تھا۔ سنبھل کے فوجدار حکیم عین الملک باغیوں کے حلقہ میں توڑ پھوڑ کروا کران کے مابین ٹکراؤ پیدا کردیا تھا اور اول الذکر چاروں سرداروں کو زیر کرلیا تھا۔ اس کے بعد ان سے بعض خدمات بھی لی گئی تھیں۔ (20) آگرہ کے صوبے میں ہت کنت کے بھادوری زمیندار ابوالفضل کے بیان کے مطابق راج دہانی کے اطراف میں بہت طاقتور تھے جن کو اکبر نے زیر کرلیا تھا۔ (21) یہ وہ مقام بھی تھا جہاں شیر شاہ سوری نے درباری سیاست کا مقابلہ کرنے کے لئے بارہ ہزار پیدل فوج ٹھہرائی تھی۔ (22) بیرم خاں چونکہ ہمیشہ ہی آدم خاں کی طرف سے مشکوک رہا تھا اور اسی لئے اسے دربار سے دور ہی رکھنا چاہتا تھا چنانچہ جلوس کے تیسرے برس اس پرگنے کا اسے حاکم مقرر کردیا تھا تاکہ وہ بھادوریوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرتا رہے اور مشغول رہے۔ ابوالفضل کے بقول اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ملک عامل کے ماتحت آ گیا (یعنی ٹیکس وصول کرنے والی انتظامیہ) اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں بھگتنا پڑی تھیں۔ (23) بعد میں راجا بکرماجیت بھادوری اور اس کا چچا راجا مکند مغلوں کی ملازمت سے وابستہ ہو گئے تھے اور ان کو مناصب عطا کئے گئے تھے۔ (24) آگرہ کے صوبے کا سب سے طاقتور سردار اور چاکا راجا مدھوکر بندیلا تھا جو کہ اپنی حرکتوں کی وجہ سے پہلا مقامی حکمراں تھا جس کو اکبر کی توجہ مبذول ہوئی تھی۔ ابوالفضل کے بقول کہ چونکہ راجا بغاوت پر آمادہ تھا اس لئے 1573ء میں ایک فوجی مہم اس کے خلاف بھیجی گئی تھی جس کے بعد یہ علاقہ بھی دائرہ عامل میں آ گیا تھا اور سورش پسند طاقتور عناصر پٹ کر سمٹ گئے تھے۔ (25)

اودھ کے صوبے میں سب سے زیادہ نمایاں سردار حسن خاں بچگھوٹی تھا۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ وہ ہندستان کے زمینداروں میں ایک بڑا زمیندار تھا۔ (26) وہ اس وقت تاریخ کے منظرنامہ پر ظاہر ہوا تھا جب اس نے مغل اقتدار کے خلاف مشکلات پیدا کی تھیں۔ پہلے اس نے ایک بااثر اور اہم افغان لیڈر جلال خاں سور کے ساتھ اتحاد بنایا تھا یہ جلوس کے دوسرے

برس کا واقعہ ہے۔(27) اس کے بعد جلوس کے چھٹے برس اس نے شیر خاں کے بیٹے مبارز خاں سے معاملات کئے تھے۔(28) پہلے دور میں اس نے افغانوں کی حمایت یکجا کرنے میں فعال سرگرمی دکھائی تھی اور سنبھل سرکار کے علاقے میں گڑبڑ پیدا کی تھی۔ بعد کے دور میں مبارز خاں کے بیٹے کے تحت وہ مغلوں سے لڑا تھا اور افغان فوج کے ایک دھڑے کی بھی کمان کی تھی۔ دونوں ہی بار باغی ہار گئے تھے اور ان کو بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔(29)

اودھ کے دوسرے سرداروں میں گونڈا کے راجا مان اور گوارکھ کے زمیندار بھی مغل تاریخ کے بیانیوں کا موضوع بنے تھے جس کا سبب وہ حمایت تھی جو انہوں نے 1580ء معصوم خان فرخندی کی بغاوت کے لئے کی تھی۔ معصوم خان فرخندی جلد ہی تباہ ہو گیا تھا اور اسے علاقے سے بھی نکال باہر کر دیا گیا تھا۔(29) اودھ میں مغلوں کا مقابلہ ایک اور سردار راجا سنسار چند سے ہوا تھا جو گورکھپور کے جنگلوں سے گھرے ہوئے علاقے پر حکمراں تھا۔ اس نے جیسا کہ ایک ہی معاصر حوالے سے معلوم ہوا ہے کہ سلیمان ازبک کے لڑکے یوسف محمد کو پناہ دی تھی جو کہ آگرہ کے جیل خانے سے بھاگ کر پناہ لینے کے لئے وہ آیا تھا۔ راجا نے یوسف محمد کی مدد کی تھی اور گورکھپور کے قلعہ کو پائندہ محمود خان سگ کاش کے بھائی سے چھین کر اس پر قبضہ کر لیا تھا مگر جب باغیوں کے اتحاد کو شکست ہوگئی تھی تب راجا اپنا علاقہ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔(30)

معصوم خاں فرخندی اور عرب بہادر کے خلاف مغلوں کی لڑائیوں کے دوران بہڑائچ اور بہڑائچ کے اتری پہاڑوں کے زمینداروں نے مغل طاقت کے سامنے سر جھکا دیئے تھے۔ بہڑائچ شہر کے قریب واعظ خاں اور مہتر خاں کے معصوم خاں فرخندی کو ہرانے کے بعد ہی اس علاقے کے تمام سرداروں نے 1581ء میں مغلوں کی وفاداری کا اعلان کر دیا تھا۔(31) 1586ء میں عرب بہادر کی حمایت کی تھی اور ان ہی کی مدد سے اس نے پہاڑوں پر ایک قلعہ بھی بنوایا تھا۔(32) بعد میں اس علاقے کے ایک زمیندار کھڑک رائے اور اس کے بیٹے دلا رائے عرب بہادر کے خلاف ہو گئے تھے۔ انہوں نے مغل فوجوں کے ساتھ مل کر عرب بہادر کی بغاوت کو کچل دیا تھا اور دلا نے اسے قتل کر دیا تھا۔(33)

صوبہ اودھ کے سرحدی علاقوں میں ایک اور سردار جس سے مغلوں کا مقابلہ ہوا تھا اجمیر کا راجا رنگ تھا۔ اس کے علاقے سوالک پہاڑوں میں تھے۔ جب اودھ کی طرف اس کی یلغار

ہوئی تو جیسا کہ بدایونی نے لکھا ہے اس کا شمار بڑے اور بااثر زمینداروں میں ہوتا تھا۔ اس کی راجدھانی قصبہ وجریل تھا۔ اجمیر سے وجریل دو دن کا سفر ہوتا تھا۔ راجا رنگ کے علاقے پر مغلوں کا حملہ لکھنو کے پرگنے کا حسین خاں سے مہدی قاسم خان کے منتقل ہونے کا نتیجہ تھا۔ حسین خاں اس تبدیلی پر اس قدر برہم ہوا کہ لکھنو چھوڑ کر راجا رنگ کے علاقے کی طرف اس کے علاقے پر حملہ کرنے چل پڑا تھا مگر غذا و اشیائے ضرورت کی کمی، موسم کی زیادہ گڑبڑ اور پہاڑ کے لوگوں کی مزاحمت سے مجبور ہو کر پسپا ہو گیا تھا۔(34) الہٰ آباد کے صوبے کا سب سے بڑا اور طاقتور حکمراں بھٹا کا راجا رام چند تھا جس کی حکمرانی الہٰ آباد کے دکن میں وسیع علاقے پر تھی اور اس کی راجدھانی بندوگڑھ تھی۔ بندوگڑھ کا قلعہ بھی بہت مضبوط تھا۔(35) ابتدائی زمانے میں اکبر نے اس کو بالکل اہمیت نہیں دی تھی لیکن جب مغلوں کے خلاف اپنی مسلح جدوجہد کرتے ہوئے غازی خان تنوار اور دوسرے افغان بھٹا پہنچے تھے تو بادشاہ نے آصف خاں جو کہ کڑہ کا جاگیردار تھا بہت سے دوسرے کمانڈروں کے ساتھ بھٹا بھیجا تھا اور راجا رام چند کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ فوراً افغان باغیوں کو مغل فوج کے حوالے کر دے۔ اس زمانے میں چونکہ برسات کا موسم تھا اس لئے مغل فوج راجا بھٹا پر دباؤ نہیں ڈال سکی تھی اور مجبوراً میدان سے واپس ہو گئی تھی۔(36) 1563ء میں آصف خان نے دوبارہ بھٹا پر حملہ کیا تھا اور بڑی کراری لڑائی ہوئی تھی جس کے نتیجے میں غازی خان تنوار اور بعض دوسرے افغان مارے گئے تھے اور راجا ڈر کے مارے بندوگڑھ بھاگ گیا تھا۔(37)

ان تمام واقعات کو یکجا کر کے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دہلی، آگرہ، اودھ اور الہٰ آباد کے صوبوں میں مغل بیشتر ان حکمرانوں سے رابطے میں آئے تھے جن کے علاقوں میں سورش اور گڑبڑ پیدا کرنے والے افغان تھے۔ ان میں سکندر خان سور کا لڑکا غازی خان تنوار اور مبارز خاں کا لڑکا شیر خاں تھے۔ ان کے ساتھ بعض باغی مغل امراء جیسے معصوم خان فرخندی، عرب بہادر اور یوسف محمد ازبک شامل ہو گئے تھے۔

بہار کے صوبے میں بھی مقامی حکمرانوں کے خلاف اکبر کی ابتدائی کاروائیاں اول الذکر صوبوں ہی جیسی تھیں۔ اس صوبے یعنی بہار میں مغلوں سے رابطے میں آنے والا پہلا طاقتور راجا اجینیا کا راجا گج پتی تھا۔ اکبر کے جلوس کے سترہویں برس 1574ء میں جب ہم اسے

دیکھتے ہیں تو وہ خان خاناں منعم خاںؔ کی سلیمان خان کے بیٹے داؤد خاںؔ کے خلاف مہم میں خدمات انجام دے رہا تھا جوز مانیا پر قابض تھا۔سلیمان خاںؔ کرزانی بنگال پر حکمراں تھا۔(38) لیکن اجینیا کے حاکم کا مغلوں کے ساتھ مقابلہ زیادہ عرصے تک نہیں چل سکا تھا کیونکہ جلوس کے اکیسویں برس 1576ء میں اس نے پچھم کی طرف مغلوں کے مقبوضات پر حملے شروع کر دیئے تھے جس میں اس کے ساتھ داؤد خان کرانی، اس کا بیٹا اور دلت پت اجینیا نے باغیوں سے ساز باز کر لیا تھا جو کہ عرب بہادر اور معصوم خان کابلی تھے۔ان سب نے ہی اجینیا کے خلاف لڑائی کے لئے مغلوں میں اشتعال پیدا کر دیا تھا۔(39)

جلوس کے انیسویں برس پچھم کی طرف افغانوں کے خلاف مغلوں کی مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ نرا گپور کے زمیندار راجا سنگرام اور گدھاور کے راجا پورن مل نے مغلوں کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ بنگال جاتے ہوئے جب منعم خاںؔ نے قصبہ سورج گڑھ پر قبضہ کر لیا تھا تو اول الذکر حکمرانوں نے جن کے ساتھ دوسرے زمیندار بھی شریک تھے اپنی زیر حکومت جاگیروں کو بچانے کے لئے گھوڑوں کی باگیں کس لی تھیں۔(40) لیکن بعد میں دونوں حکمرانوں نے مغلوں کو دھوکا دیا تھا اور گردھارے حکمراں نے کھلم کھلا باغی معصوم خاںؔ کابلی کو پناہ دی تھی۔(41)

مغل اور افغانوں کے درمیان مقابلوں کے دوران پہلی بار چمپارن کا زمیندار اودے کرنؔ بھی نمایاں ہوا تھا۔مظفر خاںؔ نے جب حاجی پور کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے فوجی مہم کی قیادت کی تھی جس پر افغان قابض تھے بقول ابوالفضلؔ کہ اس نے بھی وفاداری کے ساتھ مغل مہم کا ساتھ دیا تھا۔ بیوریج کے ترجمے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اودے کرنؔ حاجی پور پر دوبارہ قبضے کی مہم میں افغانوں کے خلاف خدمات انجام دی تھیں۔(42)

دکنی بہار میں افغانوں کے خلاف مہم کے دوران جس کی کمان مظفر خاںؔ کر رہا تھا بہت سے دوسرے مقامی حکمرانوں کا مغلوں سے سابقہ پڑا تھا۔روہتاس قلعے پر قبضے کے بعد جب خان جنگلوں اور پہاڑوں میں شکار کھیل رہے تھے انہوں نے علاقے کے راجاؤں سے ایک سو ساٹھ ہاتھی بطور مال غنیمت وصول کئے تھے۔ حاجی پور واپس جاتے ہوئے جب وہ (985/1577-1578) سیور کے مقام پر خیمہ زن ہوئے تھے تو راجہ سیور نے بطور پیش کش انہیں تیس ہزار روپئے اور بیس ہاتھی بھیجے تھے۔(43)

جلوس کے تیسویں برس کوکرا کے حکمراں مادھوسنگھ نے شہباز خان کی اطاعت قبول کر لی تھی گویا افغانوں کے خلاف اس کی یہ مہم بھی کامیاب رہی تھی۔ مادھوسنگھ کو اس بات پر بڑا غرور تھا کہ وہ جن پہاڑوں کے علاقوں پر حکمراں ہے ان کو فتح کرنا ناممکن تھا لیکن مغل سلطنت کی فوجوں نے یہ مہم سر کر لی، اسے لوٹا اور بہت سا مال غنیمت حاصل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے مغل سلطنت کو خراج ادا کرتے رہنے کا اقرار کر لیا تھا۔ (44)

جلوس کے ستائیسویں برس نور محمد اور عبدالغفور کی بغاوتوں کے خلاف فوجی کارروائیوں کے دوران موجودہ ہتواراج کے حکمراں کلیان پور کا بھی ذکر ہوا ہے۔ خان اعظم مرزا کوکا نے جب ان دونوں باغیوں کا ہانکا کیا تھا تو وہ بھاگ کر پناہ لینے کے لئے کلیان پور پہنچے تھے۔ (45) اس وقت ایسی کوئی شہادت دستیاب نہیں تھی جس کی بنا پر کہا جائے کہ کلیان پور کے حکمراں نے مغلوں کی اطاعت قبول کر لی ہو۔

چیرو کا طاقتور حکمراں انت چیرو غالباً بہار کے حکمرانوں میں تن تنہا ایک تھا جس کی طرف مغلوں نے کسی وجہ کے بغیر توجہ مبذول کی تھی کیونکہ اس کا نہ افغانوں کے ساتھ اور نہ باغیوں کے ساتھ کوئی تعلق رہا تھا۔ جلوس کے پینتیسویں برس 1590ء تک جب افغانوں اور باغیوں کی گڑبڑ اور یورش کا خاتمہ ہو گیا تھا اور راجا مان سنگھ نے خرا گپور اور گردھاور کے حکمرانوں پر قابو حاصل کر لیا تھا اس نے انت چیرو کے خلاف بھی فوجی مہم شروع کر دی تھی، اسے ہرا دیا تھا اور بہت مال غنیمت سمیٹ لیا تھا۔ (46)

اب ہم پورب کی طرف اجمیر کے صوبے کا مطالعہ کریں گے جہاں امبر کے کچھوا سردار راجا بھر مل کا سب سے پہلے اکبر سے رابطہ قائم ہوا تھا۔ راجا نے اکبر کے اقتدار کے پہلے ہی برس حاجی خان افغان سے اتحاد کر لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ مغل بادشاہ نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اور اس طرح راجا بھر مل کا نام پہلی بار نمایاں ہوا تھا۔ حاجی خان نے جب مغل جاگیردار مجنوں خان ققشال کا نارنول کے قلعہ میں گھیراؤ کیا تھا راجا بھر مل اس کے ساتھ تھا۔ مغل فوج پر جب دباؤ زیادہ تھا اس وقت راجا نے قلابازی کھائی تھی، اس نے معاملات میں مداخلت کر کے پُرامن طریقے سے قلعہ پر مغلوں کو قبضہ حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا تھا اور مجنوں خان کو جیسا کہ طے ہوا تھا اکبر کے دربار میں بھجوا دیا تھا۔ اس سے بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس نے راجا کو

شاہی دربار میں آنے کی دعوت دی تھی۔ راجا نے یہ دعوت قبول کر لی تھی اور اسی سال بادشاہ سے ملنے گیا تھا۔(47) مگر راجا نے جلوس کے چھٹے برس اکبر کے دربار میں پناہ لی تھی اور اس کی ملازمت سے وابستہ ہوا تھا کیونکہ راجا بھرمَل اور اس کے بھتیجے سجا کے درمیان اندر ہی اندر جھگڑا چل رہا تھا کہ کون امبر کا حکمراں ہو۔ میوات کے مغل جاگیردار شرف الدین، حسین مرزا نے اس موقع پر اشتعال کا مظاہرہ کیا تھا اور اس جھگڑے میں سجا کا ساتھ دیا تھا جس کی وجہ سے بھرمَل کو اکبر کی طرف جھکنا پڑا تھا۔(48)

مالوہ کے گورنر آدم خاں کے خلاف اکبر کی مُہم کے نتیجے میں حرا کے حکمراں رائے سرجن نے ابتدا میں بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ باز بہادر سے مالوہ چھین لینے کے بعد آدم خان نے اپنی آزاد خود مختاری قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی چنانچہ مغل فوجوں نے جب اس کی سرکوبی کے لئے کوچ کیا تو اس مہم کی قیادت خود بادشاہ نے کی تھی۔ جوں ہی بادشاہ رنتھمبور کے پاس پہنچا رائے سرجن نے یہ سنتے ہی کہ خود بادشاہ اس کے علاقے سے قریب آ گیا ہے فوراً بادشاہ کے حضور پیش کش اور اپنی اطاعت کی اطلاع بھجوائی تھی۔(49)

جلوس کے آٹھویں برس چندر سین کو ہرا کر جودھپور کی فتح اصل میں باغی شرف الدین حسین مرزا کے خلاف حسین قلی خان کی کامیاب مہم کا نتیجہ تھی۔ اپنی فوجی مہم کے خاتمے سے پہلے مرزا کے لوگوں نے اجمیر اور میرتا چھیننے کے بعد شاہی کمانڈر نے جودھپور پر حملے کے موقع کو استعمال کیا اور راجا چندر سین کو ہرا کر جودھپور پر قبضہ کر لیا تھا۔(50)

بیکانیر کے راجا کلیان مل کا ذکر پہلی بار اس وقت آیا تھا جب اس نے اکبر کے خلاف بیرم خاں کو پناہ دی تھی۔(51) جلوس کے پندرہویں برس 1570ء میں جب بادشاہ نے اجمیر کے قلعہ پر اپنے قبضے کو مستحکم کر لیا تھا۔ ناگور گیا تھا اور اس وقت یہاں رہا تھا جب تک کہ دشمن نے ہتھیار نہیں ڈال دیئے تھے۔ کلیان مَل نے بعد میں بادشاہ سے معافی مانگ لی تھی اور سیاسی وجوہات کی بنا پر بادشاہ نے اسے شاہی دربار میں خدمات سپرد کی تھیں۔(52) اسی موقع پر جیسلمیر کے راجا راول ہرراج نے بھی اکبر کی اطاعت کا اعلان کر دیا تھا۔(53)

سروہی کے دیورا حکمراں اور ابوگڑھ پر اکبر کے ابتدائی حملوں کا سلسلہ جلوس کے سترہویں برس کی ان مہمات کا حصہ تھا جو گجرات میں بھیجی گئی تھیں۔ گجرات کی مہم کی کمان کرنے والے

خانِ کلاں میر محمد خان اتکا کو قتل کرنے میں دیورا کے حکمراں کی ناکامی کے بعد بادشاہ اس کے خلاف اپنے سخت ذاتی ردعمل کا اظہار کیا اور خود ایک بڑی فوجی قوت لے کر سروہی پہنچ گیا لیکن چونکہ اس وقت گجرات پر دھاوا بولنا پہلے ضروری ہو گیا تھا اس لئے سروہی کے حکمراں کی سرکوبی کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا تھا۔(54)

گجرات ہی کی مہم کے دوران اکبر کی توجہ درگا نیور کے حکمراں کی طرف بھی مبذول ہوئی تھی۔اپنی گجرات کی مہم میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد جب اکبر واپس جاتے ہوئے اپنی فوج کے ساتھ جلوس کے اٹھارہویں برس 1573ء میں ڈنگر پور کے قریب خیمہ زن ہوا تھا تو ڈنگر پور کے حکمراں کی سرکوبی کے لئے ایک فوجی مہم بھیجنے کے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔لڑائی کا میدان بھی گرم ہوا تھا مگر اسے قابو کرنے میں تقریباً تین برس لگے تھے چنانچہ جلوس کے اکیسویں برس 1576ء میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔(55) گجرات کی فتح سے پہلے اکبر نے بنس وار کے راجا کی طرف بھی توجہ نہیں دی تھی۔جلوس کے اکیسویں برس جب بادشاہ راجا کے علاقے کے قریب مالوہ جاتے ہوئے خیمہ زن ہوا تھا تو راجا بنس وار اس کے حضور حاضر ہوا تھا اور بادشاہ کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔(56)

آخر میں اکبر میواڑ کے طاقتور راجا ــــ سودیا رانا کی طرف بھی متوجہ ہوا تھا۔اس زمانے میں اکبر افغانوں اور محمد سلطان مرزا کے بیٹوں کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔رانا اور حاجی خان افغان کے درمیان بھی لڑائی اکبر کے زمانہ اقتدار کے پہلے سال ہوئی تھی۔(59) مگر چونکہ اس زمانے میں مغلوں کا ہدف حاجی خان تھا اس لئے انہوں نے رانا پر توجہ نہیں دی تھی لیکن جلوس کے ساتویں برس رانا نے مشتعل ہو کر باز بہادر کو پناہ دی تھی۔(60) اس وقت بھی اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا۔جلوس کے بارہویں برس 1576ء میں جب مالوہ میں محمد شاہ مرزا کے بیٹوں نے بغاوت برپا کی تھی تو اکبر خود اس کے خلاف فوج لے کر روانہ ہوا تھا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ مالوہ کی مہم کے انتظامات کے لئے گگراؤں کے علاقے میں خیمے لگائے گئے تھے۔اس مقام کے پڑوس میں آصف خاں اور وزیر خاں کے زمیندار تھے جو احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے مندل گڑھ کے قلعہ پر حملہ کرنے گئے تھے جس پر مہاراجا رانا کی طرف سے راوت بالو سولنکی کا قبضہ تھا۔(61) مندل گڑھ کے قلعہ پر قبضے کے بعد جو مالوہ مہم ہی کا ایک حصہ

تھا جلوس کے بارھویں برس چتوڑ کی فتح کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ چتوڑ پر قبضے کے لئے رانا اور مغل فوج کے درمیان کافی طویل لڑائی ہوئی تھی۔ اس طرح باغی امرا آدم خاں، شرف الدین حسین مرزا اور محمد سلطان مرزا کے بیٹوں، رنتھمبور کے حکمراں حرا کے خلاف مغلوں کے ابتدائی حملوں، جودھپور کے راٹھور حکمراں اور میواڑ کے حکمراں سسو دیا اور مغل کارروائیوں کے مابین ایک گہرا تعلق ہمارے سامنے آتا ہے۔ میواڑ کے بارے میں اہم بات یہ تھی کہ رانا نے مالوہ کے باغی افغان حکمراں باز بہادر کو پناہ دی تھی جبکہ امبر کے کچھاوا سردار کا پہلی بار ذکر اس وقت آیا تھا جب حاجی خان نے نارنول کا گھیراؤ کیا تھا۔ جہاں تک کچھاواؤں کا مسئلہ تھا امبر پر اقتدار قائم کرنے کے لئے اندرونی جدوجہد تھی جس کے نتیجے میں راجا بھرمل اکبر کے قریب آ گیا تھا۔ گجرات کے سرحدی کناروں کے کئی حکمراں جیسے سروہی، دنگارپور اور بنسوار کے گجرات کی وسیع مہم کے دوران اکبر کی زد میں آئے تھے۔

مجموعی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ سرداروں کے ساتھ اکبر کی ابتدائی لڑائیاں جن کے دوران یا تو ان حکمرانوں نے جزوی یا مکمل اطاعت قبول کر لی تھی اصل میں افغانوں اور باغی مغل امراء کے خلاف مغل فوج کی کارروائیوں کا ثانوی یا درباری سیاست کا نتیجہ تھا البتہ صوبہ اجمیر کے پوربی دکنی حصے کے حکمرانوں کے خلاف مہم گجرات کی مہم ہی کا تسلسل نہیں تھی۔ ان علاقوں کے حکمراں خواہ کتنے طاقتور تھے مگر بہت زیادہ محدود علاقے میں تھے اس لئے ان سے مغلوں کو کوئی خاص خطرہ نہیں تھا کیونکہ ان کے علاقائی عزائم بھی ان کے علاقوں کے اندر تک ہی محدود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خلاف اکبر نے اپنے دفاعی اور فوجی وسائل کو ضائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ مٹی کے شیر تھے۔ ان کو ڈرانے اور دبائے رکھنے کے لئے معمولی سی فوجی کاروائی پر اس وقت تک اکتفا کیا گیا تھا جب تک کہ افغان اور مغل امراء کی بغاوت کا خطرہ باقی رہا تھا۔ ان کے برعکس باغی افغانوں اور مغل امراء کی کاروائیوں کا علاقہ بھی زیادہ پھیلا ہوا تھا اور انہوں نے کافی عرصہ تک مغل فوجوں کو لڑائیوں میں الجھائے رکھا تھا۔ ان کو ہرانے اور علاقے سے باہر نکال دینے کے بعد ان چھوٹے چھوٹے مقامی راجاؤں کی طرف اکبر متوجہ ہوا تھا۔ ان کو مغل دربار نے آخری مرحلے میں اپنی توجہ کا مرکز بنایا تھا جب باغی افغانوں کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تھا۔

حوالہ جات

1- اے۔آر۔خان، چیف ٹینز ان دی مغل ایمپائرڈیورنگ دی رین آف اکبر شملہ 1977ء
2- ایس نورالحسن۔دی پوزیشن آف زمیندارس ان مغل ایمپائر۔انڈین اکنامک اینڈ سوشل ہسٹری ریویواول نمبر 4 اپریل جون 1964ء دہلی
3- شیخ فرید بھکری، ذخیرۃ الخوانین اول کراچی 1961ء ص 103
4- دیکھو ابوالفضل، اکبر نامہ پرشین ٹیکسٹ، ببلیوتھیکا انڈیکا سیریز کول کتا 1877-1878ء، سوئم ص 683
5- ایضاً دوم ص 47
6- ایضاً ص 20
7- ایضاً ص 50
8- ایضاً ص 93
9- ایضاً
10- ایضاً ص 75
11- ایضاً ص 116
12- ایضاً ص 278
13- ایضاً حصہ سوئم ص 248
14- ایضاً اے۔آر۔خان ص 53-52
15- اکبر نامہ جلد اول ص 185
16- عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، فارسی متن، ببلیوتھیکا انڈیکا سیریز۔کولکتا 69-1864ء جلد اول ص 425

17- اکبرنامہ جلد سوئم ص533

18- محمد قاسم ہندوستان فرشتہ۔ گلشن ابراہیمی، جس کو تاریخ فرشتہ بھی کہا جاتا ہے۔ کانپور 1884ء جلد دوم ص420

19- اکبرنامہ جلد دوم ص104

20- ایضاً جلد سوئم ص349

21- ایضاً جلد دوم ص78

22- عباس خان سروانی، تاریخ شیر شاہی۔ ایم ایس ایلیٹ نمبر 371 بودلین لائبریری 89، اے۔ بی۔

23- اکبرنامہ III۔ ص77

24- دیکھو، اے۔ آر۔ خان۔ ص149

25- اکبرنامہ III۔ ص77

26- ایضاً II۔ ص56

27- ایضاً۔

28- ایضاً۔

29- ایضاً جلد سوئم، ص340 دیکھئے اے۔ آر۔ خاںؔ ص152-151

30- بایزید بیات۔ تاریخ ہمایوں و اکبر۔ ایم ہدایت حسین، کولکتا 1941ء ص317-316

31- اکبرنامہ III ص370

32- ایضاً ص492

33- ایضاً ص493

34- بدایونی II ص126-125

35- ایضاً III ص728

36- ایضاً II ص148

37- بدایونی II ص183-182

38- ایضاً III ص22

39- ایضاً ص 223-224، 186-189، 168-187 اور 331

40- ایضاً ص 107-108

41- ایضاً ص 321۔

42- بدایونی۔ II ص 136-137

43- عارف قندھاری، تاریخ اکبری رام پور 1962ء ص 225-226

44- اکبرنامہ III ص 479

45- ایضاً ص 396-397

46- ایضاً ص 576

47- ایضاً ص 45 اور 22

48- ایضاً ص 155-158

49- ایضاً ص 140

50- اکبرنامہ III ص 197

51- ایضاً ص 105 دیکھئے نظام الدین احمد کی طبقات اکبری II کولکتا 1931ء ص 147

52- اکبرنامہ II ص 257-259 اور طبقات (II) ص 229-230

53- اکبرنامہ II ص 359

54- ایضاً ص 4-5 طبقات II ص 236-237 اور بدایونی II ص 140

55- اکبرنامہ III ص 40 اور 196

56- ایضاً ص 194-195

57- ایضاً II۔ ص 196

58- ایضاً III۔ ص 89-90

59- اکبرنامہ II ص 146

60- ایضاً ص 169۔ طبقات II۔ ص 157

61- اکبرنامہ II ص 301-302 اور 313 ایف۔ ایف۔

اکبر اور راجپوت رجواڑے
سلطنت کے ساتھ ان کا الحاق

ایس عنایت۔اے۔زیدی

اکبر اور اس کی سلطنت کے بارے میں دستیاب سرکاری وسائل یعنی آئین اکبری اور اکبر نامہ نے اور ان کے لواحقین کو چھوڑ کر اس کی سلطنت کے لوگوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے اول ماتحت حکمراں حلقے اور دوم رعایا۔ اول الذکر کے لئے زمیندار، بومیان، مرزبان اور اقوام جیسے اور آخر الذکر کے لئے رعیت اور مردم جیسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔(1) ان الفاظ کا مذہب سے کوئی سمبندھ نہیں ہے۔ اکبر چونکہ مطلق العنان شہنشاہ تھا اس لئے وہ ہر دو قسموں کے مفادات کو پورا کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا اس کے سامنے پہلا ترجیحی مسئلہ مختلف مقامی حکمراں حلقوں مغل سلطنت کے نظام کے ساتھ نتھی کرنا تھا چنانچہ ایک طرف اس نے آزاد و خود مختار حکمرانوں کو ہرا کر مقامی حکمراں حلقوں کی طاقت کو کمزور کر کے ان کو محدود کر دیا تھا اور دوسری طرف بادشاہ نے ان ہارے ہوئے حکمرانوں کے اختیار اور ان کی حیثیت کو مزید بڑھاوا بھی دیا تھا۔ اس کے لئے بادشاہ نے ان کو سلطنت کے حکمراں طبقے میں حصہ دار بنالیا تھا۔

اکبر کی یہ پالیسی اس کے آباء واجداد حکمرانوں کی پالیسی سے مختلف تھی جس نے ہندستانی سرکار تنظیم میں ایک حقیقت پسندانہ دانش کا موڑ بھی پیدا کر دیا تھا۔ اس سے پہلے روایتی پالیسی مقامی حکمرانوں کو زیر کرنے اور ان سے پیش کش کے عنوان سے بھاری رقمیں حاصل کرنا تھی۔(2) اس کے بعد ہی ان کو ان کے اپنے علاقوں میں مقامی حکمرانی کی آزادی دی جاتی

تھی۔ اکبر نے مقامی حکمراں قوتوں کو وفاقی مرکز سے وابستہ کر لیا تھا اور ان کو بطور فوجی کمانڈروں کے سلطنت کے لئے خدمات انجام دینے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ ان کو وہی عزت واعزاز دیا جو دربار کے ایرانی اور تورانی امراء کو حاصل ہوا کرتے تھے۔ اس سے پہلے پیش کش حاصل کرنے اور ضرورت کے وقت مقامی حکمرانوں کو فوجی خدمات مہیا کرنے پر مجبور کرنے کی پالیسی نے مقامی حکمرانوں اور ان کی رعیت کے مفادات کو بھی بری طرح متاثر کیا تھا۔ وہ اسے بادل ناخواستہ ایک بوجھ ہی سمجھتے تھے۔ اس صورت حال کی وجہ سے مقامی حکمرانوں اور ان کی رعیت کے مفادات میں ایکتا اور یکسانیت پیدا ہو گئی تھی، ان میں بے چینی اور بے دلی کا ابھار نمایاں ہوا تھا اور ان میں سلطنت کے مرکز سے ٹوٹ کر الگ ہو جانے کی خواہش بڑھ گئی تھی۔ اکبر دانشمندی سے کام لیتے ہوئے کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی کا اطلاق کر کے مقامی حکمرانوں کے مفادات اور مرکز کے اقتدار کے درمیان تعلق قائم کیا جس کے نتیجے میں اعلیٰ سطح پر ایک مضبوط بندھن قائم ہو گیا تھا۔ (3) اب دونوں یعنی سلطنت اور مقامی حکمراں ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھ ملا کر رعیت کے استحصال میں حصہ دار بن گئے تھے۔ مقامی حکمرانوں کو سلطنت جاگیریں عطا کرتی تھی۔ سلطنت کے علاقے میں توسیع کے لئے اب مقامی حکمرانوں کی اسے مدد بھی حاصل ہو گئی تھی۔

سولھویں صدی تک مقامی قوتوں میں راجپوت حکمرانوں کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ لڑاکا نفری، لڑائی اور جنگ کے لئے استعمال میں آنے والے جانوروں کی بڑی قوت اور اعلیٰ معیار کو بادشاہ نے محسوس کرتے ہوئے ان کو حکمراں مغل تانے بانے میں بھرتی کر لیا تھا۔ (4) اس نے مغل ملازمتوں میں صرف بڑے مقامی حکمرانوں ہی کے لوگوں کو نہیں بلکہ نچلی سطح کے قبیلوں کے سرداروں کے لوگوں کو بھرتی کرنے کے لئے دروازے کھول دیئے تھے۔ ان کو بھی منصب دیئے گئے تھے اور ان کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا گیا تھا جو مغل ملازمتوں کے دوسرے منصب داروں کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا۔

جن مقامی امراء وشرفاء کو سلطنت کے امور میں خدمات کا موقع ملا تھا ان کو اپنی مقامی فوجوں کے انتظام کے لئے سپاہیوں کی ضرورت ہوتی تھی جن کی تعداد کا تعین ان کے منصب کے حوالے سے کیا جاتا تھا۔ ان کو جو سپاہی مہیا کئے جاتے تھے ان میں زیادہ تعداد کسان

سپاہیوں کی ہوتی تھی۔(5) زمینوں سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی پیدا کرتے تھے۔اس طرح راجپوت حکمراں اور ان کے سپاہی دونوں ہی اپنے اپنے علاقوں کو بھی کچھ دولت مہیا کرتے تھے جو وہ سلطنت کی خدمات کے عوض حاصل کرتے تھے۔اس دولت کا کم حصہ بطور خراج واپس سلطنت کی طرف جاتا تھا۔قاعدے کے مطابق منصب عطا ہونے کے بعد مقامی حکمراں پر لازم نہیں تھا کہ وہ سلطنت کو خراج ادا کرتا رہے۔اکبر نے راجپوت امراء کو اعلیٰ ترین عہدے بھی دیئے تھے۔ان کو صوبیدار،فوج دار، قلعہ دار اور دیوان جیسے اعلیٰ انتظامی عہدے دیئے گئے تھے (صوبے دار= گورنر،فوج دار=جنرل آفیسر کمانڈنگ اور دیوان= محصولات وصول کرنے والے) جو سلطنت کے مختلف علاقوں میں خدمات انجام دیا کرتے تھے۔(6)

اس طرح اکبر نے مقامی زمینداروں اور سلطنت کے مرکز کے درمیان تعلقات کو تعقل پسندانہ موڑ دیا تھا۔راجپوت امراء کی بھرتی کے ابتدائی مرحلے میں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ بادشاہ نے روایتی پالیسی ہی کو برقرار رکھا تھا جس کے مطابق جب امراء بادشاہ کی اطاعت قبول کر لیتے تھے تب اس کے علاقے پر اسے حکمرانی کا اختیار دے دیا جاتا تھا مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کی فوج جب بھی کہا جائے سلطنت کے لئے خدمات انجام دے۔جن راجپوت حکمرانوں نے اپنے ہی علاقے کے مقامی حکمرانوں کی مخالفت کے سبب اکبر کے ساتھ معاملات کر لئے تھے ان کو کسی طرح کا فوجی تعاون فراہم کرنا سلطنت کے لئے ممکن نہیں تھا۔اس کا ایک متبادل یہ تھا کہ کسی بڑے راجپوت راجا کے علاقے کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا جائے اور اس حصے کو بطور جاگیر دوسرے راجپوت امراء کو دے دیا جائے۔امراء اور ان کے لواحقین کو جاگیریں عطا کرنے کا سلسلہ اس وقت اہمیت اختیار کر گیا تھا جب 74-1573ء میں عددی عہدے ان کو دیئے گئے تھے۔(7) اب جن راجپوتوں کے تنخواہ کے بل ان کے ماتحت رجواڑوں کی جمع سے زیادہ ہوتے تھے ان کو سلطنت کے کسی دوسرے حصے میں جاگیر عطا کی جاتی تھی ہمیں یہ شہادت ملتی ہے کہ 1573ء میں مان سنگھ کے پاس کچھی واڑہ جاگیر مالوہ میں تھی۔(8) 1578ء سے کچھ پہلے کچھواہہ کے متعلقین کو جب انہیں پنجاب میں انتظامی عہدے دیئے گئے تھے جاگیریں بھی ملی تھیں۔(9)

اکبر نے بعض راجپوت رجواڑوں پر مکمل کنٹرول قائم کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔راؤ

مالدیو کے جانشینوں کی وراثت کے تنازعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اکبر نے تقریباً بیس برسوں 1563-1583ء تک جودھپور پر شاہی کنٹرول براہ راست قائم رکھا تھا۔(10) لیکن نہ ختم ہونے والی مزاحمت کو محسوس کرتے ہوئے بادشاہ نے اپنے ایک پسندیدہ حاکم اودے سنگھ جسے لوگ موٹا راجا کے نام سے پکارتے تھے جودھپور اس کے حوالے کر دیا تھا۔(11) 1572-73ء میں جب نگرکوٹ جو باغی حکمراں راجا رائے چند کے علاقے کا حصہ تھا راجا بیر بار کو بطور جاگیر عطا کر دیا گیا تھا تو اس کے خلاف شدید اختلاف پیدا ہوا تھا۔(12) چنانچہ اکبر نے دوبارہ نگرکوٹ اس کے حکمراں کو واپس کر دیا تھا جس کے ساتھ راجا اور شاہی دربار کے درمیان ایک معاہدہ بھی ہوا تھا۔(13)

1573-1574ء میں اکبر نے اپنے امراء کے مناصب کا تعین کیا تھا اور داغ کے قواعد و ضوابط جاری کئے تھے (یعنی Brand Marks)۔(14) اس از سر نو سلطنت کی حساب میں آنے والی آمدنی کا تعین کیا تھا تاکہ منصب داروں اور سپاہیوں کو تنخواہیں ادا کی جاتی رہیں۔ جمع کا جائزہ لینے کے لئے اکبر نے اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں کڑوڑیوں کو مقرر کیا تھا۔(15) ان کو راجپوتوں کے رجواڑوں میں بھی بھیجا گیا تھا لیکن جب 1575ء میں کڑوڑی بیکانیر اور سمبھر میں پہنچے تھے تاکہ ان علاقوں کی جمع کا جائزہ لیں تو راجاؤں نے ان کو ایسا نہیں کرنے دیا تھا۔(16)

1592-1593ء میں وراثت کے معاملات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اکبر نے بھٹا پر براہ راست کنٹرول قائم کر لیا تھا۔(17) مزید 1598-1599ء میں شہزادہ دانیال کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔(18) لیکن بھٹا کے سرداروں کی طاقتور مزاحمت کی وجہ سے اکبر مجبور ہو گیا تھا اور اس نے 1602-1603ء میں علاقے کو اس کے حکمراں بکرماجیت کو واپس کر دیا تھا۔(19)

اس قسم کی کارروائیاں بہرحال زیادہ تر اتفاقی تھیں ورنہ اکبر نے عموماً وطن (یعنی علاقائی رجواڑوں کو) ان کے حکمرانوں ہی کی تحویل میں رہنے دیا تھا، اور ان کو قلعے بھی دے دیئے تھے جہاں سے وہ حکمرانی کرتے تھے اور اپنے موروثی القاب جیسے راؤ اور راجا کا بھی استعمال کرتے تھے۔ ان کے جانشین بھی یہی القابات استعمال کرنے کا حق رکھتے تھے۔ اسے ان کا موروثی حق مان لیا گیا تھا لیکن اس کے لئے شہنشاہ کی منظوری ضروری ہوتی تھی جیسا کہ آگے ہم بیان کریں

گے۔ 1583ء میں جب اودے سنگھ کی تخت نشینی ہوئی تھی تو اکبر نے اسے صرف جودھپور کا قلعہ دیا تھا۔(20) اسی طرح 3-1602ء میں دریودھن کو بھی صرف بندوگڑھ کا قلعہ ہی دیا گیا تھا۔(21) اور اس کے حکمراں کو قلعہ کے منتظم کا درجہ ملا تھا۔(22)

تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مقامی حکمرانوں کے رجواڑے دوسرے امراء کو دے دیئے گئے تھے یا ان کو سلطنت کے علاقے یعنی خالصہ میں شامل کرلیا گیا تھا۔ 1572ء میں امبر پرگنہ کا محل سنگانیر کو بادشاہ نے بطور جاگیر رام داس اداوت کو سونپ دیا تھا۔(23) 1597ء میں پرگنہ امبر کا گاؤں پنوالیا اودک (کسی محصول سے آزاد عطا) کے طور پر ایک برہمن دھرم رام جوشی کے حوالے کر دیا گیا تھا۔(24) 1570ء میں نگرکوٹ کا کچھ حصہ پر قبضہ کر کے اسے خالصہ میں شامل کرلیا گیا تھا۔(25) 1596ء میں پہاڑ کے راجا باسو کا ایک محل پیتھان بطور جاگیر مرزا رستم کو دیا گیا تھا۔(26) سروہی رجواڑے کا مسئلہ خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ 1577-1576ء میں راؤ سورتن کی اطاعت کے بعد سروہی اور ابوگڑھ کے تمام علاقے کو سید ہاشم بخاری کے زیر انتظام دے دیا گیا تھا۔(27) پورے علاقے کے وسائل کا جائزہ لیا گیا تھا اور جمع داری کا تعین کر دیا گیا تھا۔(28) شاہی خدمات کے لئے دو ہزار سواروں کو تیار رکھنے کے عوض اس علاقے کو بطور جاگیر گجرات کے صوبے دار کے استعمال میں دے دیا گیا تھا۔(29) اس سے بھی زیادہ اہم یہ تھا کہ اس علاقے کی اسٹریٹیجک اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے اور ماضی میں میواڑ کے سسودیا راناؤں سروہی حکمرانوں زیر نگرانی ہونے کو دیکھتے ہوئے اکبر نے راؤں کی ان کے علاقے کے آدھے حصے کوان سے لے کر اس جگت سسودیا کو بطور جاگیر دے دیا تھا جو اکبر کا ملازم تھا۔(30)

حکمرانوں کے علاقوں کے بہت سرداروں کو جن کی حیثیت ٹھکانا داروں اور پٹا داروں کی تھی براہ راست سلطنت کی ملازمتوں سے وابستہ کرلیا گیا تھا اور ان کے مراکز ٹھکانوں اور پٹوں کو ان کے سابقہ سرداروں سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اس اقدام کے دوہرے اثرات ہونے ہی تھے کہ اول بڑے سرداروں کے قبضہ میں جو علاقہ تھا اس کا رقبہ کم ہو گیا تھا اور قبائل کی جو کمزور سالمیت تھی ٹوٹ گئی تھی۔ اب نائب سردار حضرات براہ راست بادشاہ کو جواب دہ ہو گئے تھے جبکہ پہلے یہ ذمہ داری بڑے سردار پوری کیا کرتے تھے۔

امبر کے کچھاوا علاقے میں دیوسا، نرائن، لان، سمبھر اور امارسر جن کی تحویل میں تھے ان کو مختلف سرداروں کی مستقل جاگیروں کی حیثیت دے دی گئی تھی۔(31) اسی طرح بڑا علاقہ جس راؤ مالدیو اور اس کے جانشین چندر سین کی عمل داری تھی ان ہی کے سرداروں کو بطور جاگیر دے دی گئی تھی۔ میرتا، جیت رن، سیوان اور جالور کے معاملات قابل دید تھے۔(32) میواڑ کے سسودیا راناؤں کے ٹھکانے داروں کو جنہوں نے اکبر کی طاقت وحکمرانی کو مان لیا تھا ٹھکانے بطور جاگیر دے دیئے گئے تھے۔ راؤ سرجن حادا اور راؤ درگا چند روات نے جب اکبر کی عمل داری کو مان لیا تھا اس کے بعد ان کے ٹھکانے انہیں واپس کر دیئے گئے تھے۔ جن میں بندی اور رام پور کی جاگیریں تھیں۔(33)

مقامی حکمران سرداروں اور ان کے نائبین ان کے اپنے وطن میں جو علاقے دیئے گئے تھے وہ عام قسم کی جاگیروں سے مختلف تھے کیونکہ ان کی قانونی حیثیت ناقابل انتقال تھی۔ اکبر کے زمانہ اقتدار کے آخری مرحلے میں اس فرق کو ظاہر کرنے والی اصطلاحات بھی رائج ہو گئی تھیں۔ انتظامی اداروں کی مسلسل تنظیم کاری کے تناظر میں اکبر نے جب 97-1596ء کے دوران ذات اور سوار مناصب کے درمیان فرق کیا تھا تو اسی تسلسل میں بادشاہ نے عام جاگیر اور وطن جاگیر کے فرق کا بھی ادراک کر لیا تھا۔(34)

وطن جاگیر اور عام جاگیر کے درمیان خصوصیت کے ساتھ فرق کا اظہار پہلی بار اکبر کے 1604ء کے فرمان میں ہوا ہے جو بیکانیر کے راجا رائے سنگھ کے نام جاری کیا گیا تھا۔ اس دستاویز میں لکھا گیا تھا کہ ہر جازیر حوالہ محل شمس آباد کافی عرصے سے راٹھوروں کی جاگیر کے ساتھ منسلک ہے مگر مابدولت نے خصوصی توجہ دیتے ہوئے دونوں پرگنوں شمس آباد اور نور پور بطور وطن جاگیر اسے یعنی راؤ رائے سنگھ کو عطا کر دیئے ہیں۔(35)

وطن جاگیر کی عطا کے اس حوالے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

1- وطن جاگیریں مستقل بنیاد پر عطا کی جاتی تھیں۔

2- بادشاہ اپنی مرضی سے کسی بھی علاقے کو وطن جاگیر کا درجہ دینے کا مجاز تھا اور بادشاہ کو یہ اختیار تھا کہ وہ کسی بھی سردار یا صاحب حیثیت کے لئے جب اور جس علاقے میں چاہے اپنی مرضی سے وطن جاگیر کا تعین کر سکتا تھا۔(36)

اکبر نے غالباً یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ راجپوت سرداروں کو ان کی موروثی جائیداد سے وابستہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مقامی وفاداریاں قلعہ بند ہو کر رہ جائیں گی جبکہ موروثی جائیداد سے ان کی وابستگی سے علیحدہ وطن جاگیروں کا تعین سرداروں کو مجبور کرے گا کہ وہ اپنے مفادات کو سلطنت کے مفادات کے ساتھ ضم کر لیں گے۔

سرداروں نے چونکہ مغل ملازمتوں سے وابستگی اختیار کر لی تھی اور ان کو مناصب دیئے گئے تھے اس لئے جاگیروں کی صورت میں ان کو محصولات ملتے تھے جو ان کی تنخواہوں کی مانگ کے برابر ہوں۔ اس کل رقم میں سے محصولات کا ایک حصہ سرداروں کو ان کے وطن کے لئے دیا جاتا تھا۔ اس طرح جو محصولات وطن کے سرداروں کے لئے متعین ہوتے تھے وہ اصل میں ان کی تنخواہوں کا حصہ ہوتے تھے نہ کہ کوئی اضافی مراعات۔(37) دوسرے لفظوں مین اکبر کا موقف تھا کہ اپنے وطن میں سرداروں کو جو محصولات ملتے ہیں وہ ان کی فوجی خدمات کا معاوضہ ہیں۔ ان کا موروثی حق نہیں ہیں۔ اس قسم کا طریقہ کار جو جاری تھا اصل میں عام تنخواہ ہی ہوتی تھی۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سردار وطن سے جو محصولات حاصل کرتے تھے وہ متعین شرح کے پابند نہیں تھے جیسا کہ دانشوروں نے لکھا ہے۔(38) بلکہ وقت کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔(39) لیکن یہ رواج ہو گیا تھا کہ محصولات کا ایک حصہ ہمیشہ وطن میں ہر ایک جانشین کے لئے دیا جاتا تھا جو کہ اس کی موروثی سرداری کے لئے ایک ٹوکن ہوتا تھا۔

وطن کے سرداروں کو ملنے والی رقم کے علاوہ محصولات کی خاصی رقم بطور جاگیر عام ان علاقوں کو بھی دی جاتی تھی جو وطن کے ساتھ ملحق تھے۔ ان مختلف جاگیروں کی نگرانی کی ذمہ داری چونکہ سرداروں ہی کے پاس رہنا ہوتی تھی جس کی معیاد ایک تسلسل کے بعد آنے والی نسل تک ہوتی تھی یا اس سے بھی زیادہ عرصے کے لئے ہوا کرتی تھی اس لئے وطن کے سردار اسے اپنے اوطان (وطنوں) میں اسے قواعد وضوابط کو نظر انداز کر کے دبا لیتے تھے جب کہ مغل انتظامیہ ان جاگیروں کو عام حیثیت کی جاگیریں ہی سمجھتی تھی اور جب حالات مانگ کرتے ہوں ان کو ادھر سے ادھر منتقل کیا جا سکتا تھا۔ اس غلط فہمی کی بنا پر رونما ہونے والا ٹکراؤ 1693ء میں اس وقت سطح پر ظاہر ہوا تھا جب امبر سے ملے ہوئے پرگنے کی جاگیریں راجہ بشن سنگھ کو نہیں دی گئی تھیں۔ راجا نے فوراً ایک عرض داشت مغل دربار میں پیش کی تھی۔ اس نے عطا کی گئی جاگیروں پر وطن داری

کے حق کا دعویٰ اس بنیاد پر کیا کہ راجا مان سنگھ (1614-1589ء) کے وقت سے دیولی، باسوا، نیوائی اور پھاگی کے پرگنے ہمیشہ امبر کے حکمرانوں ہی کو عطا کئے جاتے تھے۔ اس درخواست پر اکبر نے تفتیش کا حکم دیا اور کہا کہ جاگیر کی اصل حیثیت کے بارے میں سرکاری موقف واضح کیا جائے۔(40)

اکبر نے وطن جاگیر کی صورت میں مستقل مفاد کے نقطہ نظر کو مضبوط کیا تھا یہی وجہ ہے کہ عام حالات میں بادشاہ سرداروں سے جاگیروں پر قبضہ واپس نہیں لیتا تھا۔ تاہم اس نے جانشینی کے تعین میں مداخلت کر کے یہ واضح کر دیا تھا کہ جاگیروں پر حتمی اور آخری اختیار اسی کو حاصل ہے۔ بادشاہ کے اپنے اتالیق بیرم خاں نے ابتدائی زمانے میں، 1557ء میں اس حق پر زور دیا تھا۔ اس نے ماؤ کے تخت مال اس سے لے کر اپنے بھائی کو دے دیا تھا۔ اس منتقلی کا جواز اس نے یہ دیا کہ ماؤ اکبر کے اقتدار کو ماننے سے آنا کانی کر رہا تھا۔(41) 1576ء میں اکبر نے راؤ سرجن حادا کے بڑے بیٹے دودا کو بندی کے اقتدار سے معزول کر دیا تھا۔ اس پر یہ الزام تھا کہ اس نے راؤ پرتاب سے تعاون کیا تھا اور سرداری کے منصب کو اس کے بھائی بھوج حادا کو منتقل کر دیا تھا۔(42) اسی طرح جب جودھپور کی جانشینی کے معاملے میں راو مالدیو کے بیٹوں کے درمیان تنازعہ ابھرا تھا یعنی رام رائے اور چندرسین کے درمیان تو اکبر نے دونوں کے دعووں کو رد کر کے ان کے بھائی اودے سنگھ کو جو موٹا راج کے نام سے مقبول تھا جودھپور کا حکمران مقرر کر دیا تھا۔(43) دوبارہ 1592ء میں جب بھٹا کے حکمران بل بہادر باگھیلا کی وفات ہوئی تھی تو اس کے متعلقہ سرداروں نے اس کے بیٹے بکر ماجیت کو اس کا جانشین مقرر کیا تھا۔ اکبر کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے اس بنیاد پر جانشینی کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ اس فیصلے کے لئے پہلے اس کی منظوری بادشاہ سے حاصل نہیں کی گئی تھی۔(44) متعلقہ سرداروں نے بہت عرصے تک مزاحمت جاری رکھی تھی لیکن اکبر نے بل بہادر کے بھائی دریودھن کو گدی پر بٹھا دیا تھا۔(45)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ اکبر نے راجپوت سرداروں کے ساتھ اپنے جذباتی لگاؤ کا پوری طرح مظاہرہ کیا تھا، ان کے ورثا کے حق کو مانا تھا اور پرانے سرداروں کو ان کے وطنوں (اوطان) سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش نہیں کی تھی پھر اس نے بڑے سلیقے سے ان کے علاقوں کو

سلطنت سے منسلک کر لیا تھا۔ اس کے عوض ان کو جاگیریں پیش کی گئی تھیں۔ ان کو سلطنت کے مختلف حصوں میں انتظامی عہدے بھی دیئے گئے تھے اور انہوں نے بھی صورت حال کے اس بدلاؤ سے مفاہمت کر لی تھی۔

اس اقدام کے بہت دوررس اثرات خود راجپوت سرداروں پر مرتب ہوئے تھے۔ ان کی نظریں جو اب تک مقامی علاقوں کی حدود سے آگے نہیں گئی تھیں اب زیادہ وسیع حاکم شاہی کی وجہ سے وہ دور دور تک دیکھنے لگے تھے اور دوسروں کے علاقوں پر بھی اپنا حکم چلانے لگے تھے۔ حاکم شاہی کے عزائم ان میں پیدا ہو گئے تھے۔ اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی تھا کہ دور دراز علاقوں میں راجپوتوں کو جاگیریں مل جانے کی وجہ سے دوسرے راجپوت قبیلوں اور خاندانوں سے ان کا رابطہ ہوا جن کے مابین اس سے پہلے ان کا نہ ملنا جلنا تھا اور نہ رابطے تھے۔ راجستھان اور پچھمی و وسطی ہندوستان کے راجپوت سرداروں نے ایک دوسرے کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کر لئے تھے۔(46) راجپوت جاگیرداروں نے اپنی جاگیروں میں بہت مقامی لوگوں کو ملازمت میں جگہ دی تھی۔ دوسری طرف راجستھان کے بہت سے راجپوت سردار سلطنت کے دوسرے حصوں میں آباد ہو گئے تھے۔ ان حصوں میں انہوں نے نئی بستیاں اور نئے شہر بھی آباد کئے تھے اور اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر مندر اور مساجد تعمیر کی تھیں (جیسے کہ راج محل میں مان سنگھ کی مسجد)۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر کے ماتحت ملی جلی سیاسی و انتظامی صورت کی نشو و نما ہوئی اور جس کے پیچھے طبقاتی مفادات کا ربط تھا۔ اس زمانے میں اگرچہ قوم کا کوئی نقطہ نظر وجود میں آ بھی نہیں سکتا تھا جیسا کہ اس لفظ کے جدید معنی ہیں لیکن راجپوت رجواڑوں کا مغل سلطنت کے ساتھ بندھن یقیناً ہندستان کے جغرافیائی تصور کے مقابلے میں ایک سیاسی صورت کا ظاہر ہونا آگے کی طرف بڑھنے والا ایک قدم ضرور تھا۔

حوالہ جات

1- عرفان حبیب، دی ایگریرین سسٹم آف مغل انڈیا۔ممبئی 1963ء ص 41-136
لفظ زمیندار ہندو حکمرانوں کے لئے مستعمل تھا جو چودھویں صدی تک سلطنت کے براہ راست کنٹرول سے باہر رہا کرتے تھے۔(دی کیمبرج اکنامک ہسٹری آف انڈیا جلد اول مرتبہ ٹی۔اے چودھری اور عرفان حبیب، کیمبرج 1982ء ص 58)

2- اکبر نے بڑے زمیندار خاندانوں سے ازدواجی رشتے بنالئے تھے۔عارف قندھاری اور ابوالفضل دونوں نے ان ازدواجی رشتوں سے اکبر کی مقامی حکمرانوں کو پُرامن ذریعہ سے جیتنے کی پالیسی منسوب کیا ہے۔تاریخ اکبری مرتبہ معزالدین ندوی، رام پور 1962ء ص 48-47۔اکبر نامہ مرتبہ آغا احمد علی، کولکتا 87-1873ء۔دیکھئے افضل حسین، میرج امنگ مسلم نوبلز۔پروسیڈنگز آف دی انڈین ہسٹری کانگریس۔مظفر پور 1972ء۔ایس۔عنایت۔اے۔زیدی، میٹریمونیل ٹائیز بیٹوئن مغل رولنگ فیملی اینڈ دی کچھواہا کلان۔پروسیڈنگز آف دی انڈین ہسٹری کانگریس جدوپور 1974ء

3- آئین اکبری دونوں کی سند پیش کرتی ہے۔ابوالفضل نے تفصیل سے لکھا ہے کہ مختلف راجپوت قبائل کتنے گھوڑوں اور توپ خانوں کا انتظام رکھتے تھے۔آئین اکبری مرتبہ بلوچ مان (1) ص 513-508 (صوبہ اجمیر)

4- ایس۔عنایت۔اے زیدی، اسٹڈیز اِن ہسٹری (II) نمبر 1۔1980ء کچھواہا امراء کی فوجیں۔

5- S. Inayat A. Zaidi, "Organization and Composition of the Contingents the Kachawaha Nobles", Studies in

History, II, No.1, 1980.

6- احسان رضا خان، چیف ٹینز ان دی مغل امپائر ڈیورنگ دی رین آف اکبر، شملہ 1977ء ص 115 اور 209 ایس عنایت۔اے۔زیدی۔ پولیٹیکل رول آف دی کچھاوا نوبلز ڈیورنگ جہانگیرس رین۔ پروسیڈنگز آف دی انڈین ہسٹری کانگریس۔ حیدر آباد۔1978ء

7- اے۔جے۔قیصر۔پروسیڈنگز آف دی انڈین ہسٹری کانگریس، 1961ء ص 57-156 شیریں موسوی، دی اکنامی آف دی مغل امپائر 1595ء دہلی 1987ء ص 202(2)

8- اکبر نامہ III ص 43، موہتا نینسی، موہتا نینسی ری خیات، بدری پرشاد سکاریا، راجستھان اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ جودھ پور۔1960ء (1) ص 342

9- ایضاً ص 248 مزید دیکھئے ایس۔عنایت اے زیدی، دی اورجن آف دی انسٹیٹیوشن آف وطن جاگیر۔دی کواٹرلی ریویو آف ہسٹاریکل اسٹڈیز نمبر 4 کلکتہ 81-1980ء

10- اکبر نامہ II ص 197۔ بانکے دس ری خیات، آر او آر آئی، جے پور 1956ء ص 21 سال 1572ء میں جے پور کو بیکانیر کے رائے سنگھ کی نگرانی میں دے دیا گیا تھا۔(اکبر نامہ III۔ص 5۔ بدایونی، منتخب التواریخ مرتبہ احمد علی۔ ببلیوگرافی انڈیکا سیریز (II) ص 140)

11- موہتا نینسی، مارواڑا پرگندری وگات مرتبہ فتح سنگھ، آر۔او۔آر۔آئی۔ جودھپور 1968ء جلد 1 ص 76

12- اکبر نامہ II ص 270

13- ایضاً III ص 36۔اے۔آر۔خان۔چیف ٹینز ان دی مغل امپائر۔ص 57

14- اکبر نامہ III ص 69

15- منتخب التواریخ II ص 189

16- دلپت ولاز مرتبہ راوت سرسوات، سادول ریسرچ انسٹیٹیوٹ، بیکانیر۔1960ء ص 33 موہتا نینسی ری خیات، (1) ص 306۔ دیکھئے ایس۔عنایت۔اے۔زیدی۔ دی اوریجن آف دی انسٹیٹیوشن آف وطن جاگیر ص 648 اور 641۔

17- اکبرنامہ III۔ص 648

18- اکبرنامہ III۔ص 717، 728، 740

19- اکبرنامہ III ص 788

20- ماڑواڑ راپرگنہ ری وگات (1) ص 76۔ شیام داس ویرونود، اشاعت مکرر دہلی 1986ء
III حصہ III ص 815

21- اس کے پورے ملک کو اس کی وطن جاگیر کے بطور جب اس نے مغلوں کی خدمات سے وابستگی اختیار کر لی تھی دے دیا گیا تھا اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ ایم۔ اطہر علی، دی مغل نوبلٹی انڈر اورنگ زیب، دوبارہ چھپنے والا ایڈیشن۔ ممبئی 1970ء ص 70۔ ایس نورالحسن، زمیندارس انڈر دی مغلس۔ لینڈ کنٹرول اینڈ سوشل اسٹرکچر ان انڈین ہسٹری مرتبہ رابرٹ ایرک فرائی کینبرگ۔ وسکونسن 1969ء ص 21

22- اکبرنامہ III ص 788

23- Nizam-ud-Din Ahmad, Tabaqat-i-Akbari, 1594 ed. B.De, Bib. Ind., Calcutta, II, p. 442; 'Abu'l Baqi Nahawandi, Ma'asir-i-Rahimi, 1616, ed. Hidayat Husain, Bib. Ind., I, p .804; Muhta Nainsi ri Khyat, I, p.331.

24- نظام الدین احمد، طبقات اکبری 1594ء مرتبہ بی۔ ڈے۔ ببلیو گریفیکا انڈ کا کولکتا (II) ص 442 بھدل الباقی نہوندی، معاصر رحیمی 1616ء مرتبہ ہدایت حسین (1) ص 804۔ موہتا نینسی ری خیات (1) ص 331

25- جے۔ ہٹ چنسن۔ ہسٹری آف دی پنجاب ہل اسٹیٹس لاہور 1933ء ص 74-73۔ گزیٹیر آف کانگرا ڈسٹرکٹ۔ اے آر خان کی مرتبہ کتاب چیف ٹینز ان دی مغل امپائر ص 42

26- اکبرنامہ III ص 712

27- اکبرنامہ III ص 197

28- آئین اکبری II ص 251

29- علی محمد خان مراعات احمدی ضمیمہ۔ مرتبہ سید نواب علی، بڑودا 1928-1927ء ص 226۔ سروہی کے سرداروں کو زمیندار کا مرتبہ دیا گیا تھا لیکن ان کے علاقوں کو دوسرے جاگیرداروں کو دیا گیا تھا۔ (عرفان حبیب، ایگریزین سسٹم آف مغل انڈیا ص 185-184)

30- اکبر نامہ III ص 413۔ موہتا نینسی ری خیات (1) ص 132-131، جگ مل نے سروہی دیورا خاندانوں سے ازدواجی رشتے بنا لئے تھے۔ اس نے مان سنگھ دیورا کی بیٹی سے بیاہ کر لیا تھا جو راؤ سورتن کا فوری جانشین تھا۔ مان سنگھ کی کوئی نر اولاد نہیں تھی چنانچہ اس کا ایک قریبی سورتن اس کا جانشین ہوا۔

31- اکبر نامہ III ص 157-156 موہتا نینسی ری خیات (1) ص 304 اور 308

32- مارواڑ را پرگندری وگات II ص 495 اور اکبر نامہ II ص 34 اور 82-80

33- ویرونود، ص 84-983 راؤ سرجن اور راؤ درگا ترتیب کے ساتھ دو ہزار اور پندرہ سو کے منصب دار تھے۔ (آئین اکبری (1) ص 161۔ طبقات اکبری II ص 446)

34- ایس۔ موسوی، دی اکنامی آف دی مغل امپائر ص 206

35- فرمان اسٹیٹ آرکائیوز راجستھان، بیکانیر میں محفوظ ہے۔

36- ایضاً۔ آئین اکبری سے معلوم ہوتا ہے کہ شمس آباد کا پرگنہ راٹھوروں کی زمینداری میں تھا اور رائے سنگھ کے بعد والوں سے منسوب تھا۔ آئین اکبری مرتبہ بلوچ مان II ص 507

37- وطن کے محصولات کو ہمیشہ راجپوت منصب داروں کی تنخواہوں کے بلوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ جودھپور کے لئے دیکھئے مارواڑ را پرگندری وگت، (1) ص 77-76 اور 83 و 93 حصہ (II) ص 489-488

38- ایس۔ پی۔ گپتا، دی ایگریرین سسٹم آف ایسٹرن راجستھان۔ دہلی 1977ء ص 27-26

39- ستیش چندر پریڈنشل ایڈریس ٹو دی ایٹھ سیشن آف دی راجستھان ہسٹری کانگریس، اجمیر 1975ء۔ جی۔ ڈی۔ شرما، راجپوت پولٹی۔ دہلی 1977ء ص 27-26

40- وکیل کی رپورٹ (فارسی میں) جو راجستھان آرکائیوز بیکانیر میں محفوظ ہے۔

41- اکبر نامہ II ص 63

42- موہتا نینسی ری خیات (1) ص 112۔ سوریامل مشرومش بھاشکر مرتبہ اے اسو پا۔ جے پور V ص 2324-2348

43- مارواڑ راپرگندری وگات (1) ص 76۔ ویرونود III ص 815

44- اکبر نامہ III ص 641-648

45- ایضاً ص 641-648۔ موہتا نینسی ری خیات (1) ص 313۔ شاہ نواز خان۔ معاصر الامراء 47-1742ء مرتبہ مولوی اشرف علی کولکتا 1890ء (II) ص 137-38

46- 1-1590ء میں گدھاور کے پورن مل نے اپنی بہن کو راجا مان سنگھ کے بھائی چندر بھان سے بیاہ دیا تھا۔ بھٹا کے سردار بل بہادر نے راجا بیکانیر کی بیٹی سے بیاہ کرلیا تھا (اکبر نامہ III ص 630 اور 576)۔ اسی قسم کی شادیاں بنگال، بہار، اوڑیسہ اور وسطی ہندوستان میں بھی ہوئی تھیں۔ دیکھئے حوالہ ایضاً۔ ص 717-716۔ بانکے داس دی خیات ص 124 اور 142-141۔ موہتا نینسی دی خیات (1) ص 132۔

❁❁❁❁❁

اکبر اور سندھ کا الحاق

سونیتا زیدی

مغل خاندان ہی کے خانوادے ارغون اور ترخان سلسلوں نے یکے بعد دیگرے سولہویں صدی کے بڑے عرصے تک سندھ پر راج پاٹ کیا تھا۔ عموماً بابر اور ہمایوں نے بھی ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے تھے۔(1) شیر شاہ سے شکست کھانے کے بعد ہمایوں نے ارغون حکمراں میر شاہ حسین سے مدد مانگی تھی مگر اس نے حالات کے دباؤ کی مجبوری کے سبب کوئی مدد نہیں کی تھی۔ اس زمانے میں وہی سندھ۔ ہمایوں کی بیوی حمیدہ بانو نے عمر کوٹ کے مقام پر جو کہ تھر کے ریگستان میں سوڈھا راجپوتوں کے سرداروں کا مرکز تھا1542ء میں اکبر کو جنم دیا تھا۔(2) اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اکبر کا سندھ کے اس علاقے سے ایک رشتہ تھا اور اسے سندھ سے دلچسپی تھی لیکن ماخذ خصوصاً درباری مورخ ابوالفضل نے سندھ کو فتح کرنے کی اکبر کی خواہش کے بعض دوسری اہم وجوہات پر بھی زور دیا ہے سبّی اور درّہ بولان کے ذریعہ سندھ سے قندھار جانے والے راستے نے سندھ کی سیاسی جغرافیائی اور بیو پاری اہمیت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔(3) سندھ پر قبضہ پنجاب پر حکمراں مغلوں کو سمندر کے راستے تک لے جا سکتا تھا۔ مزید یہ کہ سندھ پر کنٹرول ہونے سے ایک متبادل بندرگاہ اور سندھ کے بعض علاقوں میں پرتگالیوں کی مداخلت پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ گجرات اور بحیرہ عرب کے علاقوں میں مغل حکام کے ساتھ کسی بھی محاذ آرائی کی صورت میں بھی سندھ پر قبضہ مغلوں کے لئے مفید ہو سکتا تھا۔(4) اکبر اس علاقے کے وسائل پر بھی کنٹرول حاصل کرنا چاہتا ہوگا کیونکہ سندھ سے مختلف قسموں کی کپاس اور دوسرے ریشمی کپڑے جو بنائے جاتے تھے برآمد ہوا کرتے تھے۔(5)

سندھ اپنی مشہور مصنوعات، ہاتھی دانت سے بنائی جانے والی چیزوں، لکڑی کے اعلیٰ فرنیچر (6) چمڑے سے بننے والی مصنوعات، گاڑیوں اور پالکیوں کی وجہ سے شہرت رکھتا تھا۔(7) سندھ میں نمک کے ذخائر، اینٹی منی اور لوہا بھی پائے جاتے تھے۔(8) نیل بھی دستیاب تھا جو ان دنوں تجارتی اہمیت رکھتا تھا۔ ان تمام اشیاء کا شمار برآمدی اشیاء میں ہوتا تھا۔(9) یہی وجہ ہے کہ پرتگالی بیوپاری سندھ میں گھس پڑے تھے اور ٹھٹھہ میں اپنی مستقل آبادی قائم کر لی تھی۔(10)

1560ء تک جب اکبر نے اپنا اقتدار مستحکم کرلیا تھا تو اسے یہ خیال ہوا کہ سندھ میں ترخان سرداروں کو بھی زیر کرنے کی کوشش کرے۔ ترخان حکمراں بھی اس ممکنہ مداخلت کا اندازہ رکھتے تھے اس لئے وہ اکبر کے ساتھ دکھاوے بھر کی وفاداری برتنے کے لئے تیار بھی تھے لیکن سندھ سمندر، دکن میں رن (رن کچھ)، پہاڑوں اور پورب واتر پورب میں ریگستان کی وجہ سے ایک طاقتور دفاعی حصار کا مرتبہ بھی رکھتا تھا۔ اپنی قدرتی جغرافیہ کی وجہ سے اس علاقے میں بہت سے بدو، دھرم وادی اور نیم مستقبل قبائل تھے جن کی حمایت سے ہی ترخانوں نے قوت حاصل کی تھی۔ اتر کی طرف سے سندھ میں داخل ہونے والے اہم راستے تھے جن پر دو جگہوں سے رکاوٹیں قائم کی جاسکتی تھیں اول روہڑی وسکھر کی تنگ وادی پر بھکر اور ڈیلٹا کے اوپر تنگ لکی درے پر سہون۔ ان دو قلعوں پر قابو پالینے کے بعد قبائل آسانی کے ساتھ دھاوا بولنے والوں کی رسد کو تتر بتر کر سکتے تھے۔ تاریخی بیانئے دو قسم کے قبائل میں فرق کرتے ہیں۔ موروثی سرداروں کے قبائل کا ذکر کرتے ہوئے ان کی قیادت کرنے والوں کو زمیندار یا مرزبان بتایا گیا ہے۔ دوسرے قبائل جو کسی قسم کی سیاسی تنظیم سے محروم تھے ان کو ملس یا مردم بتایا گیا ہے۔(11) ان میں سے بعض قبائل کا قدامت پسندانہ کردار کی شہادت ان کے توہم پرستانہ معمولات تھے۔ ابوالفضل نے مذمتی انداز میں جگر خوروں کا ذکر کیا ہے۔(12) ان کا قدامت پسندانہ کردار اس طرح بھی واضح ہوتا کہ وہ محصولات کے عوض اسی رقم کے برابر مویشی دیا کرتے تھے۔(13) مذہبی عبادت گاہوں کو بھی وہ اشیاء کی صورت میں دان دیتے تھے۔(14) ابوالفضل نے خاص قبائل کے نام بھی قلمبند کئے ہیں، ان کی مسلح طاقت کے اعداد و شمار لکھے ہیں اور ان علاقوں کا بھی ذکر کیا ہے جہاں ان کی کثیر آبادیاں تھیں۔(15)

نمبر شمار	نام	فوجی قوت	علاقے
1-	بلوچ کلمتی	بیس ہزار پیدل	سہون سے لکی تک
2-	نہمردی	تین ہزار سوار اور سات ہزار توپچی	سہون سے کیرتھر کے سلسلوں تک
3-	بلوچ نظاری	ایک ہزار سوار	دتو
4-	بلوچ کلمتی	چار ہزار سوار	کچھ گنڈاو کے قریب کراپہاڑیاں
5-	بھٹی	---	اچ سے گجرات تک
6-	سوڈھا، جاریجا، دوسرے قبائل (سمیجا)	---	بھکر سے نصر پور تک اور عمر کوٹ

سندھ پر مستحکم انتظامیہ قائم کرنے کے لئے بہت زیادہ تیاری کی ضرورت تھی۔ ترخان حکمرانوں نے اکبر کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے کے لئے بڑی محنت کی تھی کیونکہ وہ بھی خود کو تیمور خاندان کے چشم و چراغ ہی سمجھتے تھے۔ مرزا باقی ترخان نے تو اپنی بیٹی سندھی بیگم کو بیاہ کرنے کے لئے اکبر کے یہاں پہنچا بھی دیا تھا مگر بادشاہ نے بیاہ کی تجویز کو نہیں مانا تھا۔(16) ازدواجی تعلقات کو رد کر دینے کے بعد بادشاہ نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ مکمل اطاعت چاہتا ہے۔ اس نے 1571ء میں محب علی خان کے زیر کمان ایک مہم بھی روانہ کر دی تھی لیکن اس مہم کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔(17) 1586ء میں اکبر خود لاہور آیا تھا تا کہ ٹھٹھہ بھیجی جانے والی مہم کی خود نگرانی کرے۔ اس نے صادق خان کو مہم کی قیادت کی ذمہ داری سونپی تھی۔ اس نے اگرچہ کچھ ابتدائی کامیابیاں حاصل کی تھیں مگر وسطی اور زیریں سندھ کے حکمراں جانی خان کو وہ شکست نہیں دے سکا تھا۔ صادق خان نصر پور سرکار سے آگے نہیں جا سکا تھا۔ مزید فوجی دباؤ کا سد باب کرنے کے لئے مرزا جانی بیگ نے شخصی طور پر اکبر کو خراج ادا کرنے، اکبر کے نام سے سکے جاری کرنے اور جمعہ کے خطبے میں اس کا نام شامل کرنے کی بھی پیش کش کی تھی۔(18) اس نے بعد میں دربار میں خود حاضر نہ ہونے پر معذرت بھی کی تھی۔(19)

1589-90ء میں جب عبدالرحیم خان خان خاناں کو قندھار فتح کرنے کی مہم پر بھیجا گیا تھا تو اس نے پہلے ٹھٹھہ کو فتح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ جوں ہی مرزا جانی بیگ کو قندھار فتح کرنے کے لئے خان خاناں کی منظم اور منصوبہ بند مہم کا پتہ لگا تو اس نے شاہی فوجوں کے ساتھ جانے کے لئے اپنی فوج کی پیش کش کی تھی۔ خان خاناں نے پیغام لانے والے کو قید کر لیا اور سندھ کی طرف اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ اس نے کمک بھی منگوائی تھی۔ بیکانیر کے رائے سنگھ اور جیسلمیر کے راول بھیم جن کو ریگستان کے علاقے میں لڑائی کا تجربہ تھا حکم کے مطابق تھار کے راستے سے خان خاناں کی فوج کے ساتھ آن ملے تھے۔ عمر کوٹ کے حکمراں رانا کی حمایت حاصل کرنے کے لئے راول بھیم اور مرزا فریدالدین کو بھیجا گیا تھا۔(20)

کافی طاقتور مزاحمت کے بعد مرزا جانی بیگ کو مجبور کیا گیا کہ وہ مغلوں کی طرف سے پیش کی گئی شرائط کو مان لے۔ اس طرح اسے اکبر کے دربار میں شخصی طور پر حاضر ہو کر بندہ درگاہ کا منصب قبول کرنا تھا۔ اس وقت اکبر نے اسے یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اب سے وہ اپنے حق کی بنیاد پر سندھ کا حکمراں نہیں رہا ہے بلکہ اب اس کی حیثیت مغل دربار کے ایک معزز شخص جیسی ہے۔ اسے تین ہزاری منصب عطا کیا گیا تھا اور ملتان اسے بطور جاگیر دے دیا گیا تھا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ٹھٹھہ بطور جاگیر مرزا شاہ رخ کو دے دیا گیا تھا۔(21) لیکن جب اس نے اپنے خودمختار اقتدار اور مرزا جانی بیگ کی حیثیت کو کم کرنے پر زور دیا تو آنے والے دو مہینوں ہی کے اندر بادشاہ نے ٹھٹھہ کو بطور جاگیر مرزا جانی کے حوالے کر دیا تھا مگر اب بھی اسے جو حیثیت دی گئی تھی وہ مغل امراء و شرفاء سے کم ہی تھی۔ سندھ کے سلطنت کے ساتھ سیاسی الحاق ہی کے بعد جب وہ مکمل ہو گیا تھا اکبر نے جانی بیگ کی لڑکی کو خان خاناں کے بیٹے مرزا ایرج سے بیاہ کرنے کی اجازت دی تھی۔(22) خانِ خاناں نے خود بھی عمر کوٹ کے رانا میگھ راج کی بھتیجی سے بیاہ کر لیا تھا اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ایک اہم مقامی حکمراں کے ساتھ براہ راست تعلق کے تاثر کو بڑھاوا دینا تھی۔(23) گویا اب سندھ کا مدار بھی شاہی دربار کے ساتھ ازدواجی و خاندانی رشتوں سے جڑ گیا تھا۔

ٹھٹھہ کو بہت کم وقت گزرنے کے بعد مرزا جانی بیگ کے حوالے کر دینے کی وجہ اکبر کا سیاسی حالات کے تحت فیصلہ تھا۔ اس نے یہ حقیقت محسوس کر لی تھی کہ سندھ کے لئے مقرر کئے

جانے والے مغل حکام کے لئے جغرافیائی اور سماجی پے چیدگیوں کی بنا پر حکومت کرنا مشکل ہو گا۔ ترخانوں نے مقامی لوگوں کے ساتھ خاصے مضبوط رشتے بنا لئے تھے چنانچہ ان لوگوں کو ریاست سے قریب لانے میں بیچ کا موثر کردار ادا کر سکتے تھے۔ اسی لئے مرزا جانی بیگ سے بادشاہ کی عارضی ناراضگی کے بعد جانی بیگ (24) کے منصب میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ (25) وہ بھی بادشاہ کے قریب ہونے کے لئے اکبر کے روحانی چیلوں کے سنگھ "ارادت غازی خان" کا رکن بن گیا تھا۔ (26) اس طرح وہ ایسے نظریئے سے وابستہ ہو گیا تھا جو ایک مرکزی ریاست کے عزائم و تقاضوں سے براہ راست جڑت رکھتا تھا۔ (27)

1601ء میں مرزا جانی بیگ کی موت کے بعد اس کا بیٹے کو مرزا غازی بیگ جس کی اکبر کے ساتھ ایک مختصر سا ٹکراؤ ہوا تھا۔ (28) ٹھٹھہ کی جاگیر اور پنج ہزاری منصب عطا کر دیا گیا تھا۔ (29) الحاق کے بعد سندھ کو صوبے کا درجہ دے دیا گیا تھا جس میں ٹھٹھہ، چچ گان، نصرپور، چکر ہالہ اور سیوستان کی پانچ سرکاریں شامل تھیں۔ (30) یہ اہم بات ہے کہ اکبر نے سیوستان کی سرکار اور بندرگاہ لاری بندر کو مرزا جانی خان کی تحویل میں نہیں دیا بلکہ ان کو خالصہ میں شامل کر لیا تھا۔ (خالصہ کے معنی وہ علاقے جو براہ راست مرکز میں شامل کر لئے جاتے تھے)۔ (31)

سیوستان (سیہون) سرکار میں بہت سے آوارہ خرام قبائل ہوا کرتے تھے اور ان کو انتظامیہ کا ماتحت بنا کر قابو میں رکھنا بہت مشکل تھا۔ اس لئے یہ طریقہ شروع کیا گیا کہ علاقے کو بطور جاگیر کچھ طاقتور قسم کے امراء کو دے دیا جائے۔ (32) سیوستان کے جاگیردار حضرات نے غالباً لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لئے جاگیر کے کچھ حصوں کو اپنے حکام اور سپاہیوں کی تحویل میں دے دیا کرتے تھے۔ (33)

زمینوں کے محصولات کی وصولیابی کے معاملے پر مغل حکام اور قبائل کے مابین مستقل ٹکراؤ رہتا تھا۔ حتیٰ کہ یہ لگتا ہے کہ مرزا جانی بیگ کو بھی ٹھٹھہ سرکار میں اس مسئلہ سے نبٹنا پڑتا تھا۔ جہاں کھیڑا اور نکمار قبائل آباد کسانوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ جانی بیگ نے طاقت کو بروئے کار لا کر ان کی سرکوبی کی تھی۔ (34) سہون کے جاگیردار بختیار بیگ کو فتنہ برپا کرنے والے ماچھی قبیلے کو پرگنہ نیلم قلعہ سے باہر نکالنا پڑا تھا اور ان کی جگہ بختیار بیگ نے محصول ادا کرنے والے یا

رعیتی پنہور قبیلے کی ہمت افزائی کر کے ان کو آباد کیا تھا۔ پر گنے کا نام بھی بدل کر اکبر آباد رکھ دیا گیا تھا۔(35)

یہ فرض کر لینا کہ سندھ کے الحاق کے باوجود انتظامیہ پر کوئی اثرات مرتب نہیں ہوئے تھے صحیح نہیں ہوگا۔ الحاق کے بعد زمینوں کے محصولات کی مقدار اور محصولات کے حسابی طریقوں میں بدلاؤ آ گیا تھا۔ اکبر جیسا کہ پتہ چلتا ہے زمینوں کے محصولات کی مانگ کل پیداوار کی ایک تہائی سے بڑھا کر نصف کر دی تھی۔(36) شاہ جہاں کے ابتدائی زمانے میں یوسف میرک نے لکھتے ہوئے کسانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے اور ترخانوں کی تعریف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انہوں نے محصولات کی مناسب شرح کا تعین کیا تھا جس کی وجہ سے علاقہ اور لوگ بھی خوش حال ہو گئے تھے۔(37) سندھ میں غلّہ بخشی (یعنی فصل میں حصہ داری) زمینوں کے محصولات کی وصولیابی کا مقبول اور مروج طریقہ تھا اور اب بھی رسماً یہ طریقہ جاری ہے۔(38) لیکن اکبر کے حکام نے محصولات نقد کی صورت میں جمع کرنے کو ترجیح دی۔ سہون کے جاگیردار بختیار بیگ نے اکبر کے زمانہ اقتدار میں محصولات کی اشیاء کی صورت میں ادائیگی منظور نہیں کی اور نقد ادا کرنے کی مانگ کی۔(39) اب چونکہ کسان منڈی کے تقاضوں پر انحصار کرتے تھے اس نقد ادائیگی کی مانگ کا ان پر بہت بڑا بوجھ ہو گیا تھا۔

اکبر سے پہلے اگرچہ سندھ کے حکمراں جیسا کہ پتہ چلتا ہے مقامی بڑوں جیسے کہ ارباب اور مقدم حضرات کو محصولات کی گرانٹس جاری کیا کرتے تھے اکبر اس طبقے کے لوگوں کو اس طرح سے محصولات کی گرانٹس جاری کرنے کے حق میں نہیں تھا۔(40) مجموعی طور پر اکبر کے اقدامات صوبے کی کل جمع دامی میں بڑھاوے کی ضمانت ثابت ہوئے تھے۔ 1595ء اور 1633ء کے دوران کل جمع 661152893 داموں سے بڑھ کر 93028000 دام ہو گئی تھی۔(41)

اکبر کے زمانے میں مرزا جانی بیگ کا کام کرتے رہنا جیسے کہ وہ کر رہا تھا، بعد اس کے بیٹے غازی بیگ کو جاگیر عطا کرنا اور صوبے کا گورنر بنایا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ان کے خلاف مغل ریاست کا مرکز مائل رویہ کمزور پڑ گیا تھا۔(42) 1611ء میں صوبے کی گورنری سے غازی بیگ کو الگ کر دیئے جانے کے بعد صوبے کی نگرانی اس کے کسی بھی خاندانی رکن

کے سپرد نہیں کی گئی تھی۔ نتیجے سبرآہ منیم کا خیال کہ صوبے کی نگرانی خاندانی لوگوں کو دی گئی ہے صحیح نہیں ہے۔(43) سندھ سے ترخان خاندان کو ہٹانے کے باوجود اس خاندان کی اہمیت پر کوئی حرف نہیں آیا تھا۔ شاہ جہاں کے زمانہ اقتدار میں مرزا عیسیٰ ترخان چار برس سے زیادہ مدت تک گجرات کے گورنر رہے تھے۔(44) ان کی حیثیت اصل میں بغیر کسی مشکل کے آزاد و خودمختار حکمرانوں سے گھٹا کر اعلیٰ سطح کے بیوروکریٹ جیسی کر دی گئی تھی۔ ان کو مناصب عطا کرنے کے معنی تھے کہ اب وہ ریاست کے ملازم ہو گئے تھے۔

سندھ الحاق کے ساتھ علاقائی طور پر سرکاروں اور پرگنوں کی شاہی تقسیم کی بنا پر ٹوٹ گیا تھا اور اس تقسیم کی وہی صورت تھی جو 1580ء کے بعد باقی سلطنت کی تھی۔ اکبر اور اس کے بعد آنے والے اس کے جانشینوں نے تمام مقامی حکام کو مجبور کرنے کی پالیسی طے کر لی تھی تا کہ وہ ایک شاہی معیار کے نظام سے مطابقت پیدا کریں۔ مغل الحاق کے بعد سندھ کے ساتھ کیا ہوا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کے بعض سوالات کس قدر بے معنی ہیں جن کا تعلق مغل سلطنت کے مرکزیانے کے عمل سے ہے۔(45)

حوالہ جات

1- میر محمد معصوم، تاریخ معصومی، مرتبہ یو۔ایم۔ داؤد پوتا، پونا 1938ء ص 147 اور 65-162۔ میر علی شعر قانع، تحفتہ الکرام، حیدر آباد پاکستان 1971ء (III) ص 57-56 اور 22-121

2- گلبدن بیگم، ہمایوں نامہ مرتب و مترجم اے۔ بیوریج، لاہور 1974ء ص 157۔ حاجی محمد عارف قندھاری۔ تاریخ اکبری۔ رام پور 1962ء ص 15۔ نظام الدین احمد طبقات اکبری، مترجم بی۔ ڈے۔ کولکتا 1939ء (II) ص 90

3- اکبر نامہ III ص 921-917

4- جب 66-1554ء میں عیسیٰ ترخان بھکر کے سلطان محمود کے خلاف فوجی مہم پر تھا پیڈرو باریٹو نے ٹھٹھہ پر دھاوا بول دیا تھا اور شہر میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا تھا۔ بہت سے لوگ مارے گئے تھے۔ (تاریخ معصومی۔ ص 206۔) سید طاہر محمود ٹھٹھوی نسیانی، تاریخ طاہری مرتبہ نبی بخش بلوچ۔ حیدر آباد پاکستان 1964ء ص 116-111 فریڈرک چارلس ڈیزورس۔ دی پورتو گیز ان انڈیا (1) ص 508

5- سہوان میں کپڑا بننے والوں کے ایک ہزار خاندان تھے، نصر پور میں تین ہزار اور ٹھٹھہ میں تین ہزار خاندان تھے۔ دی انگلش فیکٹریز ان انڈیا۔ مرتبہ ڈبلو۔ فوسٹر۔ آکسفورڈ 27-1906ء: 36-1634ء ص 29-128۔ فرانسسکو سیپاریٹ جہانگیرس انڈیا مترجم ڈبلو۔ ایچ مورلینڈ۔ کیمبرج 1925ء ص 32۔ ایف۔ ایس۔ مینریق۔ ٹریولز آف فادر سباسٹین مینریق، 43-1629، مترجم سی۔ ای۔ لارڈ۔ ہکلوت سوسائٹی لندن 1927 ص 239-238۔ نکولاؤ منوسی، اسٹوریا ڈو۔ موگور ترجمہ ڈبلو۔ اروِن۔ لندن 8-1907 (II) ص 427۔ عرفان حبیب، این ایٹلس آف دی مغل ایمپائر۔ دہلی

1982ص 15-16

6- جہانگیر یس انڈیا ص32

7- ٹریولیز آف ایف۔ ایس۔ مینریق (III) ص239

8- ابوالفضل، آئین اکبری مرتبہ بلوچ مان (1) ص 556۔ مظہر شاہ جہانی ص 49، 60 اور 232

9- آئین اکبری (1) ص556

10- بیوپاریوں میں تحفظ کے احساس کو پیدا کرنے کے لئے ارمز کے پرتگالی گورنر ٹھٹھہ میں اپنے ایک ایجنٹ کو استعمال کرتا تھا۔ اکبر نامہ III ص 921-920

11- احسن رضا خان۔ دی چیف ٹینز اِن دی مغل ایمپائر ڈیورنگ دی رین آف اکبر۔ شملہ 1977ء ص61

12- آئین اکبری ترجمہ (II) ص340

13- مظہر شاہ جہانی ص95-94 اور 184-183

14- ایضاً۔

15- آئین اکبری ترجمہ (II) ص339-338

16- تاریخ معصومی ص 143۔ مرزا قلیچ بیگ۔ ہسٹری آف سندھ کراچی 1902ء، (II) ص 111-108

17- اکبرنامہ (II) ص527-526

18- Tarikh-i-Tahiri, pp.170-1; 'Ali Shir Thattavi, Tuhfat-ul Kiram, ed. Husam-ud-din Rashidi, Hyderabad, 1971, III, pp.153-4.

19- اکبرنامہ (II) ص527-526

20- اکبرنامہ (II) ص 21-917، 925، 929، 930 اور 971

21- ایضاً ص979 اور 986-985

22- ایضاً ص979 اور 940

23- شیخ فرید بھکری۔ ذخائرۃ الاقوانین، مرتبہ معین الحق کراچی 1961ء (II) ص 317۔ شاہ نواز خان۔ معاصر الامراء مرتبہ مولوی اطہر علی۔ کولکتا 1890ء (1) ص 63

24- خاندیش کی مہم کے دوران جانی بیگ نے اپنی گفتگو میں اکبر کے خلاف کہا تھا کہ اگر اس کے پاس اسیر جیسا ایک قلعہ ہوتا تو وہ سو برس تک اپنے علاقہ کا دفاع کرتا۔ (عبدل باقی نہوندی۔ معاصر رحیمی۔ کولکتا 1931ء (III) ص 302

25- 1598ء میں اس کا منصب 3500 تک بڑھا دیا گیا تھا۔ (اکبر نامہ (III) ص 1071) اس کی موت کے وقت وہ 5000 کے منصب پر فائز تھا۔ (تزک جہانگیری مرتبہ سید احمد۔ علی گڑھ 1863-1864 ص 64۔ سید میر محمد۔ ترخان نامہ مرتبہ حسام الدین راشدی حیدر آباد پاکستان 1965ء ص 83

26- بدایونی۔ منتخب التواریخ مرتبہ احمد علی، کبیر الدین احمد اور ڈبلو۔ این۔ لی ببلیو گریفیکا انڈیکا کولکتا 1864-1869 (II) ص 304

27- ایم۔ اطہر علی، اکبر اینڈ اسلام۔ انڈین ہسٹری کانگریس، کالی کٹ 1976ء

28- معاصر الامراء (III) ص 866-877 انصار زاہد خان، ہسٹری اینڈ کلچر آف سندھ، کراچی 1980ء ص 61

29- بیگلار نامہ۔ 1814ء۔ معاصر رحیمی (II) ص 735، اکبر نامہ (III) ص 839

30- آئین اکبری میں ٹھٹھہ کو رسمی انداز میں صوبہ نہیں لکھا گیا ہے۔ اسے ملتان صوبے کی سرکار تصور کیا گیا ہے۔

31- اکبر نامہ (III) ص 985-986

32- ایضاً۔ مظہر شاہ جہانی ص 189

33- ایضاً۔ ص 144 اور 164-165

34- مظہر شاہ جہانی ص 144 اور 164-165

35- ایضاً۔ ص 65-66 اور 67

36- ایضاً۔ ص 51، 204، 207، 209-210 اور 220

37- ایضاً۔

38- آئین اکبری (1) ص 556۔ مظہر شاہ جہانی ص 51

39- مظہر شاہ جہانی ص 95-94

40- مظہر شاہ جہانی ص 185 اور 191-190۔ اصل میں اکبر نے مدد معاش نامی گرانٹس میں بتدریج کمی کرنے کے اقدامات کئے تھے۔ (آئین اکبری ص 197)۔

41- آئین اکبری، (1) ص 557 سنیتا زیدی پرابلمز آف مغل ایڈمنسٹریشن ان سندھ ص 153

42- چیتن سنگھ، سینٹر اینڈ پیری فیری اِن دی مغل اسٹیٹ۔ سترہویں صدی کے پنجاب کا مسئلہ۔ ماڈرن ایشین اسٹڈیز XXII (3) 1988 ص 318-299۔ دیکھئے ان کی کتاب ریجن اینڈ ایمپائر، پنجاب ان دی سیونٹینتھ سنچری، دہلی 1991ء ص 35-34۔ جو لوگ یہ نقطہ نظر رکھتے ہیں وہ منصب داری نظام کی کارکردگی کو نظر انداز کرتے ہیں خصوصاً سواروں کے منصب کو۔

43- جہانگیر کے زمانے کے گورنروں کے لئے دیکھئے عرفان حبیب، دی فیملی آف نور جہاں ڈیورنگ جہانگیر میں رین، اے پولیٹیکل اسٹڈی، میڈیول انڈیا اے میسلینی علی گڑھ 1969ء ص 94-79 اور شاہ جہاں کے زمانہ اقتدار کے لئے پراونشل گورنرس انڈر شاہ جہاں میڈیول انڈیا، اے مسلینی (III) علی گڑھ 1975ء۔ تاریخ سندھ ص 235-228۔ سنجے سبراہ منیم کا دعویٰ کہ مرزا جانی بیگ کے اہل خاندان وسط سترہویں صدی تک صوبوں پر کنٹرول کئے رہے تھے۔ ریفلیکشن آن ریسنٹ ویسٹرن ہسٹوریو گرافی۔ آئی۔ ای۔ ایس۔ ایچ۔ آر XXIX نمبر 3، 1992ء ص 310

44- علی محمد خان، مرآۃ الاحمدی، مرتبہ سید نواب علی بڑودہ 1928ء (1) ص 219-216

45- برٹن۔ اسٹین، پیزینٹ اسٹیٹ اینڈ سوسائٹی ان میڈیول ساؤتھ انڈیا۔ دہلی 1980ء ص 23

❁❁❁❁❁

سندھ کا مغل سلطنت سے الحاق
سفارتی اور فوجی تاریخ

فاطمہ زہرا بلگرامی

سلطنت اکبری کے ساتھ سندھ کا الحاق بہت اہم اسٹریٹیجک اہمیت کا واقعہ تھا کیونکہ اس کے بعد ہی سلطنت کے ساتھ کافی عرصے سے ملحق ایک اہم صوبے پنجاب کے لئے بحیرہ عرب کا راستہ محفوظ صورت میں دستیاب ہو گیا تھا۔ اکبر نے کافی طویل عرصے تک سندھ کے آزاد و خودمختار حکمرانوں کو برداشت کیا تھا اس اقتدار کے شروع ہونے کے وقت بالائی سندھ (بھکّر سے سہون تک) پر سلطان محمود خان حکمران تھا۔(1) جبکہ زیریں سندھ پر ترخانوں کا راج تھا جنہوں نے 1555ء میں ارغون حکمراں خاندان کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی سال پرتگالیوں نے ٹھٹھہ پر یلغار کر کے لوٹ مار کا بازار گرم کیا تھا۔(2) لیکن یہ سانحہ خوش قسمتی سے سندھ کے لئے ایک سرسری سے حادثے سے زیادہ کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

سندھ میں مغلوں کی مداخلت کا آغاز 1567-1568ء سے ہوتا ہے۔ جب مجاہد خان اور محب اللہ خان کی کمان میں شاہی لشکر بھکّر پہنچا تھا۔(3) اس زمانے میں سلطان محمود خان اپنے حریف مرزا محمد باقی ترخان کے ساتھ لڑائی میں جتا ہوا تھا۔(4) اب وہ شاہی فوجوں کے خلاف محاذ آرائی پر بھی مجبور ہو گیا تھا اور کئی ٹکراؤ کے واقعات رونما ہوئے تھے۔(5) آخر کار اس نے اکبر سے معاملات کو سلجھانے کے لئے اپنی بیٹی بھکّری بیگم کو 1572ء میں بیاہ کرنے کے لئے پیش کیا تھا جس کے بعد اسے بھکّر کا مستقل حکمراں مان لیا گیا تھا۔ سلطان محمود کے کوئی

بیٹا نہیں تھا اس لئے اپنی آخری بیماری کے دوران بھکّر کے ترخانوں کے ہاتھ آ جانے کے امکان کا سد باب کرنے کے لئے اکبر سے درخواست کی تھی کہ وہ بھکّر کے علاقے کو اپنی تحویل میں لے لے۔(6) 1574ء میں سلطان محمود کی موت کے بعد بالائی سندھ مغل سلطنت کا حصہ بن گیا تھا اور اسی وقت سے شاہی گورنر یکے بعد دیگرے علاقے کے انتظام کے لئے مقرر کئے جاتے رہے تھے۔(7) اکبر نے جب 1580ء میں اپنی سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کیا تھا اس علاقہ ایک سرکار کے طور پر مستحکم کیا گیا تھا (بھکّر کی سرکار) اور اسے صوبے ملتان سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ صوبے ملتان کی تفصیلات کا ذکر آئین اکبری میں قلمبند ہوا ہے۔(8)

سندھ پر مغل حملوں کا دوسرا مرحلہ 1586ء سے شروع ہوا تھا جب محمد صادق خان بطور گورنر ملتان پہنچا تھا۔(9) اسے بھکّر کی جاگیر بھی عطا کی گئی تھی اور یہ بھی ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ ٹھٹھہ کے حکمراں ترخان کا دھڑام تختہ کر دے۔(10) سہون روانہ ہونے سے پہلے ترخان حدود میں صادق خان نے پاٹ کی طرف مرزا جانی بیگ کا مقابلہ کرنے کے لئے فوجیں بھیجی تھیں جو کہ ان دنوں ترخان خاندان کا حکمراں تھا۔ پہلے دو مقابلوں میں شاہی فوجوں کو کامیابی ہوئی تھی اور جانی بیگ کی فوج کے بہت سے سپاہی مارے گئے تھے یا ان کو قیدی بنا لیا گیا تھا۔(11) ترخان فوجوں کے کمان دار سبحان قلی ارغون کو قیدی بنا لیا گیا تھا اور بارہ غراب قبضہ میں کر لئے گئے تھے۔(12) ان کامیابیوں کی تحریک سے صادق خان نے سہون کی طرف پیش قدمی کی تھی اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔(13) اب مرزا جانی بیگ کسی بھی طرح اکبر کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے بے قرار تھا۔ شاہی فرمان ملنے کے بعد اس نے بڑے احترام کے ساتھ بادشاہ کو معذرت کے خطوط بھی لکھے تھے۔(14) اپنے ایک خط میں اس نے یہ وعدہ بھی لیا تھا کہ وہ شایانِ شان تحفوں کے ساتھ اپنے بھائی شاہ رخ کو دربار بھیجے گا۔(15)

تاریخ طاہری کا ایک حوالہ بتاتا ہے کہ (16) یہ خط صادق خان کے ذریعہ بھیجا گیا تھا مگر اس نے یہ خط بادشاہ کو نہیں پہنچایا تھا اور قلعہ کا محاصرہ کئے رکھا تھا۔ معاصر مورخوں نے اس محاصرے کا ایک تصویری بیان قلمبند کیا ہے۔(17) قلعہ پر دھاوا بولنے میں صادق خان کی فوج ناکام رہی تھی اور قلعہ کے اندر سے آگ برسانے والی توپوں نے سہون سے ایک کروہ فاصلے تک پسپا کر دیا تھا۔(18)

محاصرے کی خبر سننے کے دوران مرزا جانی بیگ دریائے سندھ کے علاقے میں پہنچ گیا تھا۔(19) اس کی کشتیوں کی کمان خسرو خانؔ کر رہا تھا جب کہ اس کی زمینی فوجوں کی کمان ابوالقاسم سلطانؔ کے ہاتھ میں تھی۔(20) مورخوں کے اس حوالے سے بیانات متضاد ہیں۔ ابوالفضلؔ کے مطابق سہون کو قابو میں کرنے میں ناکامی کے بعد صادقؔ خان نصرپور آ گیا تھا، یہاں سے مالِ غنیمت اکٹھا کر کے قبضے میں کیا تھا اور جانی بیگؔ کے پہنچنے سے پہلے چلا گیا تھا۔(21) میر معصوم کا بیان کچھ مختلف ہے۔ محمد صادقؔ نے اپنے محاصرے میں اور پھیلاؤ پیدا کیا تھا اور لکی پہاڑیوں کے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ مرزا جانی بیگؔ کی لڑاکا کشتیاں بھی فوجوں سے کچھ فاصلے پر آ گئی تھیں اور ان کی توپوں نے بارود برسانا شروع کر دیا تھا۔(22) ترخان نامہ سے پتہ چلتا ہے کہ (23) جو لڑائی ہوئی تھی خاصی خوفناک تھی لیکن جانی خان کا پلڑا بھاری رہا تھا اور صادق خاںؔ کو لکی پہاڑ کے پیچھے ہی کچھ کامیابی ہوئی تھی اس سے آگے وہ کسی بھی مقام تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ طاہر نسیانی نے اس کی کچھ مزید تفصیلات مہیا کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ جانی بیگؔ کی فوج سندھ کے زیرِ حوالہ مقامی قبائل کی نسلوں پر مشتمل تھی۔ مغل، سندھی، سمیجا، سمہ، سومرا، غور، پلیجا اور نمکار۔ سندھی عموماً شاہی فوج پر رات میں حملہ کرتے تھے اور ان کے مویشی اور اونٹ چرا کر لے جاتے تھے۔ جانی بیگ کے پہنچنے کی خبر سن کر پوری مغل فوج بھاگ کھڑی ہوئی تھی اور بھکّر کی سرحد پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔(24) دو اور بھی بیانات ہیں۔ ادرکی بیگلار کا موقف ہے کہ محمد صادقؔ ان دو شیروں (ابوالقاسم اور خسرو خان) کا مقابلہ نہیں کر پایا تھا۔ وہ پسپا ہو کر بھکّر چلا گیا تھا اور اس طرح دشمن یعنی مغلوں کا خوف لوگوں کے ذہنوں سے نکل گیا تھا۔(25) معاصر رحیمی کے مطابق حالات پلٹ کر مرزا جانی بیگؔ کے حق میں ہو گئے تھے جس نے شاہی فوج کا بہت سا ساز و سامان قبضے میں لے لیا تھا۔ نہوندیؔ اکبر کے وقار کو باقی ماندہ سپاہیوں کے زندہ بچ جانے کا سبب گردانتا ہے ورنہ صادق خانؔ کی فوج کا ایک آدمی سلامت واپس نہیں ہوتا۔(26) اسی وقت مرزا جانی بیگؔ نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اپنے سفیر سید کو جلالؔ ایک عرض داشت اور تحائف کے ساتھ دربار میں بھیجا تھا۔(27) اکبر نے سفیر کو طلب کیا اور سید جلالؔ نے پوری دیانت کے ساتھ بادشاہ کو مطلع کیا کہ لڑائی کے دوران بہت زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔ اس ملاقات کے بعد بادشاہ نے سفیر کو رخصت ہونے کی اجازت دے دی تھی اور

اپنے سفیر حکیم عین الملک کو قیمتی لباس اور ایک ہاتھی مرزا جانی بیگ کے لئے دے کر بھیجا تھا۔ ان نوازشات کو قبول کرتے ہوئے جانی بیگ نے رسماً اطاعت قبول کر لی تھی۔ صادق خان کو ایک فرمان کے ذریعہ واپس بلا لیا گیا تھا۔ (28) ان واقعات کی وجہ سے اکبر کو اپنے منصوبوں میں نقصان ہوا تھا۔

سندھ کے الحاق کا آخری مرحلہ اس وقت شروع ہوا تھا جب 1590ء میں اکبر نے سندھ کے خلاف مہم کا کمانڈر عبدالرحیم خان خاناں کو بنا کر روانہ کیا تھا۔ معاصر مورخوں نے اس کی بہت سی مختلف تشریحات کی ہیں اور ان اسباب کی نشاندہی کی ہے جو دوبارہ جارحانہ اقدامات کے پیچھے کارفرما تھے۔ معصوم بھکری کے مطابق بادشاہ نے مرزا جانی بیگ کو سرنگوں کرانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا اور اس نے لاہور کو اپنی راجدھانی بنا لیا تھا۔ لیکن مرزا جانی بیگ نے مرزا شاہ حسن کی مثال کی پیروی کرتے ہوئے اطاعت نہیں کی تھی اور خود کو آزاد و خودمختار رکھنے کا پکا ارادہ کر رکھا تھا۔ اسی لئے ٹھٹھہ کے علاقے کو فتح کرنے کے لئے خان خاناں کو بھیجا گیا تھا اسے بلوچیوں کو کھدیڑنے کا بھی حکم دیا گیا تھا۔ (29) اکبر نامہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ (30) جانی بیگ نے اکبر کے غصے کو بہت زیادہ بھڑکایا تھا کیونکہ بادشاہ کو شخصی طور پر جا کر اس نے خراج پیش نہیں کیا تھا۔ نظام الدین (31) اور فرشتہ (32) کے بیانوں سے بھی اول الذکر بیانات کی تائید ہوتی ہے۔

سندھ کی تاریخوں میں ترخان نامہ کا بیان ہے کہ مرزا جانی بیگ کے مفاد پرست دشمنوں نے اس کے خلاف اکبر کے کان بھرے تھے اور خوب زہر اگلا تھا۔ اسے مرزا کے باغیانہ رویئے وغرور کے بارے میں خاص طور پر بتایا گیا تھا اور یہ کہ چونکہ اس نے شاہی فوجوں کو پسپا کر کے واپس جانے پر مجبور کر دیا تھا اس لئے وہ سندھ پر اپنی مطلق العنان بادشاہی کے خواب کو پورا کرنے والا تھا۔ (33) صادق خان کو جب ہاری ہوئی فوجیں راجدھانی واپس پہنچی تھیں جس ذلت کا سامنا ہوا تھا اس کا ذکر بیگلار نامہ کے مصنف نے کیا ہے۔ اکبر نے سخت غصے کا اظہار کیا تھا اور اس نے ٹھٹھہ پر قبضہ کرنے کے لئے عبدالرحیم خان خاناں کو روانہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ (34) طاہر نسیانی نے اس تباہی کا ذمہ دار مرزا جانی بیگ کو ٹھہرایا ہے۔ وہ مرزا شاہ رخ کے ذریعہ بادشاہ کی اطاعت کا مراسلہ بھیجنے کے بعد اس قدر مطمئن ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے کردار

کی تمام خوبیوں کو ختم کر کے عیاشی شروع کر دی تھی اور بدکرداری کا ارتکاب کرتا تھا۔ اس کے دربار کے بعض دانشمندوں نے اس تبدیلی کو اس کے بھی اور اس کے ملک کے بھی زوال کا اعلان نامہ قرار دے دیا تھا۔ یہ صورت حال اس وقت تک برقرار رہی تھی جب تک شاہی فوجیں سندھ میں داخل نہیں ہوئی تھیں لیکن سندھ میں شاہی فوجوں کے پہنچنے کے بعد جانی خاں کے سارے کس بل نکل گئے تھے۔(35)

ابوالفضل کا بیان ان سب ہی مورخوں سے مختلف ہے اور ان کے مابین مطابقت پیدا کرنا بہت مشکل ہے وہ لکھتا ہے کہ بطور گورنر ملتان خانِ خاناں کا تقرر قندھار کی مہم کے لئے کیا گیا تھا۔ لیکن اسے بلوچستان کے راستے سے پیش قدمی کا حکم ملا تھا یعنی ڈیرہ جات اور دکنی سلیمان پہاڑ کے سلسلوں کے ذریعہ۔(36) لیکن اس نے ٹھٹھہ کے زیادہ قیمتی منافع کو قندھار کے کم منافع کے مقابلے میں ترجیح دی تھی چنانچہ اس نے مجوزہ راستہ اختیار نہیں کیا تھا اور بھکر اور درہ بولان کے راستے کو ترجیح دی تھی۔(37) ابوالفضل نے خان خاناں کے نام اپنے خط میں منصوبے کے مطابق طے کئے گئے راستے کی تبدیلی پر ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ اور زور دیا تھا کہ وہ اپنی قندھار کی مہم کو ملتوی نہ کرے۔(38) ستمبر اکتوبر 1591ء کے خط میں جو لاہور سے لکھا گیا تھا وہ کہتا ہے کہ ناخوشگواری کا چوتھا سبب خان خاناں کا قندھار کی مہم کی طرف سے اپنی توجہ کا ہٹا لینا تھا اور ٹھٹھہ کی طرف پیش قدمی بڑی غلطی تھی۔(39) ایک اور خط میں بھی تقریباً یہی بیان دہرایا گیا ہے جس میں ابوالفضل نے مزید وضاحت کی ہے کہ قندھار کی فتح اصل میں ایران کی فتح کا پیش خیمہ ہو گی۔ وہ خان خاناں کے نقطہ نظر اور پروگرام میں تبدیلی کو ان لوگوں سے منسوب کرتا ہے جو خان خاناں کے دوست نما دشمن ہیں۔(40)

دوسرے خط میں ابوالفضل کے موقف میں تبدیلی نظر آتی ہے اور اب وہ خانِ خاناں سے صرف یہ توقع کرتا ہے کہ ٹھٹھہ کے معاملات کو قابو میں کرنے کے بعد اسے قندھار کی طرف پیش قدمی کرنا چاہئے تاکہ خراسان اور ایران کو فتح کرے۔(41) اس تبدیلی کی وجہ وہ شاہی منظوری تھی جو منصوبے کی تبدیلی کے لئے خان خاناں کو حاصل ہو گئی تھی۔ 1591ء کے ایک لاہور سے بھیجے گئے خط میں ابوالفضل اس حد تک آگے گیا کہ قندھار ٹھٹھہ اور دوسرے علاقوں کی مہم کے حوالے سے خانِ خاناں کو مبارک باد بھی دی تھی۔(42) اور ان مہمات کے دوران اس

کی ذاتی کارکردگی کی تعریف کی تھی۔

سندھ پر حملے کے جو بھی مجموعی اسباب رہے ہوں یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اکبر نے قندھار کی طرف پہلے پیش قدمی کے منصوبے میں تبدیلی کے اقدام کو منظوری دے دی تھی کیونکہ اسے خود شدید خواہش تھی کہ سندھ کا علاقہ اس کے قابو میں آ جائے اور وہ مرزا جانی بیگ کو یا تو نکال باہر کرے یا اسے سرنگوں کرنے پر مجبور کر دے۔

معاصر رحیمی نے لاہور سے سندھ کی طرف خان خاناں کی پیش قدمی کی تیاریوں کا منظر دکھایا ہے۔(43) اس کے لشکر میں جنگی ہاتھی بندوق بردار اور توپ خانہ فوج کے دستے تھے۔ جو حکام مہم کے ساتھ شامل تھے ان میں شاہ بیگ کابلی، سید بہاء الدین بخاری، فرید الدین برلاس، شیر خان، جانش بہادر، بختیار بیگ، کرا بیگ ترکمان، محمد خاں نیازی اور مورخ میر معصوم قابل ذکر تھے۔(44) میر معصوم اسی زمانے میں گجرات سے لاہور پہنچے تھے۔ دار بیلا، کاکڑی اور چانڈوکا (موجودہ ضلع لاڑکانہ) کے پرگنے جو بھکر سرکار سے وابستہ تھے ان کو بطور جاگیر عطا کئے گئے تھے۔(45) بھکر وہ 12- دسمبر 1590ء میں پہنچے تھے ان کے بعد خانِ خاناں بھکر آئے تھے۔ خواجہ مقیم بخشی کو فوج میں بخشی کے فرائض انجام دینے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

خانِ خاناں 1590ء میں بھکر پہنچ گئے تھے اور وہاں کچھ دن ٹھہرنے کے بعد سہون کی طرف چل پڑے تھے۔(46) سہون میں قلعہ کے دروازے ہر طرف سے بند تھے۔ اپنے کمانڈروں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ٹھٹھہ کی طرف بڑھنے سے پہلے اس نے سہون پر قبضہ کر لیا تھا۔ قلعہ کے چاروں طرف فوج پھیلا دی گئی تھی اور ایک سباط بنائی گئی تھی۔(47) (سباط = یعنی ایک محفوظ راستہ)، ابوالفضل لکھتا ہے کہ اس وقت قلعہ میں آگ بھڑک اٹھی تھی اور گوداموں کا ذخیرہ جل کر خاک ہو گیا تھا۔ اس خبر کے ملتے ہی شاہی فوجیں بہت تیزی کے ساتھ زمینی اور آبی راستوں سے آگے بڑھیں۔ آبی راستے سے بڑھنے والی فوجوں نے قلعہ سے آگے بڑھ کر لکھی پہاڑوں پر قبضہ کر لیا تھا۔(48) ابتدا میں جیسا کہ طاہر نسیانی نے لکھا ہے۔(49) خانِ خاناں قلعہ پر قبضہ کرنے کے لئے تھک گیا تھا مگر بعد میں اس نے سوچا کہ چند مٹی کے دیواروں پر قبضے کے لئے اپنے وسائل کو ضائع کرنا بیوقوفی ہو گی کیونکہ وہ آگے بڑھ کر راجدھانی ٹھٹھہ اور اس علاقے کے حکمراں پر قبضہ کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ اس کے

برعکس اکبرنامہ کا بیلا ہے کہ (50) سہون ٹھٹھہ کے علاقے کو جانے کا صدر دروازہ تھا چنانچہ اس پر قبضہ کو روکا نہیں جاسکتا تھا۔

خانِ خاناں فوج کے ایک حصے کو سہون سے نپٹنے کے لئے چھوڑ کر دکن کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ جانی بیگ نے حکم دیا کہ بوہیری کے مقام پر جو نصرپور کے قریب تھا ایک گڑھا کھودا جائے اور ایک قلعہ فوراً بنا دیا جائے۔ ان کے راستے میں جو رہائشی گھر ہیں ان کو ڈھا دیا جائے۔(51) سہون کی طرف دستان بیگ کے زیرانتظام فوج کا ایک دستہ بھیج دیا گیا تھا۔ جانی بیگ بوہیری کے مقام پر اپنی ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ سرنگ میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔(52) اس کے اور مغل لشکر کے پڑاؤ کے درمیان سات کروہ کا فاصلہ تھا۔(53) مرزا جانی بیگ کی فوج جیسا کہ بتایا گیا ہے فرنگیوں (پرتگالیوں)، رومیوں (ترکوں)، ملباریوں اور لونکوں؟ پر مشتمل تھی۔ اس کے پاس بہت زیادہ کشتیاں، توپچی فوج اور تین سو جنگی کشتیاں تھیں۔(54) معصوم کے مطابق سو سے لے کر دو سو تک کشتیوں کی کمان خسرو خان کر رہا تھا جبکہ خانِ خاناں کے پاس پچیس سے بھی کم کشتیاں تھیں۔(55)

اس لڑائی کے مختلف بیانات میں صاحبان معاملات کے جائزوں کی مدد سے ہم ایک قابل قبول خاکہ بنا سکتے ہیں۔ میر معصوم کا بیان ہے کہ خانِ خاناں بوہیری کے قریب پہنچنے پر جانی خاں نے ایک سو بیس جنگی کشتیاں اور دوسری قسم کی کشتیاں خسرو خاں کی کمان میں خانِ خاناں کے کیمپ اور کشتیوں پر حملے کے لئے بھیجی تھیں۔ ان کے علاوہ اس نے دو فوجیں بھی دریا کے دونوں کناروں پر پیش قدمی کے لئے روانہ کی تھیں۔ خانِ خاناں نے ریت سے ایک طاقتور جگہ بنائی تھی جہاں فوجی ساز و سامان رکھا گیا تھا۔(56) اس فوجی ساز و سامان اور توپوں نے اس مقام پڑاؤ کا دفاع کر رکھا تھا کیونکہ ہر صورت میں خسرو خاں کی کشتیوں کو اس طاقتور مقام سے گزرنا تھا۔ دشمن کی یہ کشتیاں شام میں پہنچی تھیں اور لگ بھگ یہ 23- جولائی، 20- اگست 1591ء کا زمانہ تھا۔(57) رات میں خسرو خاں نے دریا کے ذریعہ مختصر سی فوج کو بھیجا تھا مگر مغلوں کی طرف مستعد چوکیداری اور نگرانی کی بنا پر ان کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ دوسری صبح جانی بیگ کی جنگی کشتیوں نے مغل فوج کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ دونوں طرف تھوڑی دیر تک توپوں کی گھن گرج کا تبادلہ ہوا تھا یہ توپیں مغلوں کے طاقتور مقام پر تھیں تاہم

توپ کا ہر گولا اتنی اونچائی تک گیا تھا کہ وہ دشمن کی کشتیوں سے دور جا کر گرا اور ان لوگوں پر گرا جن کو خود خانِ خاناں نے دریا کی دوسری اور بھیج رکھا تھا۔(58) توپوں کے نشانے کو صحیح کیا گیا جن کی گولہ باری سے دشمن کی آٹھ یا نو جنگی کشتیاں تباہ ہوگئی تھیں۔ سندھی فوج کی جنگی کشتیوں میں بڑھیوں کا عملہ موجود تھا جس نے تباہ کشتیوں کو ٹھیک کر لیا تھا چنانچہ فوجوں کے درمیان ٹکراؤ میں مزید وقت لگا لیکن آخر میں سندھ کی جنگی کشتیاں پیچھے ہٹنے لگیں۔ خانِ خاناں کی جنگی کشتیوں نے ان کا پیچھا شروع کر دیا تھا اور دریا کے دوسرے کنارے پر تعینات فوج بھی ان پر گولہ باری کر رہی تھی۔(59) خانِ خاناں نے اپنی کشتی بردار فوجوں کی کمان بہت مہارت سے کی تھی۔ انہوں نے خود کو پیچھے رکھا اور اپنی دوسری کشتیوں کو آگے کی طرف بڑھاتے رہے تھے۔(60) لڑائی شام تک جاری رہی تھی اور دونوں طرف سے بارود کی آگ برسائی جاتی رہی تھی۔ سندھ کی جنگی کشتیوں کو ایک مشکل یہ پیش آئی کہ ان کو دریا کے بہاؤ کی مخالف سمت میں آگے جانا پڑا تھا۔(61) آدھے دن کے دو گھنٹے بیت جانے کے بعد سندھ کی فوج کے بہت زیادہ آدمی توپ کے گولوں کی زد میں آکر مر گئے تھے۔(62) مغلوں نے نہ صرف توپیں بلکہ برچھے اور بھالے بھی استعمال کئے تھے اور لڑائی ایک دوسرے کے ساتھ بہت قریب سے ہو رہی تھی۔(63) پرتگالی فوجوں کی کچھ کشتیاں بھی مغلوں کے ہاتھ آگئی تھیں۔(64) ایک شاہی جنگی کشتی نے خسرو خاںؔ کی کشتیوں پر دھاوا بول دیا تھا لیکن اچانک ان کشتیوں کے بارود میں آگ بھڑک اٹھی تھی، بہت سے سپاہی مر گئے تھے اور خود خسرو خاںؔ بچ نکلنے میں ناکام ہو گیا تھا۔(65) خانِ خاناں نے ایک شاندار فتح حاصل کر لی۔ اس کے بعد شاہی فوجوں نے مرزا جانیؔ بیگ کے بنائے ہوئے قلعہ (نئے نصرپور کا قلعہ) کی طرف پیش قدمی کی لیکن طویل محاصرے کے باوجود قلعہ پر قبضہ کرنے میں بڑی مشکلات سے دوچار ہوئے تھے۔(66) ایک رات شاہی فوجوں نے زبردست یلغار کی تھی لیکن ان کو کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ مزید یہ ہوا کہ مغل لشکر میں رسد کی کمی ہوگئی تھی۔(67) کیونکہ جانی بیگ نے رسد کی ترسیل کے ہر راستے کو روک رکھا تھا حالانکہ سندھ کی بیشتر علاقائی حدود اور اس کے پرگنے ابھی جانی بیگ ہی کے ہاتھ میں تھے۔ خانِ خاناںؔ نے دکنی سندھ میں جن کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کیا تھا اور قلعہ کے محاصرے کو ختم کر دیا تھا۔(68) اس دوران کشتیوں کے ذریعہ سہون کی طرف رخ کرنے والی مغل

فوجوں کو رسد پہنچائی گئی تھی۔(69) مغل حکام نے سندھ کے مختلف حصوں میں الگ الگ پھیل جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔(70) ایک جتھا سہون کی طرف جانے کو تھا اور جبکہ دوسرا اٹھٹھہ کی طرف۔(71) تیسرا جتھا بدین اور فتح باغ کے لئے روانہ ہونا تھا۔(72) ابوالفضل جس کا بیان میر معصوم سے کچھ مختلف ہے ان جگہوں کے علاوہ اگھم اور عمرکوٹ کا بھی حوالہ دیتا ہے جو مغلوں کے قبضے میں تھے۔(74) شاہ بیگ کو شاہ گڑھ کے قلعہ پر دھاوا بولنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہ قلعہ شاہ قاسم ارغون نے بنوایا تھا۔(75) بہادر خاں، بختیار بیگ، حسن علی ارباب، جان بیگ اور مقصود بیگ کی قیادت میں جو لشکر تھا سہون کی طرف بڑھا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔(76) محاصرہ جب سخت ہو گیا تو قلعہ کو مغل لشکر کے حوالے کر دیں گے۔(77) گریا مہتا(78) کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اور ابوالقاسم وخسرو خاں کی عرض داشتوں کو مانتے ہوئے جانی بیگ اپنی دس ہزار فوجوں کے ساتھ (79) سہون کی طرف چلا گیا۔(80) اس کے پہنچنے کی خبر سن کر مغل فوجوں نے لکی پہاڑوں پر صف بندی کر لی تھی۔ یہاں محمد خاں نیازی، دولت خان اور بہادر خاں کی تازہ کمک ان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ اس میں توپ خانہ اور کشتیاں تھیں اور اب ان کی تعداد بارہ ہزار تھی۔(81) پڑاؤ ڈالنے لشکر کی تیاریوں کا بیان تفصیلات کے ساتھ ابوالفضل نے قلمبند کیا ہے۔(82) میر معصوم بھکری نے بھی قلم بند کیا ہے۔(83) طاہر نسیانی نے جن کے والد حسن لڑائی میں شامل تھے مزید تفصیلات لکھی ہیں۔(84) تمام ماہر اہل الرائے کہتے ہیں کہ ابتدا میں جانی بیگ نے مغلوں کو اچھی طرح دبا لیا تھا۔(85) سخت وخون ریز مقابلہ ہوا تھا۔ آگ اور دھوئیں کا ایسا سمندر تھا کہ دوست و دشمن میں پہچان کرنا مشکل ہو گیا تھا۔(86) جانی بیگ بہادری سے لڑا تھا۔ اس کے بہت زیادہ سپاہی یا تو مارے گئے تھے یا پکڑ لئے گئے تھے۔(87)

وہ اپنے چار سو سپاہیوں کے ساتھ میدان جنگ میں ڈٹا رہا لیکن جوں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کامیاب نہیں ہوگا فوراً دم دبا کر بھاگ لیا۔(88) قلعہ اندر موجود اس کے سپاہیوں نے(89) بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو روکنے کی کوشش کی کیونکہ خانِ خاناں کی فوج ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ جانی بیگ کا ہاتھی اپنے ہی آدمیوں کو روندتا ہوا بھاگا جس کی بنا پر لشکر میں افراتفری اور خوف پھیل گیا تھا۔(90) ایک چھوٹی کشتی میں سوار ہو کر لڑائی کے میدان سے جانی بیگ چلا گیا

اور لڑائی کے مقام سے بیس کروہوں دور انٹر پور پہنچ گیا۔(91) یہاں اس نے ہر طرف سے گھرا ہوا ایک قلعہ بنوایا اور خود وہاں بند کر لیا۔(92) کچھ دنوں بعد خانِ خاناں یہاں پہنچ گیا اور قلعہ کو گھیر لیا۔تمام اندر جانے والے راستے روک دیئے اور رسد کی ترسیل کو بھی بند کر دیا۔(93) اسی دوران مغل فوجوں کو تازہ کمک اور ضروری ساز و سامان پہنچ گیا تھا۔(94) دوسری طرف قلعہ کے اندر دشمن کا پڑاؤ رسد کے فقدان کی وجہ سے بھوکا مرنے لگا تھا۔(95) اسی دوران ٹھٹھہ میں بھی بہت کچھ ہو چکا تھا۔

ٹھٹھہ میں خانِ خاناں کے پہنچنے کے بعد جانی بیگ نے مایوسی کی حالت میں اپنے باپ مرزا پائندہ کو لکھا کہ وہ ٹھٹھہ شہر کو خالی کر دیں اور کالان کوٹ (طغرل آباد) کے قلعہ میں ٹھہریں۔ جس کو جانی خان نے اسی دن کے لئے دوبارہ بنوایا تھا۔شہر میں اعلان کر دیا گیا کہ لوگ تین دن کے اندر شہر چھوڑ کر چلے جائیں۔لڑائی شروع ہو گئی تھی۔لوگوں نے جلدی میں جو اپنے گھروں کا سامان لیجانے کے قابل نہیں تھے اپنے گھروں میں خود کو بند کر لیا تھا۔سامان ڈھونے والوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اٹھائے جانے والے سامان کی قیمت کی آدھی یا تیسرا حصہ بطور مزدوری کے مانگ شروع کر دی تھی۔شہر کے خالی ہو جانے کے بعد جو بہت گھنا آباد اور خوشحال تھا اس میں آگ لگا دی گئی تھی جو ایک مہینے تک جلتی رہی تھی کیونکہ ٹھٹھہ شہر کے مکانات لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔شہر میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا اسے شہر میں گھس آنے والے آوارہ خرام لٹیروں نے لوٹ لیا تھا۔جو لوگ قلعہ کے اندر تھے ان کی حالت بڑی المناک تھی۔ان کے پاس پینے کے لئے سوائے ان کے اپنے جگر کے خون کے کچھ اور نہیں تھا۔کھانے کے لئے سوائے مردہ گھوڑوں کے گوشت کے کوئی اور غذا نہیں تھی۔رسوئیوں کی چمنیوں سے کوئی دھواں نہیں نکلتا تھا اور جو دھوئیں کے بادل چھائے تھے وہ توپوں کے گولوں کے تھے۔روٹی کی قیمت جان سے بڑھ گئی تھی۔لوگوں کے ہونٹ نمک کے ذائقے کو ترس رہے تھے۔قیدِ سخت کی اس حالت میں مرزا جانی بیگ نے اپنے باپ اور بیٹے کی موت کی خبر سنی جب کہ اس کی اپنی حالت بری ہو چکی تھی۔(96)

خانِ خاناں کو صورتِ حالات کی تمام جانکاری تھی۔اس نے مختلف علاقوں سے اپنی فوجوں کو بلایا۔(97) نیرون کوٹ (موجودہ حیدر آباد سندھ)۔(98) شاہ گڑھ اور بدین

مغلوں کے قبضے میں آ گئے تھے۔

معاصر ماخذ انٹر پور کے قلعہ کے گھیراؤ کی جہاں جانی بیگ تھا تفصیلات پیش کرتے ہیں۔ مغلوں نے ایک موزوں علاقہ چنا تھا۔ جس کے تین طرف پانی تھا۔ انہوں نے قلعہ کی طرف جانے والی سرنگیں کھود لی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ قلعہ کے سامنے جو گڑھے تھے ان کو بالو سے پاٹ دیا تھا۔(99) ابوالفضل نے اس کی واضح تفصیلات بتائی ہیں۔ عثمانیوں کے طریقے کے مطابق مغلوں نے بالو کو جمع کر کے بڑے بڑے اونچے ٹیلے بنا دیئے تھے۔ قلعہ کے اندر سے بالو کو ہٹانے کے لئے دشمن نے دھماکے سے اڑانے والے پٹاخے بنا لئے تھے۔(100) خانِ خاناں نے یہ وعدہ لیا کہ کوئی بھی نہ آرام کرے گا اور نہ نہائے گا جب تک کہ وہ گڑھوں کو بھرنے کا کام مکمل نہ کر لے۔ معمار استاد یار محمد خان جو حال ہی میں ایران سے پہنچا تھا اسے ایک اونچا مینار بنانے کو کہا گیا تھا تا کہ اس میں جنگی ساز و سامان رکھا جائے اور وہاں سے قلعہ کو کمان کیا جائے۔(101) ان اقدامات نے مرزا جانی بیگ کو خوف زدہ کر دیا تھا تاہم اس نے اپنے خوف کا اظہار نہیں کیا اور اکثر قلعہ کے باہر آتا رہا تھا۔(102) مینار سے لڑائی کا کام شروع ہوا اور لڑائی ہونے لگی۔ بہت خوفناک مقابلہ ہوا جس میں بہت زیادہ لوگ مارے گئے لیکن اچانک دونوں فریقوں نے صلح کا اعلان کر دیا۔

صلح کے لئے بات چیت کن حالات اور وجوہات کی بنا پر ہوئی تھی اس کے بارے میں مورخوں کا اختلاف ہے۔ ابوالفضل کے مطابق مصیبت میں گرفتار لشکر نے بات چیت کی مانگ کی تھی اور مغل لشکر نے غذا کے ذخائر میں کمی کا خیال کرتے ہوئے اس پیش کش کو مان لیا تھا۔(103) اسی طرح کے بیان معصوم بھکری(104) اور عبدالباقی نہوندی(105) کے بھی ہیں۔ معصوم کے بقول مغل حکام خانِ خاناں کو مشورہ دیا کہ صلح کی مانگ کو مان لیا جائے کیونکہ جانی بیگ اب اصل میں مٹی کا وہ شیر ہے جو مغلوں کی مٹھی میں ہے۔ خانِ خاناں نے پھر بھی اس مشورے کو نہیں مانا اور وہ اقدام کئے بغیر جن کو بعد میں خود مورخوں نے دانشمندانہ اقدام تسلیم کئے۔ لیکن سندھ کے مورخوں ادراکی بیگلار(106) اور ترخان نامہ کے مصنف نے(107) کا موقف ہے کہ صلح کی اپیل خانِ خاناں کی طرف سے آئی تھی۔ طاہر نسیانی کے بقول جب خانِ خاناں کا سفیر جانی بیگ کے سامنے پہنچا تو وہ اپنے کچھ سپاہیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جو زخمی تھے

اور نیلا ماتمی لباس پہنے ہوئے تھے جوان جھیتوں کی موت کے غم کی علامت تھا۔(108) مغلوں کا سفیر جانی بیگ کے سفیر رفاقت علی کابلی کے ساتھ رخصت ہوا۔ یہ کہا گیا کہ مرزا جانی بیگ کے بعض شرفاء اور خانِ خاناں کے مابین پہلے سے ہی خفیہ مراسلت ہو رہی تھی۔(109) مرزا جانی بیگ نے خانِ خاناں کی تجویز کو مانتے ہوئے آخر میں درج ذیل شرائط تسلیم کرلیں:

1- سہون مع سہون قلعہ کے مغلوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔(110)

2- خانِ خاناں کو جانی بیگ بیس جنگی کشتیاں دے گا۔(111)

3- دونوں طرف کے سپاہیوں کو اجازت ہوگی کہ وہ ایک دوسرے کی منڈیوں سے اپنی مرضی کی اشیاء خریدیں یا اپنی مرضی کی اشیاء بیچیں۔(112)

4- جانی بیگ کو تیاری کرنے کے بعد شخصی طور پر خانِ خاناں سے ملاقات کے لئے تین مہینوں کا وقت دیا گیا ہے۔(113)

5- جانی بیگ کو خانِ خاناں کے بیٹے مرزا ایرج کو قبول کرنا ہوگا اور برسات ختم ہونے کے بعد دربار میں جانا ہوگا۔(114)

اس کے بعد طے ہوا کہ پہلے قلعہ کا محاصرہ ختم کیا جائے۔ 16 خرداد یعنی 20 مئی 1592ء کو جنگی تیاریوں کے پڑاؤ کو ڈھا دینے کے بعد شادی بیاہ کی تقریبات کا انعقاد کیا گیا تھا۔(115) معاہدے کے بعد مرزا جانی بیگ ٹھٹھہ آ گیا جب کہ سہون کو مغلوں کے حوالے کر دیا گیا۔(116) خانِ خاناں نے سن میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا جو سہون سے بیس کروہوں کے فاصلے پر تھا۔ اسی شہر میں اس نے برسات کا موسم گزارا تھا۔(117)

یہی وہ تاریخی موڑ ہے جہاں سندھ کے الحاق کی مہم نے نیا رنگ اختیار کیا تھا۔ سب سے پہلے جانی بیگ کی تشویش کا سبب شاہی مانگ تھی کہ وہ اپنی بیویوں اور بہنوں کو پیشگی شاہی دربار میں بھیجے۔(118) ابوالفضل کہتا ہے کہ معاہدے کے تحت جانی بیگ خود شاہی دربار نہیں گیا مگر یہ سندیسہ ضرور بھیجا کہ موسم خزاں کے محصولات جمع کرنے کے بعد وہ شاہی دربار میں حاضر ہو گا۔(119) شاہی دربار کے لئے روانگی میں غیر ضروری تاخیر سے مغل کیمپ میں کافی گرما گرمی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ جانی بیگ کے سفیر کو بھی نظر بند کر دیا گیا تھا اور فوج کے تینوں حصوں نے تیزی کے ساتھ نصرپور جانا شروع کر دیا تھا۔(120) جانی بیگ خود ٹھٹھہ سے باہر آیا اور مغل

پڑاؤ سے تین کروہوں کے فاصلے پر پہنچا۔ اس نے راستے کو قابو میں رکھنے کے لئے دریا پر کنٹرول حاصل کیا۔ (121) ایک چھوٹی سی جھڑپ کے بعد مغلوں نے مرزا کا پڑاؤ لوٹ لیا۔ اس نے معاہدے کی اس طرح خلاف ورزی کا سبب دریافت کیا۔ اسے جواب ملا کہ مغل اس اقدام پر یوں مجبور ہوئے کہ ان کو پرتگالیوں کی آمد کی خبر ملی تھی۔ (122) معذرت کے بعد جو نقصان ہوئے تھے ٹھیک کر دیئے گئے اور دوستی کے تعلقات کی تجدید ہوگئی۔ جاڑوں کے موسم کی ابتدا میں خانِ خاناں فتح باغ کے دریا پر پہنچا جو ٹھٹھہ سے بیس کے فاصلے پر تھا۔ یہاں خوشگوار ماحول میں اس نے جانی بیگ سے ملاقات کی اور دونوں نے ہنسی خوشی ایک دوسرے کا سواگت کیا۔ (123) دونوں نے اپنے اپنے گھروں پر ایک دوسرے کی دعوتیں کیں جن میں تمام شرفاء اور امراء بھی شریک ہوئے۔ (124) اس کے بعد خانِ خاناں ٹھٹھہ چلا گیا۔ جہاں کئی باران دونوں کے درمیان ملاقاتیں ہوئیں۔ (125) وہ دونوں سیر اور شکار کے لئے بھی ساتھ ساتھ گئے۔ انہوں نے طغرل آباد، لہری بندر اور کراچی کے نزدیک منوڑا کے دورے کئے۔ (126) خانِ خاناں نے جانی بیگ کو یقین دلایا کہ وہ بادشاہ سے ان کے مقدمے کی سفارش کریں گے تاکہ اس کا علاقہ دوبارہ ان کو مل جائے۔ اس کے بعد جانی بیگ طغرل آباد چلا گیا اور خانِ خاناں ٹھٹھہ واپس ہو گئے تاکہ صوبے کے معاملات کو اپنی تحویل میں لے لیں۔ جواب (1592ء) مغل سلطنت کا حصہ ہو گیا تھا۔ معاصر رحیمی کا بیان ہے کہ فتح کا جشن شان کے ساتھ منایا گیا۔ استاد یار محمد خاں کو اس موقع کے لئے ایک پنڈال بنانے کا حکم دیا گیا۔ سپاہیوں کو انعامات سے نوازا گیا۔ خانِ خاناں کے شان میں ملا شکیبی اصفہانی، نظیری نیشاپوری، عرفی شیرازی، بیوقلی بیگ، غیوری ششتری، محمد شریف قوی، میر مغیث محوی، حیاتی گیلانی اور کامی خراسانی نے قصیدے گزارے۔ (127) کہا گیا ہے کہ ملا شکیبی نے اس موقع کے لئے مثنوی ساقی نامہ لکھی تھی۔

خانِ خاناں نے شکیبی کو بارہ ہزار اشرفیاں انعام دی تھیں۔ جانی بیگ نے بھی اسے بہت انعام سے نوازا تھا کیونکہ وہ مثنوی سے بہت خوش تھا اور کہا تھا کہ آپ نے مجھے تمام پرندوں میں سب سے اعلیٰ پرندہ (ہما) کہہ کر میرا وقار بڑھایا ہے اگر آپ مجھے ہما کے بجائے بدصورت کوا کہہ دیتے تو بھی کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ (128)

اسی دوران شاہی فرمان پہنچا کہ خانِ خاناں شاہی دربار میں جانی بیگ کے ساتھ پہنچیں اور سندھ کی نگرانی کے لئے بہاء الدین کو چھوڑ دیں۔(129) جانی بیگ اور دوسرے امراء کے ساتھ وہ 1593ء میں شاہی دربار پہنچے۔(130) اکبر نے جانی بیگ کا گرمجوشی کے ساتھ سواگت کیا اور تین ہزاری منصب سے نوازا۔(131) جلد ہی اس نے بادشاہ کی حمایت اور اس کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ اس کی دو لڑکیوں کا پہلے ہی شاہی خاندان میں بیاہ ہو چکا تھا۔ خانِ خاناں کی سفارش پر ٹھٹھہ سمیت جانی بیگ کے تمام علاقوں کو اسے دے دیا گیا سوائے سہون۔(133) اور لہری بندر کے (134) جو امراء سندھ میں خدمات انجام دے رہے تھے اور ٹھٹھہ کے جو امراء دربار میں آئے تھے ان کو اعلیٰ انعامات سے نوازا گیا تھا۔(135) ابوالفضل اکبر کے خط کا حوالہ دیتا ہے جو شاہ عباس صفوی کو لکھا گیا تھا اور سندھ کے فتح کے فوراً بعد ضیاء الملک کے ذریعہ بھیجا گیا تھا۔ اس میں جانی بیگ کی آمد اور ٹھٹھہ کو دوبارہ اس کی تحویل میں دیئے جانے کا ذکر تھا۔(136) اس کی غیر موجودگی میں ٹھٹھہ پر غازی بیگ حکومت کر رہا تھا۔(137) جانی بیگ کے تعلق سے ابوالفضل کا آخری بیان تک جس کا کسی اور مورخ نے ذکر نہیں کیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ بعض درباریوں نے بادشاہ سے کہا کہ وہ جانی بیگ کو روک لیں لیکن بادشاہ نے اسے منظور نہیں کیا۔(138) مرزا جانی بیگ شاہی دربار میں رہا اور بادشاہ سے اس کے تعلقات اچھے رہے۔(139) وہ خود کو بادشاہ کے چیلوں کی فہرست میں شمار کرتا تھا۔(140) اکبر نے جب قلعہ اسیر گڑھ کا محاصرہ کیا تھا تو جانی بیگ بھی اس کے ساتھ تھا۔(141) جانی بیگ کا انتقال 1599ء یا 1600ء میں دماغ کے بخار کی وجہ سے برہان پور کے مقام پر ہوا تھا۔ شاہی فرمان کے مطابق خواجہ محمد قو بیگی اس کی لاش کو لے کر ٹھٹھہ کے قریب مکلی گئے جہاں اسے سپردِ خاک کر دیا گیا۔(143)

حوالہ جات

1- سلطان محمود بھکر کے لئے دیکھئے میر معصوم۔تاریخ معصومی مرتبہ داؤد دیوتا ممبئی 1938ء ص 218، 228-222، 238-232۔ اور علی شیر قانعوی۔ تحفتہ الکرام مرتبہ حسام الدین راشدی، حیدرآباد 1971ء (III) ضمیمہ ص 122-120، 192 اور 200-194

2- تاریخ معصومی ص 207: میر محمد ٹھٹھوی، ترخان نامہ مرتبہ حسام الدین راشدی، حیدرآباد 1965ء ص 46۔ محمد طاہر نسیانی، تاریخ طاہری مرتبہ نبی بخش خاں بلوچ حیدرآباد 1964ء ص 112-111

3- عبدالباقی نہوندی، معاصر رحیمی مرتبہ ایم۔ہدایت حسین کلکتہ 1925ء (II) ص 339-338۔تاریخ معصومی ص 235-228۔تحفتہ الکرام ص 144-143 (III)

4- تاریخ طاہری ص 147 اور 151۔ تحفتہ الکرام (III) ص 143۔ تاریخ معصومی ص 214-211 ترخان نامہ ص 56

5- تاریخ معصومی 34-233۔تحفتہ الکرام III ص 44-14۔معاصر رحیمی II ص 39-336

6- تاریخ معصومی ص 235

7- معاصر رحیمی II ص 342-340۔ تاریخ طاہری ص 147۔ تحفتہ الکرام (III) ص 313۔ ان کے تقرر، تبادلوں اور نکالے جانے کی تفصیلات تاریخ معصومی ص 236-235 پر ہیں۔

8- آئین اکبری مرتبہ بلوچ ان (1) ص 554 اور عرفان حبیب، اٹلس آف دی مغل ایمپائر نقشہ 5A اور نوٹس ص 14-13۔

9- اکبر نامہ III حصہ دوم۔ص 495

10- تاریخ معصومی ص 248۔ترخان نامہ ص 66 اور تاریخ طاہری ص 169۔

11- تاریخ معصومی ص 248۔ ترخان نامہ ص 67 اکبر نامہ III ص 492۔ان میں صرف

ایک لڑائی اور اس میں حصہ لینے والوں کے کوائف ملتے ہیں جبکہ معاصر رحیمی ص 343 جلد II میں بتاتی ہے کہ دو لڑائیاں ہوئی تھیں۔ بیگلار نامہ کے ایک پیراگراف ص 25-224 اور 228 بتاتا ہے کہ مرزا باقی پہلی لڑائی کے دوران کسی وقت مارا گیا تھا۔ اس کا جانشین سیوستان کا گورنر مرزا جانی اب محل سے دور تھا اور کسی سول لڑائی میں پھنسا ہوا تھا۔ یہ لڑائی وہ جانشینی کے مسئلے پر اپنے چچا مظفر مرزا سے لڑ رہا تھا۔ تحفتہ الکرام III ص 151-150

12- تاریخ معصومی ص 249 صرف دو غراب قبضے میں آئے تھے اور دونوں طرف کے بہت سے فوجی مارے گئے تھے۔ ترخان نامہ 67

13- تاریخ معصومی ص 249۔ ترخان نامہ ص 68-67۔ بیگلار نامہ ص 229 معاصر رحیمی II ص 343۔ اکبر نامہ III ص 495

14- تاریخ طاہری ص 171-170۔ تحفتہ الکرام III ص 154-153۔ مرزا باقی کی موت کے بعد جانی بیگ کے نام فرمان جاری کیا گیا تھا کہ وہ خراج پیش کرے اپنے سکوں پر اکبر کا نام لکھوائے اور خطبے میں اس کا نام شامل کرلے۔ مرزا جانی یہ شرائط مان لیں۔

15- تاریخ طاہری، ص 171-170۔ تحفتہ الکرام III ص 154-153

16- طویل محاصرے کے بعد بقول معصوم بھکری انہوں نے ایک بارودی سرنگ لگائی تھی جس کے دھماکے سے قلعہ کا صدر دروازہ اور سامنے کی دیواریں تباہ ہوگئی تھیں۔ صادق خان نے حکم دیا کہ کوئی بھی اس کی اجازت کے بغیر قلعہ میں داخل نہ ہو۔ جب دھواں اور غبار صاف ہوگیا تو فوج نے ایک اور دیوار کھڑی کردی تھی اور اپنی توپیں داغنا شروع کر دی تھیں۔ تاریخ معصومی ص 249-248

17- اکبر نامہ III۔ ص 751 کے مطابق بارودی سرنگوں نے کچھ دیواروں کو تباہ کر دیا تھا مگر مغل مزید پیش قدمی نہیں کر سکے تھے کیونکہ مٹی کے مینار بہت بلند تھے۔ اس دوران تاخیر کے سبب لشکر ایک اور دیوار بنانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ معاصر رحیمی کے مطابق (II) ص 343 بارودی سرنگ اور محفوظ راستہ (ثبات) تیار ہوگئے تھے اور قلعہ کی دیواریں تباہ ہوگئی تھیں۔ ان کے حوالے تاریخ طاہری ص 172۔ ترخان نامہ ص 67 اور تحفتہ الکرام III ص 154 پر ملتے ہیں۔

18- ترخان نامہ ص67
19- ترخان نامہ ص249
20- معاصر رحیمی (II) ص343
21- اکبر نامہ III ص495
22- تاریخ معصومی ص188
23- ترخان نامہ ص67
24- تاریخ طاہری ص172-173
25- بیگلار نامہ ص230
26- معاصر رحیمی (II) ص345
27- ابوالفضل آئین اکبری III ص 509۔ وہ ایک عرض داشت کا بھی حوالہ دیتا ہے اور سید جلال کے پہنچنے کا سال 1586ء بتاتا ہے۔ صادق خان کی دربار میں واپسی کا سال 1571ء ہے۔ طبقات اکبری (II) ص406-407۔ کولکتا 1931ء میں صادق خان کی واپسی کا سال 1588ء بتایا گیا ہے۔ ترخان نامہ ص 66 کا بیلز ہے کہ مرزا جانی بیگ نے خفیہ آدمی کے ذریعہ تحفے اور پیش کش بھیجی تھی جن کے ساتھ میر جلال الدین بن میر سید علی شیرازی اور ٹھٹھہ کے شیخ الاسلام بھی تھے۔
28- تاریخ معصومی ص 249۔ ترخان نامہ ص 69۔ تاریخ طاہری ص 173۔ عبدالقادر بدایونی۔ منتخب التواریخ (II) ص359۔ طبقات اکبری (II) ص406-407 مکتوبات علامی ص105۔ حکیم عین الملک کے سفر ٹھٹھہ کا حوالہ بھی دیکھیے۔
29- تاریخ معصومی ص249۔ معاصر رحیمی (II) ص 345 میں مرزا جانی بیگ کی گرم مزاجی اور صادق خاں کے ساتھ بدتمیزی کا ذکر ہے جس کی وجہ سے اکبر غصے سے بھر گیا تھا۔ اس لئے ریاست کا تقاضا تھا کہ مرزا جانی افغانوں اور بلوچوں کو سزا دی جائے۔ اس کے لئے خانِ خاناں کو بھکر اور ملتان کا گورنر بنایا گیا تھا، اسے ٹھٹھہ کو فتح کرنے اور جانی بیگ کو سزا دینے کے لئے بھیجا گیا تھا۔
30- اس کے خلاف فوج بھیجنے کا فیصلہ ہوا اور اس سے کہا گیا کہ وہ خود آئے یا اپنی فوج بھیجے ورنہ قندھار سے شاہی فوجوں کی واپسی کے بعد اسے سزا دی جائے گی۔ اکبر نامہ II

ص585۔اکبرنامہ بی ایم ایڈ27اور247میں مزید تفصیلات ملتی ہیں۔

31- طبقات اکبری(II) ص412-411

32- تاریخ فرشتہ (II) ص623

33- ترخان نامہ ص70

34- بیگلار نامہ ص231

35- تاریخ طاہری ص175-174

36- اکبرنامہ III ص585۔ابوالفضل کا خط مکتوبات علامی لکھنو1853ء میں ص88

37- بی۔ایم۔ایس۔ایڈ۔27اور247جو اکبرنامہ کے ایک ابتدائی متن پر مشتمل ہے اور خانِ خاناں کے سندھ پر دھاوے کے بارے میں مزید تفصیلات بتاتا ہے کہ خانِ خاناں نے براہ بھکر سفر کیا۔ ملتان اور بھکر اس کی جاگیر تھیں۔ چھوٹے غزنین بنگش راستے سے اس نے گریز کیا تھا جس کے ذریعہ وہ آسانی سے قندھار پہنچ سکتا تھا۔اس کے بعض ساتھیوں نے اسے اس راستے کے استعمال کی رائے دی تھی۔مگر اس نے یہ رائے نہیں مانی تھی۔

38- مکتوبات علامی ص79-78ریاض الاسلام کے مطابق خط کی تاریخ 15دسمبر1589ء ہے جو جلال آباد سے لکھا گیا تھا۔اے کیلنڈر آف پرشین ڈاکومینٹس جلد اول کراچی 1979ء ص105

39- مکتوبات علامی ص84۔اکبرنامہ بی۔ایم۔ایس۔ایڈ27اور247-393الف

40- مکتوبات علامی ص88

41- ایضاً۔ص99

42- مکتوبات علامی ص91

43- معاصر رحیمی (II) ص358۔فیضی نے ایک ماہ و سال کی فہرست مرتب کی تھی "قصد ٹھٹھہ"۔1590-91ء

44- تاریخ معصومی ص252۔حکام کی طویل فہرست کے لئے دیکھئے اکبرنامہ III ص585 بی۔ایم۔ایس۔ایڈ27، 247اور393-392میں کچھ زیادہ تفصیلات ہیں۔

45- معاصر رحیمی (II) ص359۔ایسا لگتا ہے کہ جانی بیگ تمام عزائم سے بے خبر تھا۔بقول

ابوالفضل جب خانِ خاناں نے اپنے لشکر کے ساتھ بھکّر میں پڑاؤ ڈالا تھا جانی بیگ کا ایک سفیر وہاں آیا تھا اور بتایا کہ آقا یہاں آنے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ وہ فتنہ پردازوں سے الجھے ہوئے ہیں مگر وہ قندھار کی مہم میں شاہی فوجوں کی مدد کے لئے اپنی فوج بھیجنے پر تیار ہیں مگر سفیر کو گرفتار کرلیا گیا تھا اور شاہی لشکر آگے چل کھڑا ہوا تھا۔ اکبر نامہ III ص602

46- سہون کے قلعہ کے بارے میں ابوالفضل کا بیان ہے کہ حکمراں کا یہ قلعہ ایک دریائے سندھ کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے۔ خاکریز یہاں سے چالیس گز کے فاصلے پر ہے۔ اس کی دیوار سات گز اونچی ہے۔ اس کے قریب ایک جھیل ہے جس کی لمبائی آٹھ اور چوڑائی چھ کروہ ہے۔ دریا کی تین شاخیں یہاں آکر ملتی ہیں۔ اکبر نامہ III ص602

47- تاریخ معصومی ص252۔ ترخان نامہ ص72

48- اکبر نامہ III ص602۔ یہ بنگال اور کشمیر کے مقام بارہ مولا کی گڑھیوں جیسا ہے۔ تاریخ طاہری ص 181 کا بیان ہے کہ لکھی پہاڑیوں سے سفر کے دوران خانِ خاناں کو جو مشکلات اٹھانا پڑی تھیں اور دریائے سندھ سے سن تک پہنچنے میں جو دقت ہوئی تھی کیونکہ راستے بہت تنگ تھے اور آبادیاں باغی تھیں۔

49- تاریخ طاہری ص181

50- اکبر نامہ III ص602۔ مزید تفصیلات کے لئے بی۔ایم۔ایم۔ایس۔ایڈ 27، 247 اور 393

51- بوہیری یا بھیری جو ہیجا نصر پور سے دس میل کے فاصلے پر ایک بستی ہے۔ ابوالفضل نے بوہیری کا ذکر نہیں کیا ہے۔ وہ صرف لکھتا ہے کہ نصر پور کی گزرگاہ پر ایک مقام ہے جو دریا کے کنارے ہے۔ اس نے یہاں ایک قلعہ بنوایا تھا اور اسے جنگی کشتیوں اور توپخانہ فوج سے لیس کیا تھا۔ اکبر نامہ III ص 602۔ ترخان نامہ کا مطبوعہ متن ص 71 میں غالباً لکھت کی غلطی کی وجہ سے لوہیری لکھا گیا ہے۔

52- بیگلار نامہ۔ ص232۔ معاصر رحیمی (II) ص360

53- ترخان نامہ ص 71۔ خانِ خاناں نے چار دیواریں اٹھوائی تھیں جو دشمن سے چھ کوس

(بارہ میل) کے فاصلے پر تھیں۔ اکبر نامہ III ص 602

54- معاصر رحیمی II ص 360۔ طبقات اکبری II ص 414۔ ابوالفضل کے مطابق جانی بیگ کے ساتھ بہت سے قبائلی اور اچھے لباس میں ملبوس خدمتگار تھے۔ اکبر نامہ III ص 602

55- خسرو خاں کا تعلق اس خاندان سے تھا جو چنگیز خان کا تھا اور جس نے ترخانوں کے ماتحت مختلف قسم کی خدمات انجام دی تھیں۔ اسے ایک عظیم عمارت ساز کے نام سے یاد کیا جاتا تھا جس نے ٹھٹھہ اور مکلی کے اطراف کئی پل، مسجدیں اور کنویں بنوائے تھے۔ تحفۃ الکرام III ص 216-214

56- تاریخ معصومی ص 252-251

57- ایضاً۔ ص 252۔ پانی کے اتھلے پن کی وجہ سے دشمن قریب نہیں آسکا تھا۔ اکبر نامہ III ص 602

58- زمین کے راستے جانی بیگ کے پہنچنے کی خبر سن کر فرید برلاس اور دوسرے رات کے اندھیرے میں دریا سے واپس آگئے تھے۔ اکبر نامہ III ص 602

59- تاریخ معصومی ص 252

60- تاریخ طاہری کے مطابق ص 85-184 اور ترخان نامہ ص 73-72 مرزا جانی نے اپنے سپاہیوں سے مشورے کے بعد خسرو خاں کی کمان میں ایک کشتی کا لشکر بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ زمینی فوجوں کی کمان وہ خود کر رہا تھا۔ خسرو نے منصوبے کے مطابق شاہی فوجوں پر حملہ کیا مگر خسرو خان کو خود اسی کے ان لوگوں نے دھوکا دیا جو اس سے جلتے تھے۔ اور اس کی ہار کے متمنی تھے۔ بالآخر دوسری صبح کو اسے پسپا ہونا پڑا۔

61- ابوالفضل کہتا ہے کہ سندھ کی فوج تیز دھارے کی طرف جا رہی تھی اور دھارے کی طاقت نے ان کو دبوچ لیا تھا۔ اکبر نامہ III ص 602

62- تاریخ معصومی ص 252۔ اکبر نامہ

63- لڑائی خوفناک تھی اور لاتعداد لوگ مرے تھے یا پکڑے گئے تھے کچھ کو دریا کے بھنور میں ڈبو دیا گیا تھا۔ شاہی فوجوں کو ڈھیروں مال غنیمت ہاتھ آیا تھا۔ جن کو پکڑا گیا تھا ان کی جان بخشی کر دی گئی تھی۔ دس یا بارہ کشتیاں جن میں ترک، مالاباری اور فرنگی سپاہی تھے دریا میں ڈوب گئی تھیں۔ خانِ خاناں حریف فوج کی بہادری سے اتنا متاثر ہوا کہ اس

نے ایک فتح لکھنا چاہا اور ان سروں کا مینار بنانے کا ارادہ کیا۔ اکبر نامہ III ص 603 جانی بیگ کے ایک ہزار آدمی زخمی ہوئے دو سو مارے گئے جبکہ مغلوں کا نقصان بہت کم ہوا تھا۔

64- لوگوں سے بھری ہوئی چار کشتیاں قبضہ میں آئیں۔ ایک میں ہرمز کی آبادی کا پرتگالی سفیر بھی تھا۔ اکبر نامہ III ص 603۔ طاہر نسیانی نے اس کا نام چارکاس بتایا ہے اور اس کو فرنگی بیوپاریوں کا سردار کہا ہے۔ جو ہر سال ہرمز سے آیا کرتا تھا۔ تاریخ طاہری ص 185۔

65- نہوندی کے مطابق (II) ص 361 جانی بیگ کی ایک کشتی میں آگ بھڑک اٹھی۔ اکبر نامہ III ص 603 سے پتہ چلتا ہے کہ شاہی کشتیوں نے خسرو خاں کا پیچھا کیا تھا اور اسے زخمی کر دیا تھا۔ وہ اسے قید کرنا چاہتے تھے کہ اچانک ایک توپ پھٹ گئی اور کشتی کے پرخچے اڑ گئے۔ تاریخ معصومی ص 253۔ ترخان نامہ ص 73

66- تاریخ معصومی ص 253۔ معاصر رحیمی II ص 353۔ اکبر نامہ III ص 603۔ بیگلار نامہ ص 233 میں زیادہ تفصیلات مہیا کی گئی ہیں اور لکھا ہے عزائم سے مایوس ہو جانے کے بعد شاہی حکام نے جگہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور شاہ گڑھ چلے گئے جہاں ابوالقاسم کو مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ لار کی طرف چلے گئے تھے اور آخر میں انہوں نے سہون پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ معاصر رحیمی II ص 263 کے مطابق قلعہ کو فتح نہ کرنے کے باعث خانِ خاناں نے اپنی توجہ نصر پور سے ہٹا لی تھی۔ جانی بیگ اور ان کے حامیوں نے مغل پڑاؤ پر رات میں حملوں کا منصوبہ بنایا۔

67- ابوالفضل کے بقول دشمن کے قلعہ میں خوراک کا بہت ذخیرہ تھا۔ مغل پڑاؤ میں خوراک کی کمی تھی اکبر نامہ III ص 606 اور 608۔ معاصر رحیمی III ص 263 کے مطابق خانِ خاناں نے بادشاہ کو ان کٹھنائیوں سے آگاہ کیا، رسد اور رقم مانگی جو مہیا کر دی گئی تھی۔ رائے سنگھ یہ سامان جیسلمیر کے راستے سے لے کر گئے تھے۔ دیکھئے طبقات اکبری بھی II ص 414

68- معاصر رحیمی II ص 363 دشمن کو لوگوں اور کسانوں کا تعاون حاصل تھا۔ وہ برسات کے منتظر تھے۔ اکبر نامہ III ص 608

69- ایضاً۔ص 608

70- ترخان نامہ ص 74 کے مطابق یہ منصوبہ خانِ خاناں کو گریا مہتا نے دیا تھا جو جانی بیگ کی فوج سے بھاگا ہوا ایک غدار تھا اور اس ادھیڑ بن میں تھا کہ جانی بیگ قلعہ سے باہر آئے اور لڑائی میں شریک ہو۔

71- بہت سے فوجی ٹھٹھہ چلے گئے تھے تاکہ شہر کو لوٹ کر رسد حاصل کریں اور دشمن کو خوف زدہ کریں۔اکبر نامہ III ص 608

72- شاہ بیگ خاں محمد خاں نیازی، قاسم کوکا، مرتضٰی قلی، دادمَل، داؤد بیگ اور دوسرے افغانوں کو پکڑنے کے لئے بھیجے گئے تھے ان کو یہ بھی کہا گیا تھا کہ مرزا جانی پر کڑی نظر رکھیں اکبر نامہ III ص 608

73- دہارو بہادر۔خان قرداراور دوسرے بدین بھیجے گئے تھے اکبر نامہ III ص 608

74- مرزا فریدوں اور راول بھیم کو عمر کوٹ بھیجا گیا تھا کیونکہ وہاں شاہی کنٹرول کمزور پڑ گیا تھا۔اکبر نامہ III ص 606 اور 608

75- تاریخ معصومی ص 254

76- ایضاً۔معاصر رحیمی II ص 364۔ابوالفضل کے بقول سید بہاء الدین،قرا بیگ اور بختیار بیگ سہون کی طرف بھیجے گئے تھے جو ضروری سامان لے کر گئے تھے۔اکبر نامہ III ص 608

77- تاریخ معصومی ص 254 معاصر رحیمی II ص 363 دشمن اپنے خاندان والوں کی وجہ سے پریشان تھا۔

78- گریا نے اپنے آقا کو نصر پور قلعہ چھوڑنے کا مشورہ دیا اور سہون چلے جانے کی رائے دی کیونکہ اگر قلعہ سہون مغلوں کے ہاتھ چلا گیا تو سندھ کے اندر گھسنے کا دروازہ کھل جائے گا۔گریا کا منصوبہ کامیاب رہا جس کے تحت جانی بیگ نے سہون کی طرف دوڑ لگائی تھی۔مغلوں نے بوہیری پر قبضہ کرلیا تھا۔ترخان نامہ 74-75۔بقول ابوالفضل کہ شاہی فوجوں نے بہت مشکل حالات میں سہون قلعہ پر قبضہ کیا تھا۔اکبر نامہ III ص 608

79- تاریخ معصومی ص 255۔معاصر رحیمی ص 365۔اکبر نامہ III ص 609۔اکبر اس کے

پانچ ہزار فوجی بتاتا ہے۔ طبقات اکبری II ص 417 اور ترخان نامہ ص 77 بھی دیکھئے جو سپاہیوں کی تعداد چھ ہزار بتاتے ہیں۔

80- ابوالفضل لکھتا ہے کہ جانی بیگ سہون میں موجود کشتیوں پر قبضہ کرنے کے لئے سہون کی طرف دوڑا تھا۔ طبقات اکبری II ص 416 میں لکھا گیا ہے کہ سہون کے لشکر کی کارکردگی اچھی نہیں تھی سو وہ سپاہیوں کو سزا دینے وہاں گیا تھا۔ دیکھئے معاصر رحیمی III ص 366 بھی۔ ترخان نامہ 77، بیگلارنامہ 234

81- تاریخ معصومی ص 255۔ معاصر رحیمی ص 365 اکبر نامہ III ص 609۔ طبقات اکبری II ص 417-416

82- اکبر نامہ III ص 609

83- تاریخ معصومی ص 255۔

84- اپنی پہچان کو نمایاں رکھنے کے لئے خانِ خاناں کے سپاہیوں نے اپنی پگڑیوں میں تیر لگا لئے تھے جبکہ جانی بیگ کے فوجیوں نے اپنی پگڑیوں میں ہری شاخیں لگالی تھیں۔ جانی بیگ نے اپنے سپاہیوں سے وعدہ کیا تھا کہ جو بھی دشمن کا ایک سر کاٹ لائے گا پانچ سو کبارس کا انعام پائے گا لیکن گریا جو ریاست کے مالی حالات کو اچھی طرح سمجھتا تھا انعام کی رقم پچاس کبارس لکھی ہے۔ اس معمولی سی رقم کے باوجود بھوکے لوگوں نے لڑائی میں حصہ لیا۔ تاریخ طاہری ص 183۔ تاریخ طاہری میں لکھا ہے کہ ایک کبار بارہ میریز کے برابر ہیں۔ بہتر میریز ایک تنکہ کے برابر ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایک تنکہ چھ کبارس کے برابر ہوا۔ اکبر کے زمانے میں بیس تنکے ایک روپیہ کے برابر تھے۔ اس لئے پانچ سو کبارس چار روپیہ سے کچھ زیادہ بنتے ہیں۔

85- اکبر نامہ III ص 629

86- اکبر نامہ III ص 629۔ معاصر رحیمی ص 367۔ تاریخ معصومی ص 255۔ بیگلارنامہ ص 236

87- تاریخ معصومی ص 255۔ ابوالفضل کے بقول جانی بیگ کے تین سو آدمی مارے گئے اور شاہی فوج کے سو آدمی مرے۔ اکبر نامہ III ص 609۔ ترخان نامہ ص 75 میں یہ تعداد دونوں طرف کی ملا کر آٹھ ہزار بتائی گئی ہے جس پر یقین نہیں کیا جا سکتا ہے۔ راجا

دھارل مال (پسر ٹوڈرمل و جانی بیگ دیکھئے معاصر رحیمی ص 367 (1)۔ اکبر نامہ III ص 609 اور تر خان نامہ ص 79) کے درمیان تفصیلات ان حوالوں میں موجود ہیں۔

88- تاریخ معصومی ص 255۔ اکبر نامہ III ص 609

89- نام ہیں شاہ قاسم ارغون، خسرو خان چارکا، ملا محمد فراہی، علی سلطان غزنوی اور حسن۔ ابوالفضل کے مطابق خانِ خاناں نے قلعہ کو تباہ کر دیا تھا۔ اکبر نامہ۔

90- اکبر نامہ III ص 609۔ تاریخ طاہری ص 191۔ تر خان نامہ ص 79۔ معاصر رحیمی (II) ص 367

91- انر پو یا انٹر پور سہون سے چالیس اور ہالا کندی سے چار کوس پر تھا۔ اکبر نامہ III ص 614۔ تاریخ معصومی کے مطابق ص 256۔ وہ لڑائی کے میدان سے بیس کوس دور تھا۔

92- تاریخ طاہری ص 192-191۔ تاریخ معصومی ص 256۔ بیگلار نامہ 239۔ تر خان نامہ ص 79

93- معاصر رحیمی II ص 369-368۔ طبقات اکبری II ص 416

94- اکبر نامہ III ص 608 اور 615

95- علاقہ کی اجنبیت اور کسانوں کی مکاری کی وجہ سے غذا کی کمی ہو گئی تھی۔ لشکر میں بیماری بھی پھیل گئی تھی۔ غیر معمولی بات یہ تھی کہ بیماری نے سندھ کے لوگوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اکبر نامہ III ص 614۔ شاہی مدد کے باوجود مغل مطمئن نہیں ہو سکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جانی بیگ کی برائے امن تجاویز کو مان لیا تھا۔ اکبر نامہ III ص 615

96- تاریخ طاہری ص 195-194۔ نظام الدین بھی لکھتا ہے کہ لوگوں نے اپنے مویشیوں کو ذبح کیا اور کھایا۔ طبقات اکبری II ص 417۔ ابوالفضل بتاتا ہے کہ قلعہ کے اندر کی فضا آلودہ ہو چکی تھی کیونکہ وہاں بہت سی لاشیں گل سڑ رہی تھیں۔ جو لوگ زندہ بھی تھے ان کی حالت نازک ہوتی جا رہی تھی۔ اکبر نامہ III ص 616

97- ابوالفضل بتاتا ہے کہ جو لشکر ٹھٹھہ بھیجے گئے تھے انہوں نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا کیونکہ بدمعاش لوگوں کو شہر میں آگ لگانے کی اجازت دے دی گئی تھی اکبر نامہ III ص 608

98- ابوالفضل نے نیرون کوٹ پر قبضے کا حوالہ دیا ہے اور اس کی طاقت کی تعریف کرتا ہے۔
اکبر نامہ III ص 614
99- تاریخ معصومی ص 256
100- اکبر نامہ III ص 615
101- معاصر رحیمی II ص 368-369
102- کہتے ہیں کہ جانی بیگ قلعہ چھوڑ کر جانا چاہتا تھا یا کسی اور جگہ پہنچنا چاہتا تھا لیکن ابوالقاسم نے اسے مشورہ دیا کہ وہ نہ جائے کیونکہ بہت سے ارغون اور ترخان خاندان وہاں رہ رہے تھے۔ بیگلار نامہ ص 239۔ ابوالفضل نے عربوں اور کردوں کے ایک جتھے کا حوالہ دیا ہے جو قلعہ میں رہ رہے تھے اور انہوں نے ابوالقاسم سے جھگڑا کیا تھا۔ اکبر نامہ III ص 614 بی۔ ایم۔ ایس۔ ایڈ 247-27 ایف۔ 396 اے۔
103- اکبر نامہ III ص 614 بی۔ ایم۔ ایس۔ 247-27 ایف۔ 396 اے۔
104- تاریخ معصومی ص 256 جس کے مطابق خانِ خاناں صلح کی تجویز کو مانتے ہوئے جانی بیگ کو پنج ہزاری منصب دینے کا ارادہ کیا تھا۔
105- شاہی لشکر فتح کی طرف بڑھ رہا تھا اس لئے جانی بیگ نے صلح کا کارڈ استعمال کیا تھا۔
معاصر رحیمی II۔ ص 370-371
106- بیگلار نامہ ص 239۔ خانِ خاناں نے ایک بزرگ میاں جی کو بھیجا تھا کہ وہ صلح کی بات چیت کرے۔ جانی بیگ نے اسے مان لیا تھا۔
107- ترخان نامہ ص 79
108- تاریخ طاہری ص 199-197۔ میر علی شیر ٹھٹوی کے مطابق اس موقع پر خانِ خاناں نے جانی بیگ کو سندیسہ دیا کہ وقت و حالات کی مجبوری نے ہمیں لڑنے پر مجبور کیا تھا۔ آپ نے جو بہادری کا مظاہرہ کیا عرصہ تک یاد رکھی جائے گی۔ تاہم آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ ایک طرف آپ کے ساتھ دنیا کا عظیم شہنشاہ ہے جس کے سامنے بڑے بڑے بہادر بھی اپنا ماتھا ٹیک دیتے ہیں۔ تحفتہ الکرام III ص 159
109- تاریخ طاہری ص 199۔ تحفتہ الکرام III ص 159
110- اکبر نامہ III ص 615۔ تاریخ معصومی ص 256

111- تاریخ معصومی کے مطابق ص 256 تیں غرابیں۔ ایضاً ترخان نامہ ص 80 اور اکبر نامہ III ص 615۔ طبقات اکبری II ص 417 میں صرف بیس کا ذکر ہے۔

112- تاریخ طاہری ص 199

113- اکبر نامہ III ص 615۔ طبقات اکبری II ص 418۔ معاصر رحیمی II ص 371

114- اکبر نامہ III ص 615۔ تاریخ معصومی میں اس شق کا ذکر نہیں ہے۔

115- اکبر نامہ III ص 615۔ جانی بیگ کی دوسری لڑکی کا بیاہ جہانگیر کے بیٹے شہزادہ خسرو کے ساتھ ہوا تھا۔

116- اس روز سہون کے گورنر رستم نے قلعہ کو حسن علی ارباب اور مقصود آقا کے حوالے کیا اور پورا سہون مغل سلطنت کی تحویل میں آ گیا تھا۔ اکبر نامہ III ص 616

117- ایضاً۔ ص 616۔ بیگلار نامہ ص 240۔ ترخان نامہ ص 80 تحفۃ الکرام III ص 161

118- تاریخ طاہری 92 بی، 94 اے اور 95 بی۔

119- اکبر نامہ III ص 634

120- ایضاً۔

121- ایضاً۔

122- خانِ خاناں نے اس سے اپنے سمندری بیڑے کو چھوڑنے کے لئے کہا تھا تاکہ مستقبل میں دھاوا بولنے والے سمندری ڈاکوؤں کی سرکوبی کی جا سکے اور اس کے لئے سمندری بیڑے کو استعمال کیا جائے۔ اکبر نامہ III ص 634

123- ترخان نامہ ص 80

124- اس کا مقصد جگہ کو دیکھنا تھا مگر اصل مقصد دریا کے زیریں حصے کو قابو میں کرنا تھا۔ اکبر نامہ III ص 634

125- ترخان نامہ ص 80۔ ابوالفضل کا موقف مختلف تھا۔ ٹھٹھہ کے دورے کے بعد خانِ خاناں لہری بندر گیا تھا۔ اس نے شاہ بیگ، بختیار بیگ، فریدوں برلاس اور دوسروں کو مرزا کے ساتھ جانے کو کہا تھا۔ اس نے ٹھٹھہ میں کسی کو چھوڑ کر زمین کے راستے سے واپسی کا سفر کیا۔ فتح باغ وہ خود 29 بہمن یعنی 20 فروری کو پہنچا۔ اکبر نامہ III ص 634

126- معاصر تحریروں میں ان کے دوستانہ رویوں کے بارے میں بہت سے حوالے ملتے ہیں۔

مقالات الشعرا ص 527-526۔ تحفۃ الکرام III ص 161۔ درج ذیل ترخان نامہ ص 81-80 سے متعلق ہے۔ خانِ خاناں اور مرزا جانی کشتیوں میں بیٹھ کر سمندر میں گئے۔ خانِ خاناں اور ان کے امراء نے چونکہ سمندر کبھی دیکھا ہی نہیں تھا بہت پریشان ہوئے اور ان کو جانی بیگ پر شک ہوا۔ اسی دوران مرزا کے چیلوں نے ان کو مشورہ دیا کہ ان مہمانوں کو سمندر کے سپرد کردیں مگر مرزا نے اس پر خفگی کا اظہار کیا۔ وہ اپنی کشتی کو خانِ خاناں سے قریب لاکر ان کی خاطر مدارت کرتے رہے۔ مرزا جانی بیگ صرف لکھاری اور شاعر ہی نہین تھے مزاح کا سنہرا ذوق تھا۔ ابوالفضل بھی اس کی عالمانہ صلاحیت کی تعریف کرتا ہے۔ اکبرنامہ III ص 783

127- معاصر رحیمی II ص 375-374۔ ان قصیدوں کے لئے دیکھئے تحفۃ الکرام III ص 275-259

128- مقالات الشعرا ص 527-526۔ تاریخ طاہری ص 207۔ تحفۃ الکرام III ص 161۔ فرید بخاری ذخیرۃ الخوانین۔ کراچی 1961ء (1) ص 39

129- اکبرنامہ III ص 634۔ تاریخ معصومی ص 257 کے مطابق دولت خان لودھی اور خواجہ مقیم کو خانِ خاناں کی طرف سے سندھ پر انتظامی امور کا نگراں بنایا گیا تھا۔

130- امراء کی فہرست اکبرنامہ III ص 634۔ منتخب التواریخ (II) ص 386

131- اسے بڑھا کر 3500 کردیا گیا تھا اکبرنامہ III ص 721۔ مرزا جانی کے مناصب کے بارے میں مختلف حوالے ہیں۔ تاریخ معصومی ص 376 میں یہ چار یا پانچ ہزاری ہے۔ معاصر رحیمی II ص 376 میں یہ ایک جگہ تین ہزاری اور دوسری جگہ چار ہزاری ہے۔ ص 349۔ تزک جہانگیری کے مطابق (ترجمہ (1) ص (13) اس کا منصب پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار تھا۔ دیکھئے ایم۔ اطہر علی۔ اپریٹس آف ایمپائر، دہلی 1985ء۔ اندراج اے 196، 332، 427، 497 اور 758۔ جب وہ مرا تھا تو اس کا منصب تین ہزار پانچ سو سے زیادہ نہیں تھا۔ اس کے سواروں کے اعزاز کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ اس کے حوالے جتنے بھی اعلیٰ اعزازات کے حوالے ملتے ہیں مشکوک ہیں۔

132- ٹھٹھہ کا نگراں پہلے شاہ رخ کو بنایا گیا تھا۔ اکبرنامہ III ص 638

133- سہون جس کا الحاق بطور پیش کش ہوا تھا۔ بختیار بیگ کو بطور جاگیر عطا کیا گیا تھا۔ ایضاً

ص642

134-انڈس ڈیلٹامیں بندرلہری کوخالصہ میں شامل کیا گیا تھا۔ایضاً۔ص642

135- ٹھٹھ کے امراء شاہ قاسم ارغون،خسرو بھائی خان،داستان،سیف اللہ،ارباب اورندیم کوکا تھے۔ان سب کوشاہی رعایت دی گئی تھی۔شاہی امراء میں شاہ بیگ خاں کوڈھائی ہزاری اورسید بہاءالدین کویک ہزاری عہدے ملے تھے۔اکبرنامہ III ص634

136- منتخبات علامی ص23

137- تاریخ معصومی ص257،تاریخ طاہری ص205

138-اکبرنامہ III ص634 ترجمہ ص986

139-بیگلارنامہ ص 242-241۔ تاریخ طاہری ص 205-204۔تحفتہ الکرام III ص164-165

140- منتخب التواریخ II ص305

141-ایک حوالہ جوذخیرۃ الخوانین II ص21 پرہے بتاتا ہے کہ اس موقع پرمرزاجانی بیگ اکبر کی توجہ سے محروم ہوگیا تھاجس کی وجہ خان دیش کے حکمراں کے قلعہ کوحوالے کرنے پر اس کاتبصرہ تھا۔

142- تاریخ معصومی ص257۔تحفتہ الکرام III ص165۔تاریخ معصومی کے مطابق ص208 اوراکبرنامہ III ص783 اس کی موت زیادہ شراب پی لینے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ ابوالفضل اس کی موت کا سال 1601ء بتاتا ہے۔مراۃ العمرا (1) ص 527 بھی دیکھئے۔

143- تحفتہ الکرام III ص165

❁❁❁❁❁

سکّہ سازی کا غائب ہو جانا

الف سکّوں پر ایک شذرہ

نجف حیدر

کچھ عرصے سے مورخوں اور ماہر سکّہ فہموں نے کسی حد تک اس تاثر کا اظہار کیا ہے کہ 989-99ھ/1582-1581ء سے لے کر 1591-1590ء تک مغل سلطنت کے سکّہ سازی کے اہم مراکز سے ہر قیمت کے سکّے غائب ہو گئے تھے۔(1) 1000ھ/92-1591ء میں یہ سکّے دوبارہ بڑی تعداد میں آ گئے تھے جن پر سکّہ سازی کے مرکز کا نام "اردو ظفر قرائین" اور تاریخ الف یا 1000 کھدی ہوئی تھی۔

جن اسکالرز نے اس موضوع کا احاطہ کیا ہے ان میں سب سے زیادہ خیال آفرین جان۔ ایس۔ دے یل ہیں۔ ان کے مطابق اس کی وجہ ایک ہی وقت میں سکّہ سازی کے مراکز کا بند ہو جانا تھا جو 1580ء کی پوری دہائی کے دوران بند رہے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ مغل سکّہ ساز مراکز کا بنیادی کام پہلے کے جاری سکّوں اور بیکار ہو جانے والے سکّوں کو دوبارہ ڈھالنا تھا۔ ایک بار جب یہ مرحلہ مکمل ہو گیا تھا تو پھر سکّہ سازی کے مراکز کو جاری رکھنا اقتصادی نقصان کا سودا تھا۔ ان کے خیال میں یہ واقعہ 89-988ھ میں ہوا تھا۔ اس طرح دے یل نے ملک کے اندر سکّہ ساز مراکز کی طرف سے مہیا کئے گئے تازہ سونے چاندی کی اینٹوں کی مجموعی تعداد کو منہا کر کے چھوٹ دے دی ہے لیکن وہ خود بھی یہ صحیح سمجھتا ہے کہ سونے کے سکّوں کے دستیاب نہ ہونے کی وضاحت کرنا مشکل ہے۔(2) اس کے باوجود خاتمے پر وہ لکھتا ہے کہ "اگر

بیشتر اہم سکہ ساز مراکز کو چند برسوں تک اس دباؤ کی قیمت کا بوجھ اٹھانا پڑا تھا جن کا منافع نہ ہونے کے برابر ہی رہ گیا تھا تو سرکار نے پوری سلطنت میں دوبارہ سکہ سازی کے عمل کو معطل کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ تا آں کہ سکہ ساز مراکز کی دوبارہ تنظیم سازی مکمل نہ ہو جائے۔(3)

پی ایل گپتا نے اس خلا کو پر کرنے کی کافی کوشش کی ہے مگران کا رویہ بہت محتاط ہے۔ ان کے خیال میں سکہ ساز مراکز نے سکوں پر اپنے نام دینا بند کر دیا تھا اور اس کی ایک یکساں نام اردو دیا جانے لگا تھا۔ اس کا تعلق غالباً سکہ ساز مراکز کی تنظیم نو سے تھا۔(4) سال 989-999ء میں جو خلا پیدا ہوا تھا اس کی وضاحت گپتا نے نہیں کی ہے۔

ایک دہائی کے اس خلا کی وضاحت کرنے سے پہلے جب کہ سکے بالکل غائب رہے تھے یہ زیادہ مفید ہوگا کہ مستند ماہرین سکہ سازوں کی گواہیوں کا جائزہ لیں۔ خاکہ نمبر 1 کی بنیاد بہت سے میوزیموں کے کیٹلاگوں سے لئے گئے نمونوں پر ہے۔(5) جن کو تاریخ کی ترتیب سے گنا گیا ہے۔ خاکہ نمبر 2 کا ماخذ لکھنو میوزیم کے خزانچی کی رپورٹیں ہیں جن کو اول الذکر ہی کی طرح مرتب کیا گیا ہے۔(6) ہماری گنتی کا کام 980ھ سے شروع ہو کر 44 الٰہی سال یا 1007ھ (7) پر ختم ہوتا ہے اور اس میں گیارہ سکہ ساز مراکز کی پیداوار شامل ہے۔ خاکہ نمبر 1 واضح طور پر ماہرین سکہ ساز مراکز کو پیش کرتا ہے جس میں احمد آباد کا مرکز شامل نہیں ہے۔ ان مراکز میں تسلسل کے ساتھ چاندی کے سکے ڈھالے جاتے تھے۔ دوسرے تمام مراکز میں چاندی کے سکوں کی ڈھلت 989ھ/82-1581ء میں بند ہو گئی تھی اور دوبارہ 1000ھ یا 37 الٰہی/92-1591ء سے شروع ہوئی تھی۔ 989ھ کے لگ بھگ سونے کے سکے بھی بننا بند ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ احمد آباد کے مرکز پر بھی ان کے دوبارہ ڈھالے جانے کا کام نہیں شروع ہوا تھا۔ تانبے کے سکوں کا بھی تین مراکز میں یہی معاملہ تھا گو کہ اجمیر، دوگاؤں اور نارنول کے مراکز کا معاملہ مختلف تھا جو صرف تانبے ہی کے سکے ڈھالتے تھے۔(8) ان مراکز سے سکے جن پر ہجری سال لکھا ہوتا تھا سال 1000ھ تک جاری ہوتے رہے تھے۔

سال 1000ھ اور بعد تک مختلف سکہ ساز مراکز میں ڈھالے جانے والے سکوں سے قطع نظر سکہ ساز مرکز اردو ظفر قرائین سے تینوں دھاتوں کے سکے بڑی تعداد میں بنائے جاتے تھے جن پر 1000ھ یا الف کا سال لکھا ہوتا تھا۔

خاکہ نمبر 12 انہی معلومات کو مزید تقویت فراہم کرتا ہے جو خاکہ نمبر 1 سے ملتی ہیں گو کہ دہلی اور لاہور کے حوالوں سے کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ خاکہ نمبر 1 سے معلوم ہوتا ہے چاندہ کے سکّے 99-990ھ میں ناموجود تھے اور اگر تھے تو نہ ہونے کے برابر تھے۔ (اس پورے عرصے کے دوران خزانے میں سونے کے سکّے بھی مشکل ہی سے ملتے تھے۔ ان میں سال 985ھ اور 987ھ کے دو سکّے آگرہ میں تھے البتہ تانبے کے سکّوں پر ناموجودگی کے کم اثرات مرتب ہوئے تھے۔) 1000ھ میں جن سکّوں کا تعلق سکہ ساز مرکز اردوظفر قرائین سے تھا ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس کے بعد احمد آباد تھا یہ سکّوں کی ناموجودگی کے معاصر رجحان سے مختلف صورتِ حال تھی۔ خاکہ نمبر 2 میں منٹ میں نہ بننے والے سکّوں کی بہت زیادہ تعداد کا سبب گواہیوں کے دو گروہوں میں ایک فرق ہے جس کے بارے میں ہم نے تبادلہ خیالات کیا ہے گو کہ خزانوں سے ملنے والی رپورٹیں سکّوں کا اس قدر سخت معیار اور گہری توجہ سے معائینہ نہیں کرتی ہیں جتنی کہ میوزیم کیٹلاگ ہوتی ہیں۔ ان میں وہ سکّے بھی شامل کیے گئے ہیں جن کو نقل سمجھ کر رد کر دیا جاتا ہے خصوصاً جب ان کی تعداد بہت زیادہ ہو۔ (9)

اس لئے سوال یہ ہے کہ خاکہ نمبر 1 اور نمبر 2 میں دیکھی جانے والی خالی جگہیں صحیح ہیں اور یہ کہ واقعی کیا مغل سکّہ ساز مراکز بند ہو گئے تھے یا ان کی وضاحت کسی اور پہلو سے بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ مسئلہ پیچیدگی اختیار کر لیتا ہے کیونکہ اگر کوئی سکّہ ساز مرکز اس دوران کام نہیں کر رہا تھا تو ہمیں اس کی وضاحت کرنا ہوگی کہ پھر 993ھ/ 1585ء میں بایزید بیاتؔ کو فتح پور سیکری کے سکّہ ساز مرکز پر داروغہ کیوں مقرر کیا گیا تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہمیں وثوق کے ساتھ علم ہے۔ (10)

اس کی وضاحت کی ہے اور یہ سادہ سی بات ہے۔ 990ھ/ 83-1582ء کے دوران عبدالقادر بدایونیؔ نے منتخب التواریخ میں ایک تنقیدی بیان لکھا ہے۔ ''خود کو پوری طرح مطمئن کرنے کے بعد کہ اماموں کی پیغمبری سے 1000 برس بعد یعنی وہ مدت جب تک اسلام باقی رہے گا اب ختم ہوئی ہے چنانچہ اب بادشاہ کے اندر جو خواہش بہت دنوں سے چھپی ہوئی تھی جاگ اٹھی کیونکہ اسے روکنے والی کوئی منطق باقی نہیں رہی تھی۔ بساط اب علماء اور مشائخ سے خالی ہو گئی تھی جن کو پروقار اور صاحب جلال سمجھا جاتا تھا۔ اکبر اب خود کو بالکل آزاد سمجھتا تھا

چنانچہ اسلام کورد کرتا تھا اور نئے مذہبی قواعد بروئے کار لایا تھا جو لغو اور بے سرو پا تھے مگر بادشاہ ان ہی کو صحیح عقائد قرار دیتا تھا۔ پہلا حکم جس کا اجراء کیا گیا تھا یہ تھا کہ ہر سکّہ پر الف کندہ کیا جائے یعنی 1000 اور تاریخ الف کی ابتدا رسولؐ کے وصال سے کی جائے (یعنی جس طرح کہ عیسوی سال بعد وفاتِ مسیح سے شروع ہوتا ہے)۔(11)

اس طرح بدایونی یہ واضح کرتا ہے کہ سلطنت کے لئے ڈھالے جانے والے تمام سکّوں پر الف یعنی 1000 کی تاریخ کا لکھا ہونا ضروری ہے جس کے لئے کام اصل متعین تاریخ سے دس برس پہلے شروع کر دیا گیا تھا۔ اس حکم کا نفاذ ہو گیا تھا اور فہرست نمبر 1 اور 2 کی فہرست میں موجود تمام سکّہ ساز مراکز میں 990ھ نئے سکّوں کے ڈھالے جانے کا کام شروع ہو گیا تھا۔ خاکہ 1 اور 2 کے ان سکّوں پر یکساں تاریخ تھی۔ بدایونی نے اگرچہ یہ نہیں بتایا ہے لیکن سکّہ ساز مرکز کے پرانے ناموں کی جگہ ایک نیا نام متعارف ہو گیا تھا اور یہ نام تھا اردوظفر قرائین۔ جب الف سال (1000) قریب آ گیا تھا تو سابقہ نظام کو الٹ دینے کا فیصلہ ہوا تھا اور بجائے ہجری سال کے الٰہی سال استعمال ہونے لگا تھا۔(12) اس لئے زیر سوال تمام سکّہ ساز مراکز نے 1580ء کے دوران مستقل کام کیا ہوگا البتہ سکّوں پر ان کے متعین نام نہیں لکھے گئے ہوں گے۔ ان اقدامات کا اثر چونکہ صرف سونے اور چاندی کے سکّہ ساز مراکز پر مرتب ہوا تھا تانبے کے سکّے ڈھالنے والے مراکز پہلے کی طرح اپنا کام کرتے رہے تھے۔

ہم اپنے اس حل سے جیسا کہ توقع کریں گے ہمارے خاکوں میں اردوظفر قرائین کے سکّے 1000ھ کے تحت رکھے جائیں گے۔ ان کی تعداد بھی دوسری دھاتوں کے سکّوں کے مقابلے میں جانے والی اور آنے والی دہائیوں کے دوران دوسرے سکہ ساز مراکز کی پیداوار کی نسبت سے بہت زیادہ تھی۔ اسی طرح سکّہ ساز مراکز کے بغیر ڈھالے جانے والے سکّوں کے معاملے میں جن کا عرصہ 999ھ میں 19 سے 1000ھ میں 65 تک تھا ڈرامائی حد تک تیزی تھی (خاکہ نمبر 2)۔ اس کا یقیناً یہ مطلب ہوا کہ بعض سکّہ ساز مراکز میں 99-990ھ کے دوران ڈھالے جانے والے سکّوں پر اردوظفر قرائین کا نام بھی نہیں دیا گیا تھا۔ یہ اقدام کیوں کیا گیا تھا۔ سکّوں پر الف کا ہونا یقیناً کچھ نظریاتی افادیت ہی ہوگی لیکن پھر سکّہ ساز مرکز کے نام کو کیوں ہٹایا گیا تھا؟ اس کا ایک حل تو مونسریٹ کے اس بیان سے ممکن ہوگا جس کا ماخذ

1580-82ء کے دوران اس کا اپنا مشاہدہ ہے۔ اس نے کنٹرول کے ایک شاہی نظام کا ذکر کیا ہے جو اکبر نے کرنسی کا تبادلہ کرنے والے (صرّاف) بیوپاریوں پر نافذ کیا تھا اور ان کو پابند کیا تھا کہ وہ بادشاہ ہی کے بتائے ہوئے قواعد وضوابط پر عمل کریں۔(13) کرنسی کے تبادلے کے بیوپار کو چلانے کے لئے ایک طریقہ تو یہ ہوسکتا تھا کہ تبادلہ کرنے والے بیوپاریوں کو لیوی کے چھوٹ اور خاص سکّہ ساز مراکز اور سالوں کے سکّوں پر پریمیم کی اجازت نہ دی جائے۔(14) اکبر نے سوچا ہوگا کہ ایسا زیادہ بہتر طریقے سے سکے ڈھالنے کے ایک نظام کے تناظر میں کیا جا سکتا ہے کہ سکہ ساز مراکز کی پہچان کے نشان پر پابندی لگادی جائے اور سالوں کے فرق کو ہٹادیا جائے (یعنی تمام سکّے الف سکّے ہوں)۔(15)

اس پر بھی توجہ کی ضرورت ہے کہ ٹوڈرمَل کی اوریجنل یادداشت جو 27 الٰہی سال/ 1582ء سے تعلق رکھتی ہے سکّہ ساز مراکز کے حکام کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ نئے ڈھالے جانے والے سکّوں کو خزانے میں واپس جمع کروادیں جن کا سابق سالوں کے سکّوں کے ساتھ تبادلہ ہوسکے۔(سابق سالوں کے سکّے = سکّہ سنواتِ گزشتہ) جو بطور ریاستی بقایا کے خزانے کو ادا کئے جاتے تھے۔ یہ ادائیگی مقامی محصولات اور خزانے کے حکام (کروڑی اور فوتادار) جیسی ایجنسیوں کے ذریعہ کی جاتی تھیں اور روپیہ کا تبادلہ کرنے والے صرافوں کے ذریعہ کی جاتی تھیں۔ جو وزن قیمت اور صفائی کے قواعد کے مطابق ہوتی تھیں۔(16) ان کے لئے احکامات کو بار بار دہرایا جاتا تھا تاکہ صراف ان کی تعمیل کریں۔ ان میں ان کو تنبیہ بھی کی جاتی تھی کہ وہ احکامات سے روگردانی نہ کریں۔(17)

باوجود ان احکامات کے یہ دکھائی دیتا ہے کہ روپیہ کے لین دین کا نظام متوقع نتائج دینے میں ناکام رہا تھا اور اکبری جلوس کے 39 ویں برس یہ انکشاف ہوا تھا کہ خالصہ محصولات کے حکام (عمل گزار)، دیئے جانے والے کام کے ذمہ دار (تویلدار) اور روپیہ کا تبادلہ کرنے والے (صراف) خالص سکّوں (سکّہ خالص) جبکہ لیوی چھوٹ پورے وزن اور صاف سکّوں پر بھی (نقد درست ایاز تمام وزن) کی مانگ کرتے تھے۔ جب ایک حاکم خواجہ شمس الدین کا تقرر کیا گیا تھا۔ اور اسے یہی کام سونپا گیا تھا تو اس نے دو مہینے تک سخت محنت کے بعد صورت حالات کو ظاہری طور پر ٹھیک کرلیا تھا اور خلاف ورزی کرنے والوں (خیانتِ پیشہ گان) کو دیوار

سے لگا دیا گیا تھا۔(18)

خاکہ نمبر 2 میں بعض سالوں کے حوالے سے دہلی اور لاہور کے سکّہ ساز مراکز کے صحیح سالوں اور سکّہ ساز مراکز کے ناموں کے ساتھ ڈھالے جانے والے چاندی کے سکّوں کی وضاحت ان رعائتوں کے تناظر میں کی جا سکتی ہے جو ان مراکز کو نارمل سکّوں کے ڈھالنے کے لئے دی گئی تھیں خواہ جزوی طور پر ہو یا مکمل طور پر۔ ان کی وجہ سراسر مالیاتی معاملات تھے۔ دو شہر (دہلی اور لاہور) وسط ایشیا اور ایران سے بڑی تعداد میں گھوڑے درآمد کرتے تھے چنانچہ درآمدی علاقے سے چاندی کے سکّوں کی بڑی مقدار باہر جاتی تھی۔ (ایک تخمینے کے مطابق سالانہ 28 اعشاریہ 4 لاکھ روپیہ)۔(19) ہو سکتا ہے کہ اس لین دین سے متعلق بیوپاری الف یا بغیر سکّہ ساز مراکز والے سکّوں کے مقابلے میں زیادہ رائج، مقبول اور جانے مانے جانے والے سکّوں کو ترجیح دیتے ہوں۔ اس طرح احمد آباد منٹ کے حوالے سے وضاحت جسے اس اول الذکر عمل سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا اس کی وجہ احمد آباد کے مرکز کی زیادہ نمایاں حیثیت ہو جو سونے چاندی کی اینٹوں کا پورب کی طرف سے بڑا وصول کرنے والا مرکز تھا۔ اس کا روپیہ کے تبادلے بیوپار بہت منظّم تھا۔ محمدیوں کے بہاؤ اور روپیہ کا تبادلہ سورت کی منڈی کی شرح سے مطابقت رکھتا تھا۔ یہ وضاحتیں بہرحال ابتدائی نوعیت کی ہیں۔ اس قسم کے بہت سے سوالوں کو حل کرنے کے لئے اب بھی ان علاقوں کے کرنسی نظام کے تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

1- پی۔ایل۔گپتا۔ دی گولڈ موہرس آف اکبر، انڈین نیومس میٹک کرانیکل۔ جلد IV حصہ (II) سال 66-1965ء ص 158-157۔ عرفان حبیب۔ دی اکنامک اینڈ سوشل سیٹنگ جو میکائیل برانڈ اور گلن۔ڈی۔لوری ایڈیشن میں شامل ہے۔ ''فتح پور سیکری، مارگ پبلی کیشنز ممبئی 1987ء ص 79۔ جان۔ایس۔دےیل۔ دی ڈویلپمنٹ آف اکبرس کرنسی سسٹم اینڈ مونیٹری انٹرگریشن آف دی کانکرڈ کنگڈمس جو جے۔ایف۔رچرڈس ایڈیشن میں شامل ہے۔'' دی امپیریل مونیٹری سسٹم آف مغل انڈیا۔دہلی 1987ء ص 35-33

2- جون۔ایس۔دےیل۔ص 34-33

3- ایضاً۔ص 34 دےیل نے ص 35 متبادل وضاحت بھی پیش کی ہے جیسے کہ کڑوری تجربے کو ختم کرنے کے بعد روپیہ کی مانگ کا گراؤ یا 78-1577ء میں منٹ کی تنظیم نو میں ناکامی اور انتظامی بدعنوانی۔

4- پی۔ایل۔گپتا، ایضاً۔دےیل ایضاً۔اپنڈکس 6،5۔ گپتا کے موقف پر تنقید کے لئے ''دی کو تسچین آف منٹ نیم اردو اینڈ کلوزنگ آف دی منٹس ص 62-61

5- ایس۔لین۔پول، دی کوائینز۔آف دی مغل ایمپرس آف ہندستان ان برٹش میوزیم لندن 1892ء۔ایچ۔نیلسن رائیٹ، کیٹالاگ آف دی کوائینز ان دی انڈین میوزیم۔ کولکتا۔جلد (II) حصہ III۔ مغل ایمپرس آف انڈیا۔آکسفورڈ 1908ء۔سی۔جے براؤن، کیٹالاگ آف کوائینز ان دی پراونشل میوزیم لکھنو۔کوائینز آف دی مغل ایمپرس۔دو جلدیں۔آکسفورڈ 1920ء۔سی۔آر۔سنگھائی۔سپلیمنٹری کیٹالاگ آف مغل کوائینز ان دی اسٹیٹ میوزیم لکھنو۔لکھنو 1965ء۔آر۔بی۔وہایٹ ہیڈ۔کیٹلاگ

آف کوائنیز ان دی پنجاب میوزیم۔ لاہور۔ جلد II۔ کوائنیز آف دی مغل ایمپرس۔
آکسفورڈ 1934ء۔ ایم۔ کے۔ جین۔ کیٹلاگ آف کوائنیز آف دی مغل ایمپرس۔ ممبئ
1968ء۔ وی۔ پی۔ روڈ۔ کیٹلاگ آف کوائنیز ان دی سینٹرل میوزیم ناگپور، حصہ اول
ممبئ 1969ء۔ آر۔ بی۔ وہائیٹ ہیڈ، کیٹلاگ آف کوائنیز۔ السٹریٹیو آف دی ہسٹری
آف دی رولرز آف دہلی اپ ٹو 1858ء۔ دہلی میوزیم، دہلی 1990ء

6- میں پروفیسر شیریں موسوی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اتر پردیش ٹرمینر ز سے جمع کی گئی معلومات سے استفادہ کرنے کی اجازت دی تھی۔

7- لاہور منٹ نے 36 الٰہی، 999ھ/ 1591-1590ء میں دوبارہ کام شروع کر دیا تھا۔ دیکھئے خاکہ نمبر (1)

8- اجمیر میں چاندی کے سکوں کو ڈھالنے کا کام اکبر کے بعد شروع کیا گیا تھا لیکن کم سے کم نارووال منٹ کے 970ھ کے پانچ سکے شائع کئے گئے ہیں۔

9- اس کے لئے دیکھئے جان۔ ایس۔ ڈے ایل، نیومس میٹک میتھڈولوجی ان دی ایسٹی میشن آف مغل کرنسی آوٹ پٹ۔ آئی۔ ای۔ ایس۔ ایچ۔ آر XIII نمبر 3، 1976ء ص 392-375 ای ایس پی ص 395 خاکہ نمبر 1۔ لکھنو کے خزانے سے شائع ہونے والی رپورٹوں میں میوزیم اسی مسئلے سے دوچار نظر آتا ہے۔ مثال کے لئے دیکھئے، اے۔ کے سریواستو۔ کوین ہورڈس آف اتر پردیش۔ جلد 1 لکھنو 1981ء جس میں بھی ایک جیسے سکوں کا شمار نہیں کیا گیا ہے۔

10- بایزید بیات۔ تذکرہ ہمایوں و اکبر۔ ہدایت حسین ایڈیشن۔ ببلیو گرافیکا انڈیکا۔ 1941ء ص 373

11- عبدالقادر بدایونی۔ منتخب التواریخ ولیم لیز ایڈیشن اور احمد علی ببلیو گرافیکا انڈیکا۔ کولکتا۔ 3 جلدیں 69-1864ء جلد II ص 301۔ یہ اطلاع سکہ دانوں سے چھپی ہوئی نہیں تھی اور اسے ایک دوسرے مسئلے کے ثبوت کے لئے استعمال بھی کیا گیا تھا۔ یو۔ ایس۔ راؤ۔ آن۔ الف۔ کوائنیز آف اکبر۔ جرنل آف نیومس میٹک سوسائٹی آف انڈیا جلد XXV۔ 1963ء ص 249 اور این

12- الٰہی سال 992ھ/85-1584ء میں متعارف کرایا گیا تھا۔ ایچ۔ ایس۔ ہودی والا۔ ہسٹاریکل اسٹڈیز اِن مغل نیومِس میٹکس۔ ممبئی 1976ء ص 14۔ لیکن الٰہی سکّے 1000ھ سے پہلے جاری نہیں ہوئے تھے۔ سوائے لاہور منٹ کے جہاں سے یہ کچھ پہلے جاری ہو گئے تھے۔

13- دی کامینٹری آف فادر مونسریٹ۔ ایس۔ جے۔ آن ہز جرنی ٹو دی کورٹ آف اکبر 91-1590ء ترجمہ جے۔ ایس۔ ہوائے لینڈ اور ایس۔ این۔ بنرجی۔ لندن 1922ء ص 207۔

14- دیکھئے عرفان حبیب۔ دی کرنسی سسٹم آف دی مغل ایمپائر 1707-1556ء۔ میڈیول انڈیا کواٹرلی۔ IV 1971ء ص 6-4۔ پریمیم اور چھوٹ کے نظام پر ماخذ وحوالوں کی بڑی تعداد حاشیے کے نوٹس میں شامل ہیں۔ میں ان دنوں مغل صرّافوں کے کرنسی بیوپار کے مختلف طریقوں کے مطالعے میں مشغول ہوں۔

15- جان۔ ایس۔ دے یل نے اپنی بحث میں اس قسم کے رجحان کے نظری Theoritical امکان پر بات کی ہے۔

16- ابوالفضل۔ اکبرنامہ۔ برٹش میوزیم۔ اے ڈی ڈی۔ 247 ایف 330 بی۔ ترجمہ شیریں موسوی ریونیو کے انتظام پر ٹوڈرمل کی اوریجنل یادداشت مارچ 1582ء۔ پروسیڈنگز آف دی انڈین ہسٹری کانگریس 49 واں اجلاس دھرواد 1988ء ص 245 ایف ایف

17- ایضاً اکبرنامہ کے نظر ثانی کئے گئے آخری متن میں جلد 3 احمد علی ایڈیشن۔ کولکتا 1887ء ص 383 مجوزہ قواعد کا اختصار ہے مگر شاہی کنٹرول کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

18- ابوالفضل اکبرنامہ جلد III ص 651۔ مزید عرفان حبیب۔ کرنسی سسٹم آف دی مغل ایمپائر 5 این۔

19- شیریں موسوی دی اکنامی آف دی مغل ایمپائر 1595ء۔ اے اسٹیٹیکل اسٹڈی۔ دہلی 1987ء۔ ص 379

❁❁❁❁❁

اکبر کے فرامین کا سفارتی تناظر میں مطالعہ

اقبال حسین

آئین اکبری کے بیان کے مطابق اپنے شاہی انتظامی نظام کی تعمیر میں اکبر نے شخصی توجہ دفتر سند پر دی تھی۔ اس مقالے میں اس طریقہ کار کی بحث پر زور دیا گیا ہے جو اکبر کے فرامین کی تیاری اور ان اجراء کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ان میں فرامین کا جو ذخیرہ باقی رہ گیا ہے ان میں زیادہ فرامین زمینوں کے لین دین سے متعلق ہیں۔ ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس طرح مطالعہ مغل شاہی سفارت کی سائنس کو ساخت کرنے کی بنیاد ثابت ہوگا۔ جس کے بارے میں جدید تحریریں خاموش دکھائی دیتی ہیں۔

ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اکبر کی دیوانی اسی روایت پر قائم تھی جو بابر اور ہمایوں چھوڑ گئے تھے چنانچہ ہم مطالعہ بابر کے فرامین سے کریں گے۔

بابر کا فرماں مورخہ 11 اگست 1527 / 13 ذیقعد 933ھ پرگنہ بٹالا(2) کے قاضی ہلال کو سیورغال کی صورت میں دو ہزار تنکہ سیاہ(1) کی ادائیگی کے حکم کا حوالہ دیتا ہے۔(3) ایک اور فرمان میں جو 24 ذیقعد 933ھ/ 22 اگست 1527ء کو جاری ہوا تھا بابر نے سرگھال کی سابق گرانٹ کو بحال کر دیا تھا۔(4) 8-ربیع/ 2 دسمبر 1527ء کو جاری ہونے والا بابری فرمان جس کے مخاطب محمد سلطان بہادر کے دیوان ہیں۔(5) اور حد پور گاؤں(6)، پٹنہ حویلی قصبہ فتح پور سندنی(7) مع آٹھ سو تنکہ سیاہ جمع اور دو سو پچاس بیگھہ زمین مدد معاش کی مد میں الہ داد

کے بیٹے قاضی دائم (8) کو دیئے جانے کی تصدیق کرتا ہے۔ یہاں سیورغال (یا سیورغال) کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی ہے۔(9)

بابر کے فرامین (یا فرمانوں) کی قابل ذکر خصوصیات ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اکبر کے فرمانوں میں بھی جاری رہی تھیں خصوصاً جو اقتدار پر فائز ہونے کے ابتدائی برسوں کے تھے۔ مثلاً بابر کے فرمانوں میں اوپر ''ھوالغنی'' کی سطر تحریر ہوتی تھی۔اس کے نیچے طغرے میں ''فرمان ظہیرالدین محمد بابر پادشاہ غازی'' لکھا جاتا تھا۔طغرے کے نیچے ایک گول مہر ہوتی تھی جس کے دو دائرے ہوتے تھے۔اندرونی دائرے میں جلی حروف میں پورا نام ظہیرالدین بابر تحریر ہوتا تھا۔(10) اندرونی دائرے میں عمر شیخ سے لے کر امیر تیمور تک بابر کے آباء واجداد کے نام ہوتے تھے۔ ہمایوں نے اپنے فرمانوں میں ''ھوالغنی'' تحریر کرنے پر زور نہیں دیا تھا۔اس کے فرمان مورخہ 27- ذیقعد 960ھ/ 4 نومبر 1533ء سرنامہ ''اللہ اکبر'' ہے۔(11) اکبر نے بعد کے زمانے میں اسی سرنامے کو استعمال کیا تھا۔

مومن نے کسی قدر تعجب کے ساتھ لکھا ہے کہ مغل اداروں کے بارے میں ہمارے مرکزی ماخذ آئین اکبری میں میر منشی یا اسٹیٹ سکریٹری کے ماتحت دیوانی کی کارکردگی کا نمایاں صورت میں کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔(12) آئین بہرحال اس کی شہادت پیش کرتا ہے کہ دو بہت منظم محکمے تھے جو باہم مل کر دارالانشاء کا کام انجام دیتے تھے۔آئین کے مطابق ظلِ الٰہی نے چودہ چاق و چوبند، تجربے کار اور غیر جانبدار کلرک (یا منشی) مقرر کئے تھے۔ان میں سے دو روزانہ یکے بعد دیگرے فرائض انجام دیتے تھے۔آئین مزید ان فرائض کا بھی ذکر کرتا ہے جو یہ لوگ انجام دیتے تھے۔ان میں ظلِ الٰہی کے احکامات اور اقدامات کا لکھنا بھی شامل تھا۔ محکموں کے نگراں جو کچھ بھی رپورٹ کرتے تھے یہ لوگ اسے تحریر کرتے تھے۔جیسے کہ مناصب پر تقرری، فوجوں کے دستے، جاگیریں اور سیورغال (زمینوں کا عطا کیا جانا)۔اس قسم کے روزنامچے جب ظلِ الٰہی کے ملازموں میں سے کوئی ایک صحیح کر لیتا تھا تو اسے بادشاہ کے حضور پیش کیا جاتا تھا اور بادشاہ اس کی منظوری دیتا تھا۔اس کے بعد منشی (کلرک) ہر ہر رپورٹ کی ایک ایک نقل تیار کرتا تھا، اس پر دستخط کرتا تھا اور پھر ان لوگوں کو مہیا کرتا تھا جو اسے بطور رسید رکھنا چاہتے تھے۔ان رپورٹوں پر پروانچی، میر عارض اور وہ شخص بھی دستخط کرتے تھے جو اسے

بادشاہ کے حضور پیش کرتا تھا۔اس قسم کی رپورٹوں کو یادداشتی (میمورنڈم) کہا جاتا تھا۔نقل کرنے کے لئے بہت سے نقلچی یا کاتب مقرر ہوتے تھے جن کا خط تحریر خوبصورت ہوتا تھا۔مثلاً اسناد کے لئے آئین کے دوسرے باب میں حوالہ ملتا ہے ایک باقاعدہ طریقہ تھا جس کے ایک ایک دفتر قائم تھا۔آئین کے مطابق خود ظلِ الٰہی نے اس دفتر سے اچھی طرح واقفیت حاصل کی تھی اور اسے بہتر سے بہتر کارکردگی کے حوالے سے منظم کیا تھا۔بادشاہ نے ایماندار اور تجربہ کار محرر مقرر کئے تھے اور اپنے براہ راست کنٹرول میں دفترداری کے لئے غیر جانبدار حکام کو ذمہ داری سونپی تھی۔(13) آئین سے یہ اقتباسات اس بات کو سند دینے کے لئے دیئے گئے ہیں کہ روایتی دارالانشاء کے حصہ دار دو محکمے تھے جن میں سے ایک محکمہ کی نگرانی بادشاہ خود کرتا تھا۔

آئین میں فرامین کی دو قسموں کا ذکر ہوا ہے اول فرمان ثباتی اور دوم فرمان بیاضی۔(14) فرمان ثباتی خاص طور پر منصب داروں، وکیل کے دفتر اور سپہ سالار و گورنروں کے لئے جاری کئے جاتے تھے۔بغیر پہلے نشان زدگی ہوئی اور بغیر بیانیہ اندراجوں ''بے داغ و محالی'' جاگیروں کی عطا کے لئے فرمان فیاضی کا اجراء کیا تھا۔(15) نئے کسی مقبوضہ علاقے کو تحویل میں لئے جانے اور سیورغال کے تعین کے لئے بھی فرمان بیاضی کا اجراء ہوتا تھا۔(16) فرمان بیاضی قسم کی بہت دستاویزات زندہ رہیں جن میں سے بہتوں کو طبع بھی کیا گیا ہے۔(17) بہت سے اب بھی غیر مطبوعہ صورت میں محفوظ ہیں جو یا تو افراد کے پاس ہیں یا لائبریریوں میں موجود ہیں۔(18)

معیاری اور اعلیٰ قسم کے فرامین خوبصورت نستعلیق خط میں لکھے جاتے تھے۔ان اجراء کا جو موضوع یا مسئلہ ہوتا تھا اس کی ضروری تفصیلات بھی لکھی جاتی تھیں۔جس تاریخ کو بادشاہ ان کو صحیح سمجھ کر منظوری دیتا تھا۔وہ تاریخ بھی درج کی جاتی تھی۔لکھنے والے حکام کے ناموں، دوسری تفصیلات جو اوپری حصے کے نیچے ہوتی تھیں، حکام کے الگ الگ تبصرے بھی لکھے جاتے تھے اور فرمان پر مہر ثبت کی جاتی تھی۔ابتدائی کلمات کے برعکس جو سرنامے پر درج کئے جاتے تھے باقی متن خط شکستہ میں لکھا جاتا تھا۔اکبر کے زمانے میں فرامین تیار کرنے کی یہ ہیئت پوری طرح مستحکم ہوگئی تھی۔ابتدائی زمانے کے اکبری فرامین بہت عمدہ اسلوب میں نیم شکستہ یا رقا اور نیم نستعلیق خط میں لکھے جاتے تھے۔ان میں خط شکستہ کی بہت سی قسموں کو استعمال میں لایا جاتا

تھا۔اصل میں رقا خط اکبری فرامین کے خاص متون کے لئے اس کے زمانہ اقتدار کے اواخر استعمال ہوتا رہا تھا۔(19) نستعلیق اکبر کی اپنی زیر نگرانی بطور ایک متبادل قسم کے متعارف کیا گیا تھا۔(20) جہانگیر کے زمانہ اقتدار میں فرامین کے سرنامے لکھنے کے لئے خط رقا کا استعمال ختم کر دیا گیا تھا۔اکبر کے زمانہ اقتدار کا ہر فرمان ایک اسم الٰہی۔۔۔۔ سے شروع ہوتا تھا۔ عثمانی خلفاء بھی جو دستاویزات جاری کرتے تھے ان میں بھی کوئی نہ کوئی اسم الٰہی جیسے ''لا''۔ ''ھوا''۔''ھوالمعین'' اور دوسرے لکھا جاتا تھا۔(21) صفوی بادشاہوں کے ابتدائی زمانے کے فرمانوں میں جو سیورغال کی عطا کے بارے میں ہوتے تھے اسم الٰہی ''ھواللہ سبحانہٗ'' سے شروع ہوتے تھے جس کے فوراً بعد ''یا علیؑ'' لکھا جاتا تھا۔زمانہ اکبر کے ابتدائی فرامین میں ہمیں دکھائی دیتا ہے کہ بابر کے فرامین کی طرح اسم الٰہی ''ھوالغنی'' لکھا جاتا تھا۔(23) لیکن بعد کے فرامین میں ''ھوالغنی'' کے بجائے ''اللہ اکبر'' استعمال ہونے لگا تھا۔ بدایونی کے بقول 983ھ/1575-1576ء میں شاہی مہروں اور سکوں کے ڈھالنے کے سانچوں میں ''اللہ اکبر'' کندہ کرانے کے لئے اکبر نے عوام کی رائے طلب کی تھی۔اکثریت نے جو موجود تھی بادشاہ کی تجویز سے اتفاق کیا تھا مگر حاجی ابراہیم نے اس موقف کا اظہار کیا تھا کہ اس سے کنفیوژن پیدا ہوگا۔اس کی جگہ اس نے لاذکراللہ اکبر کے استعمال کا مشورہ دیا تھا لیکن اس مشورے پر بادشاہ نے سخت ردعمل کا اظہار کیا تھا۔(24) بدایونی کے بقول شاہی تحریروں اور سرکاری دستاویزات کے سرنامہ کے عنوان پر اسم الٰہی ''اللہ اکبر'' کا استعمال 1584ء سے شروع ہوا تھا۔(25) اور اصل میں اسی سال سے یہ ہونے لگا تھا کہ اکبر کے اب تک دستیاب فرامین میں یہی اسم الٰہی لکھا جاتا تھا۔(26) ابوالقاسم کا کہنا ہے کہ اسم الٰہی ''اللہ اکبر'' کا فقرہ اختصار کی خاطر اختیار کیا گیا تھا۔(27) اسم الٰہی کے ''ھوالغنی'' کو بدل کر ''اللہ اکبر'' کرنے پر جس شک کا اظہار کیا گیا تھا اور جس کو مومن نے اچھالا تھا۔(28) اس کا سمجھنا اس لئے بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ ہمایوں کے ایک فرمان میں بھی یہی اسم الٰہی موجود ہے۔(29)

اسم الٰہی کے بالکل نیچے اہتمام کے ساتھ فرمان جلال الدین محمد اکبر پادشاہ غازی تحریر ہوتا تھا۔(30) اس طغریٰ کے انداز میں قلمبند کیا جاتا تھا اور اس کی صورت بابر کے فرامین سے مطابقت رکھتی تھی۔(31) اکبر کے فرامین میں طغری اتنا خوبصورت نہیں ہے جبکہ اس کے پیش

روؤں کے فرامین کے طغرے زیادہ خوبصورت تھے۔ اکبر کے بعض آخری زمانے کے فرامین میں نام سے لفظ محمد کو ہٹا دیا گیا تھا مثلاً 41 الٰہی، 1596-1595ء کا فرمان جو ایک برہمن کے نام جو پرگنہ پٹھان کوٹ کا ساکن تھا جاری کیا گیا تھا۔(32) لیکن جو فرمان 43 الٰہی 1598ء کو ورنداون کے مندروں کے لئے جاری کیا گیا تھا اس میں لفظ محمد تھا۔(33)

ابتدائی زمانے کے اکبری فرمانوں میں ہمیں مربع نما شجرفی مہر نہیں ملتی ہے جو کہ اس کے جانشینوں کے فرامین میں نمایاں حیثیت سے موجود ہوتا تھا۔(34) یہ بات عام طور پر جانی جاتی تھی کہ بیضوی صورت کی مہریں قدیم سے مروج چلی آ رہی تھیں۔(35) بابر کے فرامین پر بھی جو سیورغال کی عطا کے لئے جاری کئے جاتے تھے بڑی گول مہر ہوتی تھی۔ اندرونی دائرے میں بادشاہ کا نام اس کے القاب سمیت ہوتا تھا جبکہ باہری دائرے میں امیر تیمور تک تمام آباء و اجداد کے نام لکھے ہوتے تھے۔ اس قسم کی مہریں اکبر کے فرامین پر بھی ثبت کی جاتی تھیں اور اسی طرح اندرونی اور باہری دائروں میں نام ہوتے تھے۔ جو ہمایوں پر تمام ہوتے تھے۔ بعد میں اس مہر کو مزید بہتر بنا کر جسامت کم کردی گئی تھی۔ لکھائی کے خط کو بھی رقا سے بدل کر نستعلیق کر دیا گیا تھا۔(36) ہم اکبر کے فرامین کی اس مہر کی تاریخ پیداوار بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ابوالفضل نے یہ بتایا ہے کہ اکبر کے زمانہ اقتدار کی ابتدا میں ان مہروں کو مولانا مقصود بناتے تھے۔ کچھ وقت بیتنے کے بعد تمکین نے ایک اور گول چھوٹی مہر بنائی تھی جس کو علی احمد نے مزید بہتر بنا دیا تھا۔(37) اس مہر کو ازک کہتے تھے جو فرمان ثباتی پر ثبت کی جاتی تھی۔ بڑی مہر جس پر اکبر کے آباء و اجداد کے نام بھی ہوتے تھے ابتدا میں صرف سفارتی مراسلات پر ثبت ہوتی تھی لیکن بعد میں ہر قسم کی دستاویز کے لئے استعمال ہونے لگی تھی۔(38) اسی لئے اکبر کے فرامین پر جن سیورغال کی سند کی تصدیق کی جاتی تھی۔ دونوں مہریں اوزک اور بڑی استعمال کی جاتی تھیں۔(39) تاہم بڑی مہر کا استعمال عام طور پر کم کیا جاتا تھا۔ اکبر کے بیشتر فرامین میں چھوٹی گول مہر استعمال ہوتی تھی۔ اس کی صورت بدلتی رہتی تھی۔(40) مہروں کے ثبت کرنے کے اصولوں جن کا بیان ابوالفضل نے کیا ہے یہ صورت حال اس سے انحراف کا پتہ دیتی ہے۔ آئین کے مطابق شاہی مہر فرامین کے سب سے اوپر طغری سطروں سے اوپر لگائی جاتی تھی۔(41)

ابوالفضل نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ کس طرح مختلف حکام کی مہروں کو ثبت کیا جاتا تھا۔(42) پہلے وکیل کی مہر اس کے نیچے مشرف دیوان کی مہر اور اس کے کچھ ہی نیچے صدر کی مہر لگائی جاتی تھیں۔ ابوالفضل مزید کہتا ہے کہ جب شیخ عبدالنبی اور سلطان خواجہ صدر کے عہدے پر فائز تھے تو وہ اپنی مہریں وکیل کی مہر کی مخالف سمت میں ثبت کرتے تھے۔(43) مطالعہ کے تحت آنے والے کسی بھی فرمان میں سامنے اوپر کی طرف وزیروں کی مہر ثبت نہیں کی جاتی تھی سوائے بادشاہ کی مہر کے۔ ضمن یا الٹی طرف ہی تمام حکام کی مہریں ہوتی تھیں۔ ان مہروں کی ترتیب ابوالفضل نے بیان کی ہے۔ مثلاً اکبر کے فرمان 983ھ/76-1575ء کی الٹی طرف بائیں کونے پر ایک سرکاری عبارت کے بعد ایک گول مہر ہوتی تھی جو عبدالنبی ابن احمد الحنفی خادم علم حدیث کی ہوتی تھی۔ دائیں کونے پر غیاث الدین علی گشت آصف خان از عنایتِ شہنشاہ والی کی گول مہر ہوتی تھی۔(44) عبدالنبی کی مہر کے بالکل نیچے ایک گول مہر میں یہ عبارت ہوتی تھی ٹوڈرمل بندہ درگاہ رام کی پناہ۔(45) اس کے بعد دو دوسری گول مہریں ہوتی تھیں جو شاہ منصور غلام شاہ اکبر اور بندہ کمترین پرخوتم پن چالنی داس کی ہوتی تھیں۔(46) بندہ شاہی میر بخشی علی متوکل اللہ الملک مستعان۔ یہ تمام مہریں جو دائیں یا بائیں کونوں پر ہوتی تھیں ان کے ساتھ متعلقہ محکموں کے تبصرے یا اندراجات تاریخ کے ساتھ ہوتے تھے۔(47)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اکبری فرامین کی پہلی دو سطریں ہمیشہ آدھی آدھی سطریں ہوتی تھیں۔ ہر ایک سطر کا متن بائیں طرف اوپر کو زیادہ گھٹا ہوا ہوتا تھا۔ بابر کے فرامین میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔(48) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہی اسلوب پہلے ایران میں مروج تھا۔(49) متن کے سرنامے پر دو آدھی آدھی سطروں کا استعمال ایسا نظر آتا ہے کہ اکبر کے راج کے آخری برسوں میں استحقاق تھا لیکن بیرم خاں کے حکم 966ھ/1558ء اور منعم خاں کے حکم مورخہ صفر 974ھ/اگست ستمبر 1566ء پر بھی آدھی سطری تحریر پائی جاتی ہے۔ یہ ان دونوں احکامات میں عبارت یوں ہے۔ یہ فرمانِ جلال الدین محمد اکبر پادشاہ غازی اور سب سے اوپر ہے۔ دونوں ہی حکام کا لقب نہ صرف خانِ خاناں تھا بلکہ وکیل السلطنت یا بادشاہ کے نمائندے یا مختلف اوقات میں ایجنٹ کے دفتر کی سطر بھی ہوتی تھی۔(50) حمیدہ بانو بیگم کے حکم میں دو ابتدائی آدھی سطریں بتاریخ رمضان 989ھ/ستمبر اکتوبر 1581ء میں وضاحت سے

معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقام کس حد تک اعلیٰ تھا اور وہ مادر ملکہ کا اعزاز رکھتی ہے۔(51)

مدد معاش کی عطا کے فرامینکا ابتدائی جملہ جن میں عطا کا حکم یا اس کی تصدیق ہوتی تھی ان کے لئے مختلف قسم کے خطابات استعمال میں آتے تھے جیسے کہ ''در ایں وقت فرمان عالیشان واجب الاطاعت ول اِذان شرف صدور یافت''۔(52) ''در ایں وقت فرمان عالیشان عنایت نشان''۔(53) ''چوں موازی''۔ در ایں وقت حکم فرمودیم۔(54) ''چوں بہ موجب فرمانِ عالیشان''۔(55) ''حکام کرام و دیوانیان وعمال ومتسدّیان''۔(56)

درج بالا چند مثالیں ہیں جو اکبر کے فرامین سے مستعار لی گئی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بابر کے بٹالا وعلی گڑھ کے فرامین میں اسی طرح جملے ہیں'' در ایں وقت فرمان جاہاں موتا واجب الاتباع وغیرہ۔ بابر کا فرمان جو اورینٹل کالج میگزین میں نقل ہوا ہے مکمل طور پر مختلف ابتدائیہ پیش کرتا ہے۔'' امرائے نامدار و وزرائے کفایت شعار و مستدّیان وغیرہ۔ ابتدائیہ میں فرق فرامین کی ماہیت کی بنا پر ہے۔ بابر کے بٹالا اور علی گڑھ کے فرامین مدد معاش کی رقوم کی تازہ عطا کا حوالہ دیتے ہیں جبکہ اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہونے والے فرامین پہلے دی جانے والی آراضی وظیفہ اور موازی کی رقوم کا حوالہ دیتے ہیں۔ (گاؤں۔ زمینیں اور نقد بھتے)۔(57) یہ نظر آتا ہے کہ فرامین کی جو صورت بابر کے فرامین کے لئے متعین کی گئی تھی اکبر کے دفتر نے اسی کو جاری رکھا تھا۔ مودی کے ڈاکومینٹس نمبر 1 اور نمبر 2 جو نئی زمینوں کی گرانٹس کا حوالہ دیتے ہیں ان فقروں سے شروع ہوتے ہیں۔'' در ایں وقت فرمان عالیشان شرف صدور یافت''۔(58)

اکبری فرامین کی آخری کھیپ کا موضوع حکام کے لئے سخت ہدایات پر مشتمل تھے کہ ان کو کیا کرنا چاہئے اور اس کام میں کسی قسم کی سستی یا گڑبڑ نہیں ہونا چاہئے۔ ان فرامین کی ابتدا جملے ''می باید'' سے ہوتی ہے یعنی کہ یہ لازم ہے۔ عموماً اس جملے کا خط وہی ہوتا تھا جو دوسرے جملوں کا تھا لیکن اکثر لفظ ''می'' جلی خط میں لکھا جاتا تھا اور اسے موٹا کر کے واضح کیا جاتا تھا۔ اس کا مقصد یہ نشاندہی کرنا تھا کہ اس جگہ سے قابل تعمیل یا حکم کا حصہ شروع ہوتا ہے۔ مدد معاش کی گرانٹس کے اس حصے کے متن کو زیادہ سے زیادہ معیاری بنانے کی کوشش کی گئی تھی جن میں ان تمام ٹیکسوں کی فہرست بھی شامل ہوتی تھی جن سے متعلقہ فرد کو مستثنٰی قرار دیا گیا ہو۔ یہ بھی ذہن

میں رکھنا چاہئے کہ نشان زد کرنے سے پہلے ان میں کے بعض محصولات جو کہ ہندستان میں ان ناموں سے مستعمل نہیں تھے، ایسا نظر آتا ہے کہ زیر حوالہ نام صفوی روایت سے مستعار لے کر استعمال میں لائے گئے تھے۔

عملاً مدد معاش کے صیغے کے تمام اکبری فرامین میں مستثنیٰ محصولات کے حوالے ہیں جیسے (i) مال و جہات (ii) اخراجات عوارضات جن میں مزید شامل محصولات تونل گھا، دروغ گان، محترفا، محرانا، ضابطانا، جریانہ، صددوئی، قانون گوئی، تکرار زراعت، پیش کش، سواری، جل کر، بان کر، خرج نیشکر، باغات، سلامی، فوجداری، وہ نیم، شکار اور بیگار تھے۔(59) ان محصولات کی صحیح فہرست سازی بہر حال ایک فرمان سے دوسرے فرمان میں بدلتی رہتی تھی۔ان کا مقابلہ جب بابر کے فرامین سے کرتے ہیں تو اکبری فرامین ان مستثنیات کی فہرست خاصی طویل نظر آتی ہے۔بابر کے فرامین میں سے دو میں فہرست صرف مال و جہات تک محدود تھی۔(60) بابر کے ایک تیسرے فرمان میں یہ فہرست سائیر متوجہات، توفیر، عشر، دروغ گان اور شق دارانہ وکل اخراجات وکل تکالیفِ دیوانی ولوازم سلطانی پر مشتمل ہے۔(61)

بدایونی کے بار بار اقتباس کئے جانے والے بیان پر جن کا موضوع آئمہ یا زمینوں کی گرانٹ ہے تبصرہ ضروری ہے۔بدایونی کے بقول 983ھ/1575-1576ء میں اکبر نے حکم جاری کیا کہ پوری سلطنت کے آئمہ کو دیئے جانے والے احکامات جو کڑوڑی حضرات جاری کرتے ہیں اس وقت نہ دیئے جائیں جب تک کہ ان پر صدر کی تصدیق موجود نہ ہو۔ (کڑوڑی سے مراد ہے شاہی محصولات وصولنے والے حکام)۔(62) معروف شیوخ اور علماء کو جو گرانٹس دی جاتی تھیں ان کے بارے میں اکبر خود شخصی طور پر تفتیش کرتا تھا۔ان کو نجی بات چیت کے لئے بادشاہ خود بلاتا تھا اور اگر وہ ان کے کردار اور معیار و صلاحیت کے بارے میں مطمئن ہوتا تھا تب ان کو کچھ زمین عطا کرتا تھا مگر جن کے ساتھ چیلوں کی فوج ہوتی تھی یا جو چمتکار دکھانے والے ہوتے تھے ان کو سزا ملتی تھی (ان کی گرانٹس منسوخ کر دی جاتی تھیں۔) بادشاہ نے فرامین کی تصدیق کا جو عام حکم جاری کیا تھا اس کا سب سے زیادہ نقصان آئمہ کو ہوا تھا۔(63)

بہت سے اکبری فرامین ہمارے پاس ہیں جن میں مدد معاش پانے والوں پر بھی بادشاہ

کے حضور پیش ہونے کی شرط ہے۔ زمینوں کی گرانٹس میں اکثر ردو بدل بھی کیا جاتا تھا۔ اصل مالک کی موت واقع ہو جانے یا اس کے شراکت دار کی موت ہو جانے یا بعد میں پیمائش کے پیمانے کو طناب سن سے بدل کر طناب بانس کر دینے، یا پیمائش کی اکائی گز سکندری سے بدل کر گز الٰہی میں تبدیل کرنے کی بنا پر مجموعی گرانٹس کے میزان میں کمی بھی کر دی جاتی تھی۔(64) ہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اکبر کے 983ھ کے احکامات سے پہلے بھی مدد معاش پانے والوں کو شاہی دربار میں بہ نفس نفیس پیش ہونا پڑتا تھا اور اپنے دعوئے کے ثبوت کے طور پر متعلقہ فرمان کو دکھانا ہوتا تھا۔(65)

ایسا نظر آتا ہے کہ سخت تصدیق کے حکم کی وجہ سے مدد معاش کی گرانٹس سے متعلق اکبری فرامین کو 1567ء تک ایک متعین صورت دے دی گئی تھی۔ فرامین کی پشت (ضمن) پر اصل فرمان کا اختصار قلمبند کیا جاتا تھا جس کو وکیل، میر بخشی اور صدر کے دفتر والے لکھتے تھے اور ان کے اندراجات کی تصدیق کے لئے ہر حاکم کی مہر ثبت کی جاتی تھی۔ ہر فرمان کی نقل دفتر خاص میں محفوظ کر لی جاتی تھی۔ کسی متعلقہ فرد کا اصل فرمان اگر کھو جائے تو وہ دفتر خاص سے اس کی نقل حاصل کرنے کا حق رکھتا تھا جیسا کہ نومبر 1567ء کے کوٹا فرمان سے شہادت ملتی ہے۔

فرمان کے سامنے کا متن جہاں ختم ہوتا تھا وہاں تاریخ لکھ دی جاتی تھی۔ لکھنے اور سطروں کے درمیان فاصلے رکھنے کا بھی ایک طریقہ کار متعین تھا اور لکھائی اس طرح کی ہوتی تھی کہ آخری سطر کے بعد کوئی خالی جگہ باقی نہ رہے۔ الٰہی کیلنڈر کے اجراء تک جس کا نفاذ 1584ء میں ہوا تھا تمام اکبری فرامین پر ہجری مہینے اور سال لکھے جایا کرتے تھے۔

ہجری کیلنڈر کے استعمال کے دوران نظر آتا ہے کہ جبکہ زیادہ تر فرامین پر مکمل تاریخ درج ہوتی تھی جیسے تاریخ، مہینہ اور سال کچھ پر صرف مہینہ ہی درج کیا جاتا تھا۔ اس کا آسانی کے ساتھ مطالعہ اس کیلنڈر کے ذریعہ کر سکتے ہیں جس کو ایس۔ اے۔ آئی ترمذی نے مرتب کیا ہے جہاں ڈاکومنٹس نمبر 35 اور 38 جو اکبری فرامین ہیں ان پر صرف مہینہ اور سال کا اندراج ہے۔(66) ایک اور قابل ذکر سوال یہ ہے کہ کیا اکبر نے کبھی جلوس شاہی کا کیلنڈر استعمال کیا تھا جن کے ساتھ ہجری مہینے بھی درج ہوتے ہوں جیسا کہ شاہ جہاں اور اس کے بعد آنے والے مغل بادشاہوں نے کیا تھا۔ دو درندون فرامین کی شہادت مورخہ یکم شعبان تیسرا سالِ

جلوس (عہد آنحضرت) و یکم شعبان سولھواں سال جلوس (جلوسِ مقدسِ ہجری) اہم نہیں ہے کیونکہ ان دونوں کی کوئی تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔(67) دوسرے تمام معلوم فرامین میں صرف دو ہیں (ترمذی۔ ڈاکومینٹس 12 اور 14) جن میں جلوس کے سال کا اندراج ہے۔ ان میں ایک فرمان بطور متولی شیخ حسن کے نام ہے اور اس میں صرف پانچواں جلوس درج ہے۔ اس کے پشت (ضمن) پر شیخ عبدالنبی کا نام و عہدہ لکھا ہوا ہے۔ شیخ عبدالنبی صرف 971ھ/1563-1564ء میں صدر تھے جبکہ اکبر کے پانچویں جلوس کا سال 1560-1561ء سے آگے کا نہیں ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ڈاکومینٹ جعلی ہے یا درج تاریخ پڑھنے میں نہیں آ رہی ہے کیونکہ دو اندراج مٹ گئے ہیں۔ اس سال کو اصل میں 975ھ ہونا چاہئے تھا۔(68) دوسرا فرمان بھی (ترمذی ڈاکومینٹ نمبر 14) بھی مشکوک ہی ہے کیونکہ اس میں بھی صحیح تاریخ غائب ہے اور صرف فقرہ جلوس نظر آتا ہے جو جلوسِ مقدسِ ہجری کے مترادف ہے۔ ہجری کا سالِ جلوس متضاد ہے۔

992ھ/1584ء میں اکبر نے الٰہی کیلنڈر کا نفاذ کیا تھا جس پر 10 مارچ 1556ء کے عہد کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ سال مکمل طور پر شمسی سال تھا۔(69) لیکن اسے واقعی 29 ویں الٰہی سال کی ابتدا میں نافذ ہونے کے بعد استعمال کیا گیا ہوگا (21 مارچ 1584ء)۔(70) امکان ہے کہ اس تبدیلی میں چانسیری (دفتر) کے نئے سال میں لانے تک کی وجہ سے مزید وقت لگا ہوگا۔ اکبر کا ایک فرمان 7 جمادی 11-992ھ/6 جون 1584ء بنام فرقہ جین، زمین کے گرانٹ کا ایک فرمان 15 رجب 993ھ/ جولائی 1585ء بہ عنوان گرانٹ اراضی ان سب پر ہجری کیلنڈر کی تاریخیں درج ہیں۔(71) الٰہی کیلنڈر کی ابتداء موجودہ رہ جانے والی دستاویزات کے بہ موجب صادق خان کے نام ایک پروانے 20 آبان 33 الٰہی و 5 ذی الحج 996ھ سے ہوتی ہے۔ اس کے مترادف 11 نومبر 1588ء اور ہجری کی مترادف 27 اکتوبر 1588ء صحیح نہیں ہیں۔(72) دوسری الٰہی تاریخ عبدالرحیم خانِ خاناں کے ایک حکم 9 آذر، 33 الٰہی اور 11 محرم 997ھ میں ہے اور دونوں کا عیسوی مترادف ہے۔ 30 نومبر 1588ء بنتا ہے۔(73) ترمذی کے کیلنڈر میں اکبر کا سب سے پہلا فرمان جو 1585ء کے بعد جاری ہوا تھا اس کا سال اجراء 1592ء ہے۔ اس پر صرف الٰہی تاریخ کا اندراج ہے لیکن بعد کے ایک عام

فرمان جس کی نقل اٹھارہویں صدی کے ڈاکومینٹس کے مجموعے میں شامل ہے جس کے مخاطب کا تعلق بلگرام سے ہے 21 تیر 37 الٰہی اور 2 شوال 1000ء کا اندراج ہے اور دونوں کی عیسوی تاریخ 12 جولائی 1595ء بنتی ہے۔ جو کہ فرمان کے اجراء کی ہے۔(74) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہ طریقہ رائج تھا کہ دونوں قسم کی تاریخیں اور سال استعمال ہوتے تھے یعنی بعض فرامین میں الٰہی مع ہجری کے۔

بعد میں بتدریج اکبری فرامین میں ہجری ماہ و سال کو ہٹایا جانے لگا تھا اور ان کے استعمال کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا تھا۔ 1592ء کے کیلنڈر کے بعد کے تقریباً سولہ فرامین میں صرف تین میں ہجری ماہ و سال کا اندراج ملتا ہے جس کے ساتھ الٰہی تاریخ ہیں۔ صرف ایک ہی ایسا فرمان ہے جس پر ہجری ماہ و سال کا اندراج ہے۔(75) وندرون کے مندروں اور متھرا کو زمینوں کے گرانٹس کے سلسلے میں جو فرامین دیئے گئے تھے اور جن کی تاریخ اجراء 19 شہریوار 43 الٰہی، 11 ستمبر 1598ء ہے اور جن کے پشت (ضمن) پر ان کی تفصیلات اور مختلف مرحلوں کی تاریخیں درج ہیں ان سے معلوم ہوگا کہ اس وقت تک مغل چانسیری (دفتر) نے مکمل طور پر الٰہی کیلنڈر کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ ان میں ہجری تاریخوں کا کوئی اندراج نہیں ہے۔(76)

حوالہ جات

1- پانچ نہیں جیسا کہ ایم۔مومن نے پڑھا ہے۔چانسلری اینڈ پرشین اپسٹولوگرافی انڈر دی مغلس کولکتا 1971ء ص 76۔ اصل فرمان کا متن انڈیا آفس میں ہے۔ آئی۔او۔4438(1)۔تنکہ سیاہ تانبے کا سکہ تھا جس کو تنکہ دہلی بھی کہا جاتا تھا یا تنکہ مرادی بھی۔عرفان حبیب۔دی ایگریرین سسٹم آف مغل انڈیا۔ممبئی 1963ء ص 381

2- آئین میں سیورغال کو خیراتی گرانٹ کہا گیا ہے جب اس کی ادائیگی نقد کی جائے۔یہ وظیفہ تھا۔اسے زمین کی صورت میں ہو تو ''شیر'' یا مدد معاش کہتے تھے۔جلد 1 ص 278

3- آئی۔او۔4438(1)

4- مغل ڈاکومینٹز 1526-1627ء ص 44

5- غالباً بابر کے ممدوح سلطان حسین مرزا کے پوتے محمد سلطان مرزا

6- ضلع ہردوئی۔تحصیل ہردوئی میں ایک گاؤں۔ڈسٹرکٹ سنس ہردوئی 1971ء ص 118

7- ضلع ہردوئی کی تحصیل بلگرام میں ایک گاؤں۔ڈسٹرکٹ سنس ہردوئی 1971ء ص 118

8- وہ قاضی اللہ داد کا بیٹا تھا جس کو بلگرام میں قضا کا منصب ملا تھا۔غلام حسین فرشواری۔ شرائف عثمانی ایم۔ایس ریسرچ لائبریری، تاریخ میں سی۔اے۔ایس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ص 115 اور 119۔آزاد بلگرامی جنہوں نے قاضی اللہ داد کی سوانح بتائی ہے قاضی دائم کا ذکر نہیں کرتا ہے۔معاصر الکریم (1) آگرہ 1910ء ص 228-227

9- اتفاق سے جولائی اگست 1530ء کا بابری فرمان عاملوں، وزیروں، متشدسوں اور دوسروں کے نام ہے سرکار تا تارخان میں قاضی عبدالحلیم اور اس کے بھائیوں کو گاؤں اور وظیفے کے اجراء کی تصدیق کرتا ہے۔اس کا فرمان نہ تو سرغال اور نہ مدد معاش کی

اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔اورینٹل کالج میگزین۔مئی 1933ء ص 119

10- آئی۔او۔4438(1)،بابر کا فرمان۔مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ

11- اورینٹل کالج میگزین۔مئی 1933ء ص 119

12- چانسلری ص 30

13- ابوالفضل۔آئین اکبری(1) ترجمہ بلوچ مان،کولکتا 1977ء ص 270-268

14- ایضاً ص 274-270۔مومن،چانسلری باب III

15- ایس۔موسوی،جے آر اے ایس 1981ء ص 181-180

16- آئین۔بلوچ مان(1) ص 271-270

17- گوسوامی اور گریوال دی مغلس اینڈ دی جوگیز آف جکھ بار۔جے مودی،دی پارسیز ایٹ دی کورٹ آف اکبر،ممبئی 1930ء کے۔ایم۔جھاویری،امپیریل فرمانس 1805-1577۔ممبئی 1928ء۔اے۔انصاری ایڈمنسٹریٹو ڈاکومینٹس آف مغل انڈیا۔دہلی 1984ء۔عبدالباری مانی،اثانید الرضا دیو۔اجمیر 1952ء

18- مثال کے لئے دیکھئے فرنگی محل اور خیر آباد کی دستاویزات۔ہسٹری میں سی اے ایس۔علی گڑھ۔جے۔ایس۔ماتھر کا ذخیرہ۔بیکانیر آرکیوز۔

19- 40 الٰہی 1595ء کا فرمان جو مودی نے پارسیز ایٹ دی کورٹ آف اکبر میں شامل کیا ہے۔ممبئی 1903ء ص 93

20- 40 الٰہی 96-1595ء کا فرمان جو مغل اینڈ جوگیز آف جکھ بار میں شامل ہے۔ ڈاکومینٹ کی پلیٹ II ص 57

21- ایس۔ایم۔اسٹرن۔ڈاکومینٹس فرام دی اسلامک چانسیریز۔آکسفورڈ 1965ء۔ ص 83-90۔فیروز شاہ بہمنی کا فرمان 1422-1397ء میں بھی اسم الٰہی ''اللہ الحمد'' ہے۔یوسف حسین خاں۔فرامین واسنادِ سلاطین دکن۔حیدرآباد 1963ء۔ص 2-1

22- اسلامک چانسیریز۔ص 180-174

23- بٹالا ڈاکومینٹ۔آئی۔او۔4438(1) اور علی گڑھ فرمان مولانا آزاد لائبریری۔

24- عبدالقادر بدایونی۔منتخب التواریخ لیز اور احمد علی کا ایڈیشن کولکتا جلد(1) ص 210

25- بدایونی۔ایضاً ص338
26- مغل ڈاکومینٹس ص64-13، نمبر 71-70
27- منشاۃ التماکین ایف 3بی جس کا حوالہ ص63 این پر چانسیلری میں ہے۔
28- ایضاً۔
29- اورینٹل کالج میگزین، مئی 1933ء ص120-119۔ جھاویری شاہی فرامین پر ھوالغنی کی تحریر۔ ڈاکومینٹس IV، V، اللہ اکبر کے ساتھ کوئی مستند بات نہیں ہے کیونکہ ان دونوں دستاویزات میں ابتدائی دو آدھی سطریں غائب ہیں اور ان کی لکھت غیر روایتی نستعلیق میں ہے اس لئے عدم صحت واضح ہے۔ بعض اکبری فرامین پر اسم الٰہی ھوالکبر بھی نظر آتا ہے۔ مغل ڈاکومینٹس ص56 اور 59-58
30- دی پارسیز ایٹ دی کورٹ آف اکبر ص94-93 اور 120-119 جھاویری ڈاکومینٹس نمبر IV-II اور IVA۔ فرمان اکبری 5 یکم جمادا 983ھ 12 اگست 1575ء۔ سی۔اے۔ایس ہسٹری میں علی گڑھ۔ مغلس اینڈ جوگیز آف جکھ بار ص56
31- بٹالا ڈاکومینٹس، آئی۔او۔4438(1) اور فرمان علی گڑھ
32- مغلس اینڈ جوگیز آف جکھ بار ص59-57
33- اوریجنل نیشنل آرکیوز آف انڈیا میں ہیں۔
34- دی مغلس اینڈ دی جوگیز آف جکھ بار ص 77-76۔ فرنگی محل ڈاکومینٹ نمبر2۔ سی۔اے۔ایس ان ہسٹری۔علی گڑھ۔
35- تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے چانسیلری ص65-64
36- آئین جلد (1) ص54 میں ہے کہ مہریں ڈھالنے والے مولانا مقصود رقا خط میں اسٹیل کی سطح پر ایک دائرہ کاٹتے تھے۔اس کے بعد انہوں نے نستعلیق خط میں ایک اور مہر بنائی تھی۔ مہروں کے لئے دیکھئے۔ دی مغلس اینڈ دی جوگیز آف جکھ بار ص57۔ جھاویری۔ڈاکومینٹس نمبر II، IV اور IVA۔اسناالاصنادید ص3 اور 5
37- آئین(1) ص54
38- ایضاً۔

39- فرمان مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ نمبر 28۔دی مغلس اینڈ دی جوگیز آف جکھ بار ص57۔دی پارسیز ایٹ دی کورٹ آف اکبر۔ڈاکومینٹ نمبر 1اور 2

40- جھاوری ڈاکومینٹ نمبر II، IV A اسناالالصنادیدص 3 اور 5۔خیر آباد ڈاکومینٹس۔ سی۔اے۔ایس۔اِن ہسٹری۔علی گڑھ نمبر 100

41- آئین ص(1)274

42- آئین (1) ص274-273

43- ایضاً۔ص273

44- اکبری فرمان۔سی اے ایس اِن ہسٹری۔علی گڑھ اولڈ ایم۔ایس۔نمبر 29۔آصف خان کی زندگی کا کاموں کے لئے صمصام الدولہ۔معاصرالامراء(1) ص281-280۔ مزید ایم۔اطہر علی۔دی اپریٹس آف ایمپائر دہلی 1985ء ص6اور 9

45- اکبر کا فرمان سی اے ایس اِن ہسٹری علی گڑھ ایم ایس نمبر 29۔مزید اکبر اینڈ دی ٹیمپلز آف متھرا مصنفہ تارا پد مکرجی اور عرفان حبیب۔پروسیڈنگز آف دی انڈین ہسٹری کانگریس 48(1987ء) سیشن ص248-246

46- اکبر کا فرمان۔سی اے ایس اِن ہسٹری۔علی گڑھ۔ایم۔ایس 29

47- ایضاً۔

48- بٹالا ڈاکومینٹس۔آئی او4438(1)۔بابر کا فرمان مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ

49- شاہ اسمٰعیل کا فرمان مورخہ 25 جون 1508ء جس کو مارٹن نے اسلامک چانسیریز میں نقل کیا ہے۔ایڈیشن ایس۔ایم۔اسٹرن آکسفورڈ 1965ء ص246

50- بیرم خان کے حکم کی اطلاع عرفان حبیب سے مستعار ہے جنہوں نے ڈاکومینٹ کی زیروکس نقل بنوائی تھی۔منعم خاں کے حکم کو اقتدار عالم نے ترجمے کے ساتھ نقل کیا ہے۔ دی پولیٹیکل بایوگرافی آف اے مغل نوبل، منعم خان، خانِ خاناں 1575-1497ء۔ دہلی 1973ء ص97-96

51- جھاوری ڈاکومینٹ نمبر 2

52- اکبری فرمان۔خیر آباد ڈاکومینٹس۔سی۔اے۔ایس اِن ہسٹری۔علی گڑھ

53- دی پارسیز ایٹ دی کورٹ آف اکبر ص 119
54- جھاوریری ڈاکومینٹس نمبر 2 اصنا الاصنادید ص 5
55- دی مغلس اینڈ دی جوگیز آف جکھ بار ص 59
56- اکبری فرمان۔ مولانا آزاد لائبریری نمبر 28
57- اورینٹل کالج میگزین۔ مئی 1933ء ص 119
58- دی پارسیز ایٹ دی کورٹ آف اکبر ص 94-93۔ خیر آباد کے فرمان میں فقرہ ''فرمانِ عالیشان واجب الاطاعت ول اظان استعمال ہوا ہے۔ خیر آباد ڈاکومینٹس سی۔اے۔ ایس اِن ہسٹری۔ علی گڑھ
59- اورینٹل کالج میگزین مئی 1933ء ص 120-119۔ یہ نوٹ کرنا چاہئے کہ (b)، (1)، (X)، اور (XIX) پر جن محصولات کا حوالہ ہے ایران میں صفوی بادشاہوں نے بھی لگائے تھے۔ اسلامک چانسیریز ص 190-189 اور 202-201
60- بٹالا ڈاکومینٹس آئی۔او۔4438(1) اور اورینٹل کالج میگزین مئی 1933ء ص 119
61- بابری فرمان۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ
62- منتخب التواریخ (II) ص 205-204 اور 279-278
63- منتخب التواریخ (II) ص 205-204 اور 279-278
64- تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے ایگریرین سسٹم آف مغل انڈیا۔ ص 366-353
65- اکبری فرامین۔ ایم۔ ایس نمبر 29۔ اور خیر آباد ڈاکومینٹس نمبر 100۔ سی۔اے۔ ایس۔ اِن ہسٹری لائبریری علی گڑھ۔ کوٹا ڈاکومینٹ جو ڈاکٹر عبدالمتین کے پاس ہے۔ طبیہ کالج علی گڑھ۔ الصنا الدّ دصنادید ص 3۔ مغلس اینڈ دی جوگیز آف جکھ بار، ڈاکومینٹس (I) اور (II)۔
66- مغل ڈاکومینٹس ص 55-54
67- ورندون ریسرچ انسٹیٹیوٹ نمبر 2 اور 36۔ ٹی مکرجی اور عرفان حبیب۔ پی آئی ایچ سی۔ 48 ویں بہ مقام گوا ص 235
68- فرمان کے لئے (ترمذی ڈاکومینٹ 12)۔ دیکھئے فرامین سلاطین ص 3-2 اور معین

الاولیاء ص 67-66

69- اکبر نامہ بلیو گرافیکا انڈیکا (II) ص 14-9

70- ایضاً۔(III) ص 431

71- مغل ڈاکومینٹس ص 64-62۔ڈاکومینٹس 68، 70 اور 71

72- بلوچیٹ۔سپلیمنٹ۔پرس 482 ایف 13 بی

73- جھاویری ڈاکومینٹس 111A۔

74- شرائف عثمانی۔سی۔اے۔ایس۔ اِن ہسٹری علی گڑھ ایم۔ایس۔ایف ایف 57 بی 589۔اپنے متن میں فرمان قاضی کمال کو اکبر کے حضور پیش ہونے کے حکم پر دوہری تاریخیں استعمال کی ہیں۔19 آزاد، 36 الٰہی 24 صفر 1000ء دونوں تاریخوں سے 11 دسمبر 1591ء نکلتا ہے۔ترمذی نے اپنے ڈاکومینٹ نمبر 86 اس فرمان کو کیلنڈر کرتے ہوئے الٰہی تاریخ کو بالکل نظرانداز کردیا ہے۔

75- مغل ڈاکومینٹس نمبر 107، 108، 110 اور 117 ص 75-74 اور 77

76- ٹی مکرجی اور عرفان حبیب۔پی۔آئی۔ایچ۔سی 48 واں گوا کا اجلاس ص 240-238۔ الٰہی کے متبادل دی گئی عیسوی تاریخ جس اس مقالے میں ذکر تصحیح کا متقاضی ہے۔اکبر نے جو فرمان نوساری کے کیقباد پارسی کے نام جاری کیا تھا اس میں بھی صرف الٰہی تاریخ درج ہے۔ڈاکومینٹس نمبر 1 اور 2۔دی پارسیز ایٹ دی کورٹ آف اکبر ص 93 اور 119۔

اکبر کی شخصیت، خوبیاں اور دنیا کے بارے میں نقطہ نظر بہ نظر تنقید

اقتدار عالم خان

ہندستان میں مغل اقتدار و اختیار کو مضبوط بنیاد پر مستحکم کرنے میں اکبر کے کردار نے طویل عرصے سے جدید زمانے کے مورخوں کو متوجہ کر رکھا ہے۔ اکبر پر تحقیق کرنے والے بعض محققوں نے ان عناصر کو روشنی میں لانے کی کوشش کی ہے جو اس مذہبی برداشت کی پالیسی کے ابھار کا ستون ہیں۔ اس پالیسی کی بنیاد اصول صلح کل پر قائم تھی۔ ان مطالعات میں اکبر کی مذہبی پالیسی کا تناظر اس کی اشرافیہ کو تبدیل کر کے ایک ملے جلے حکمراں حلقے کو بنانا ہے جس کے دائرے میں کافی تعداد اہل تشیع اور راجپوتوں کو شامل کرنا ہے۔ اکبر کے اپنے دنیاوی نقطہ نظر اور نظریاتی اثرات کی ماہیت پر توقع سے بہت کم توجہ دی گئی ہے جس نے اس کے زمانہ اقتدار کے آخری پچیس برسوں کے دوران اکبر کی مذہبی پالیسی کو ساخت کیا تھا۔ حال ہی میں اس پہلو کا اطہر علی نے اپنے ایک مقالے اکبر اینڈ اسلام میں ازسرنو جائزہ لیا ہے۔ (1) جس نے اکبر کی مذہبی پالیسی کے بنیادی کردار اور محرکات پر بہت سے خصوصی سوال اٹھائے ہیں۔ غالباً سب سے زیادہ مستند سوالات ہیں (i) دنیا کے بارے میں اکبر کے شخصی نقطہ نظر نے اس کی مذہبی پالیسی پر اثرات مرتب کئے تھے اور (ii) اس کے مذہبی نقطہ نظر کے حوالے سے بادشاہ کی رعایا کے مختلف حلقوں کا ردعمل کیا ہوا تھا اور خصوصاً ان اقدامات پر کیا ردعمل ہوا تھا جو اس پالیسی کے نفاذ کے لئے اختیار کئے گئے تھے۔ بدایونی اور جے سوئٹس کے معاصر بیانات کہ آیا اکبر کے

مذہبی خیالات صحیح تھے یا غلط تھے کہ تناظر میں یہ سوالات خصوصی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ 1581ء کے بعد اکبر ترک اسلام کا مرتکب ہو گیا تھا۔ شیخ احمد سرہندی کا دعویٰ غیر مسلموں کے لئے اکبر کے نرم رویئے کا سبب بنیادی طور پر اسلام کے خلاف اس کا ردعمل تھا مذہبی برداشت و رواداری کی اکبری پالیسی کے بہتر جائزے کے لئے اس کے شخصی عقائد کی اہمیت کی نشاندہی اس دعوے سے ہوتی ہے۔(2)

اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ دنیا کے بارے میں اکبر کے نقطہ نظر کے نشوو ارتقا کو 1556ء سے جب وہ تخت نشین ہوا تھا۔ 1605ء تک جب اس کی وفات ہوئی معلوم کر کے یکجا کیا جائے ایسا کرتے ہوئے میں ان دو سوالوں کا بھی مطالعہ کروں گا جو اوپر تلاش کر کے لکھے جا چکے ہیں۔ نئی شہادتوں کو جس حد تک کہ وہ اجازت دیتی ہیں اس مقالے میں پیش کرنے کا منصوبہ میرے کام میں شامل ہے میری یہ بھی رائے ہے کہ بعض معاملات میں اطہر علی نے جو موقف اختیار کیا ہے اس پر بھی از سر نو غور کروں۔

اکبر کے مذہبی برداشت اور رواداری کی طرف جھکاؤ کی نصابی کتابیں اس کی تشریح اس کے والدین، سنّی اور شیعہ استادوں کی وسیع النظری کی تعلیم کے تناظر میں کرتی ہیں۔ ان لوگوں میں راسخ العقیدگی اور کٹر پن نہیں تھا اور یہ خوبیاں بلاشبہ شعور عامہ کو متاثر بھی کرتی ہیں۔ اس کے باوجود ہم یہ کہیں گے کہ بعض نصابی کتابوں کے لکھاریوں کا مفروضہ کہ اکبر کی ماں حمیدہ بانو بیگم شیعہ تھیں قطعی بے بنیاد ہے۔(3) اس کے برعکس اسی کا بھائی معظم بیگ 1546ء میں ہمایوں کے وزیر جو ایک ایرانی شیعہ تھا خواجہ سلطان رشدی کے کٹر پنتھی سنّیوں کے ہاتھوں قتل کے معاملے میں پھنس گیا تھا۔ یہ واقعہ اس کا پختہ ثبوت ہے کہ وہ اس کے خاندان والے اور حمیدہ بانو بیگم سنّی تھے۔(4) اکبر کے اساتذہ جن میں دو ایرانی شیعہ بیرم خاں اور میر عبداللطیف قزوانی اور سنّی تورانی منعم خاں سب ہی فرقہ وارانہ ذہنیت اور مزاج سے بالاتر تھے اور اس حقیقت کی بہر حال تردید بھی نہیں کی جا سکتی ہے۔ ابوالفضل نے اس کے بارے میں کچھ باتیں لکھی ہیں۔ ؍ہ لکھتا ہے کہ میر عبداللطیف قزوانی ہمیشہ ہی فرقہ وارانہ انداز نظر کو سختی کے ساتھ رد کرتا تھا جس کی ؍جہ سے شیعہ اور سنّی کٹر پنتھی حلقے اس سے خفا رہتے تھے اور اس کی مذمت کرتے تھے۔(5) ؍ہاں تک بیرم خاں کا معاملہ ہے اس کے فرقہ وارانہ تعصب پر اٹھارہویں صدی کے بعض ایرانی

مورخوں کا موقف جیسے کہ خافی خاںؔ اور شاہنواز خاںؔ کے برعکس معاصر شہادتیں اسے ایک ایسے فرد کی صورت میں پیش کرتی ہیں جسے ظاہر میں شیعہ وسنّی فرقہ وارانہ تقسیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔(6) دوسری طرف منعم خاں نے اس کے قریبی دوستوں میں علی قلی خاںؔ کو بھی شمار کیا ہے جو اپنے شیعی عقائد کے اظہار کی بنا پر جانا جاتا تھا۔(7) اس لئے یہ خیال کرنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اکبرؔ کے ان ابتدائی مرحلے کے اساتذہ کی دین جس کے سبب اکبر کا فطری جھکاؤ مذہبی برداشت اور صلح کل کی طرف ہوا قابل غور ہے اور اس اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

وہ اثرات وعوامل جنہوں نے اکبر کے ذہن کو ان خیالات کی طرف مائل کیا جو مذہبی برداشت اور صلح کل کا پرچار کرتے تھے ان کے بارے میں کسی بحث کے دوران ہمیں تیموریوں کے ثقافتی نظام کے مزاج کا ابتدا سے ہمایوںؔ کے زمانے تک بھی زیر نظر رکھنا چاہیئے۔ بتایا گیا ہے کہ آل تیمور نے ہر مذہب کا ایک طرح سے احترام کیا تھا۔ مذہبی برداشت اور رواداری کی یہ فضا تیموریوں کی سیاست میں شروع سے لے کر اس وقت تک دائم وقائم اور موثر و پختہ رہی تھی جب اکبر راج گدّی پر براجمان ہوا تھا۔(8) تیموریوں کا ثقافتی نظام غالباً اس قدر موثر تھا کہ یاسائے چنگریزیؔ ہر آنے والے تیموری بادشاہ کے ذہنوں پر غالب رہا تھا اور یہ غلبہ اکبرؔ کے زمانے تک کم نہیں ہوا تھا۔(ابوسعید مرزاؔ کو بر بنائے شک اس سے مستثنٰی رکھا گیا تھا)۔

علاؤالدین عطاؔ جوائینی کے مطابق یاسائے چنگریزیؔ حکمرانوں کو یہ رائے دیتا تھا کہ وہ ہر مذہبی فرقے کو ایک ہی تصور کریں اور ان کے مابین کوئی فرق نہ کریں۔ اس اصول ہی کی تعمیل کا نتیجہ تھا کہ جوآئینی کے لفظوں میں چنگریز خاںؔ نے مذہبی کٹر پنتھیت سے فرار اختیار کیا تھا اور ایک مذہب کو دوسرے مذاہب پر ترجیح دینے سے گریز کرتا تھا۔(9) یاسائے چنگریزی کے اثر کی وجہ سے تیموری سیاست کے اندر مذہبی برداشت وصلح کل کو بڑھاوا ملا تھا۔ تیموری مراکز پر شیعاؤں کو سزا نہ دی جانے کی روایت اس رویئے کو مزید روشن کرتی ہے۔

ایران سے ہمایوں کی ہندستان واپسی (1545ء)(10) کے بعد درباری امراء کے حلقے میں ایرانی شیعاؤں کی بڑھتی ہوئی موجودگی جس نے کسی قابل ذکر شیعہ سنّی تناؤ پیدا نہیں کیا تھا ہندستان کی مغل سلطنت کے صلح کل کے مزاج کی خود بولتی ہوئی دستاویز ہے۔ ہندستان کے مختلف علاقوں سے مغل سلطنت نے جن سابق سلطنتوں کا خاتمہ کیا تھا ان کے مقابلے میں وہ

یقیناً بہت مختلف قسم کی ریاست تھی۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ہمایوں کی ملازمتوں میں ایرانی شیعاؤں کی بڑی تعداد میں شمولیت سے پہلے جن ریاستوں میں مسلمان خاندانوں کی بادشاہتیں قائم تھیں ان میں اس قدر نمایاں طور پر شیعہ اور سنّی امراء ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر ہو کر زندگی نہیں گزارتے تھے۔ ایران کی صفوی سلطنت جہاں کے حکمراں دعویٰ کرتے تھے کہ وہ تمام دنیا کی اسلامی کمیونٹی کے امام ہیں سنّی مذہب کی طرف جھکاؤ رکھنے والوں پر شدید جبر کرتے تھے اور اس قاعدے سے کوئی بچ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے ہم سہولت کے ساتھ یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ یاسائے چنگیزی کے اثرات جس حد تک وسط سولہویں صدی تک تیموری سیاست پر حاوی رہے تھے اکبر کے ثقافتی ورثے میں ان کی مرکزی حیثیت تھی جس نے اس کے انداز نظر میں دوسرے مذاہب کے عقائد کے حوالے سے وسیع النظری پیدا کر دی تھی۔ شیعاؤں اور مہدیوں نے ساٹھ کی دہائی کے زمانے میں جو سخت اختلاف کا رویہ اکبر کے مزاج میں پیدا کر دیا تھا اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس کی وجہ وقت کے بہاؤ کے ساتھ اصل منگول روایت کے دباؤ میں دراڑ پیدا ہونے کا نتیجہ تھی۔

دنیا کے بارے میں اکبر کا نقطہ نظر بتدریج نشو و ارتقا کے راستے گزرا اور 1581ء کے لگ بھگ اس کا حتمی نقطہ نظر بنا جس کی بنا پر صلح کل کے اصول پر اس کا سخت کومٹ منٹ استوار ہوا س کی صحیح طور پر ہمت افزائی کے لئے اس کی شخصیت کی ان خامیوں و خوبیوں کو نظر میں رکھنا ضروری ہے جن کو معاصر مبصّروں نے قلمبند بھی کیا ہے۔

مونسرّیٹ کے مطابق اکبر تنک مزاج تھا جس کی مثال وہ مختلف کھیلوں میں اس کی بہت زیادہ دلچسپی کے حوالے سے پیش کرتا ہے۔(11) ابتدائی برسوں کے دوران شکار اور ہاتھیوں کی لڑائی میں دلچسپی سے پیدا ہونے والی بدمزگی کا ذکر ابوالفضل نے بھی کیا ہے۔ وہ جب شکار کے دوران یا ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتے ہوئے یا بدمست ہاتھیوں کو سیدھا کرنے میں بار بار اپنی زندگی تک کو داؤں پر لگا دیتا تھا تو اس کے بارے میں بتاتے ہوئے ابوالفضل سبکی محسوس کرتا ہے۔ اس نے اکبر نامہ میں ایک پورا باب ہاتھیوں کی طرف اکبر کے جھکاؤ کے لئے وقف کیا ہے۔ ایک اور جگہ 1561ء میں ایک بدمست ہاتھی پر سوار ہونے کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا ذکر کرتے ہوئے ابوالفضل نے اس وقت کے اکبر

کے ایک لچر فقرے کا حوالہ قلمبند کیا ہے جو اس نے جانتے بوجھتے ہوئے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالتے ہوئے کہا تھا ''اگر میں نے خدا کو ناراض کیا ہو تو یہ ہاتھی ہمیں موت کے گھاٹ اتار دے، خدا کی ناراضگی کے ساتھ ہم اپنی زندگی کے بوجھ سے کس طرح عہدہ برا ہو سکتے ہیں۔''(12) اتفاقی طور پر یہ واقعہ اس رویئے کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ اکبر بلا جواز مطمئن نہ ہونے اور سماج میں اپنے ہی کردار کے حوالے سے معذرت خواہ ہونے اور اس زمانے میں مذہبی معاملات بھی کنفیوژ ہونے کی حالت سے دوچار تھا یہ نفسیاتی پہلو ایک اور حوالے سے اکبر کی شخصیت میں ظاہر ہوا تھا۔ 1578ء تک اسے کبھی کبھی اعصابی گراوٗ کے دورے پڑا کرتے تھے۔ بعض وقفوں کے دوران اس پر مایوس، رنج اور اپنے وجود کے بے معنی ہونے کا احساس بھی حاوی ہو جاتا تھا۔ ان کے بارے میں تحریری اطلاع بھی ملتی ہے۔ اکثر یہ حالتیں شکار کرنے کے دوران واقع ہوتی تھیں۔ ان موقعوں پر کچھ دیر تک وہ بے ہوش بھی رہا کرتا تھا۔ ابوالفضل نے اس حالت کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسا لگتا تھا جیسے اکبر موت کے قریب ہو۔(13) ابوالفضل اور خود اکبر نے بھی نفسیاتی دوروں کی ان حالتوں کو روحانی تجربے سے تعبیر کیا۔ یہ صورتِ حال 1578ء تک بار بار واقع ہوتی رہی تھی لیکن اس برس کے بعد جب اکبر نے دنیا کے بارے میں ایک نئے نقطہ نظر پر یقین کر لیا تھا اور صلح کل کے اصول کو پا لیا تھا پھر اس قسم کے دورے پڑنا بھی بالکل بند ہو گئے تھے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے اپنی زندگی کے ابتدائی حصے میں ان نفسیاتی دوروں کا سبب اس کا ذہنی تناؤ تھا۔

ستّر کی دہائی کے دوران اکبر کے مذہبی عقائد کے دوہرے پن اور اس کے فکری کمٹ منٹ بعض پے چیدہ سوالات کے ذریعہ واضح کئے جا سکتے ہیں جو اکبر نے عبادت خانے میں مباحث کے پہلے زمانے کے دوران مسلمان مذہبی خدا پرستوں کے سامنے پیش کئے تھے۔ (1575-1578ء)۔ اس قسم کے دورے پن اور ایسی غیر یقینیت کے دو پہلو تھے اول اکبر کا اپنا مزاج جہاں سوالات جنم لیتے تھے اور دوم ایک تسلیم کئے گئے اخلاقی اور قانونی رویئے کے لائحہ عمل کو مصدقہ صورت دینے کی شدید خواہش۔ اس کی شخصیت کا یہ ایسا رخ بھی تھا جو اس نے اپنے باپ سے ورثے میں حاصل کیا تھا۔ ستّر کی دہائی میں اس نے جو دو سائنسی تجربے کئے تھے اس کے سوال پیدا کرنے اور اٹھانے کے مزاج کی وضاحت کرتے ہیں۔ عارف قندھاری نے

ان تجربوں کے حوالے سے بتایا ہے کہ ایک نر ہرن اور ایک بربری نسل کی بکری کی افزائش نسل میں اسے بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس تجربے کے نتیجے میں ہرن کے بطن سے جو بچہ پیدا ہوا تھا بانجھ ثابت ہوا تھا۔(14) دوسرا تجربہ جس میں چھ جنم لینے والے بچوں کو استعمال کیا گیا تھا اس کا مقصد زبانِ قدرت کو ٹیسٹ کرنا تھا۔ اس منطق کا ماخذ غالباً کلاسیکی یونانیوں کا قیاسی فلسفہ تھا۔ اسلام کی دینیاتی روایت میں یقیناً زبان قدرت کے نظریئے کی کوئی معنوی اہمیت ہی نہیں تھی۔(15) اسی عرصے کے دوران یہ نظر آتا ہے کہ اکبر نے کھلے عام فلسفیانہ مناظروں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا جس کے بعد امام غزالیؒ کی اسلامی دینیات نے شدت کے ساتھ مخالفت کی تھی۔ ابتدائی ستر کی دہائی کے دوران جن حضرات نے یونانی فلسفے کی اسلامی صورت سے اسے متعارف کرایا تھا ان میں شیخ مبارکؒ اور اس کے بیٹے فیضیؒ اور ابوالفضلؒ سرفہرست تھے۔ اپنی ایک کہاوت میں اکبر اعتراف کرتا ہے کہ یہ مناظرے بہت دلاویز اور دلربا تھے اور ان کی طرف سے فرار حاصل کرنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔(16) اکبر کی فلسفے میں بڑھتی ہوئی دلچسپی اور عموماً مذہب کے بارے میں سوالات کے اٹھانے کے نتیجے ہی میں 1578ء کے دوران عبادت خانہ میں اسلامی دینیات اور فقہہ کے اہم مسائل کے ازسرنو جائزے کی روایت شروع ہوئی تھی۔ بدایونیؒ کے بقول شیخ مبارکؒ نے اس سلسلے کو متحرک رکھنے میں اہم کردار ادا کیا تھا خصوصاً جب اس نے امام عادل بہ مقابلہ مجتہد کے بارے میں بحث اٹھائی تھی۔ اس بحث ہی کے نتیجے میں معروف و بااثر علمائے دینیات نے 1579ء میں ایک مظہر پر دستخط کئے تھے جس کی رو سے اکبر کو بادشاہِ اسلام تسلیم کر لیا گیا تھا۔

ضائع نہ کی جانے والی ایک شہادت اور 1581ء میں قلمبند کی جانے والی اکبر کی اپنی کہاوتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ابتدائی زمانے میں اکبر باعمل مسلمان تھا اور ہندوؤں کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کرتا تھا۔ اس زمانے میں جیسا کہ وہ خود معذرت کے ساتھ اعتراف کرتا ہے اس نے بہت سے ہندوؤں کو جبراً اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا تھا۔(17) اس زمانے میں وہ بہت ہی کٹر پنتھی پاکباز مسلمان حضرات کی نگرانی میں تھا جن کا ایمان ہی کفر کے مقابلے میں اسلام کا دفاع کرنا تھا۔ دہلی کے مشہور شیخ زادے رزاق اللہ مشتاقی 1580ء کے دوران لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ خدا نے اسلام کو دبانے کے خلاف اسے بچانے کے لئے اکبر کو بھیجا

تھا۔(18) اپنے ایک سرسری تبصرے میں بدایونی بتاتا ہے کہ اپنے اقتدار کے ابتدائی برسوں کے دوران اکبر نقش بندی سلسلے کے زیر اثر تھا۔(19)

1562ء کے بعد جب اکبر نے بہت سے راجپوت سرداروں کی لڑکیوں اور دوسری رشتہ دار عورتوں سے بیاہ کر لئے تھے۔ یہ نظر آتا ہے ہندو دھرم کی رسومات اور عبادت کے طور طریقوں کے خلاف سابق مذمتی اور سخت گیر رویہ ختم ہوگیا تھا۔ بدایونی کے مطابق اپنی جوانی کے ابتدائی مرحلے میں وہ رسم ہوم میں شرکت کرتا تھا۔ اس میں اپنی ہندو بیویوں کے ساتھ اگنی پوجا کی رسم ادا کرتا تھا جو ہوم کہی جاتی ہے۔(20) اس کے بہت سے معاصرین کا بھی یہ خیال تھا کہ اس زمانے میں وہ ہندو دھرم کی رسومات ادا کرنے میں کوئی قباحت یا کراہت محسوس نہیں کرتا تھا حالانکہ اپنی اسلامی صورت وسیرت پر وہ قائم تھا۔ اس خیال کو مزید تقویت 1563ء میں یاترا ٹیکس اور 1564ء میں جزیہ کی منسوخی یا 1565ء میں وندرون کے مقام پر مندروں کے لئے انعام گرانٹس کے اجراء سے پہنچتی ہے۔(21) اس کے باوجود اسی زمانے کے دوران اکبر ان مسلمان فرقوں کے حوالے سے مذمتی رویئے کا اظہار بھی کرتا تھا جن کو کٹر پنتھی علمائے مذہب اسلام کے راستے سے بھٹکے ہوئے قرار دیتے تھے۔ ساٹھ کی دہائی کے دوران بیشتر ایرانی امراء جو شیعہ تھے ان کی ہمت افزائی کی گئی تھی اور ان کو غیر مطمئن تورانیوں کے خلاف استعمال کیا تھا۔(22) اور اسی کے ساتھ شیعہ عقائد پر عمل کرنے کی ان کی آزادی کو پابندی لگا کر محدود بھی کیا گیا تھا۔ اس کی ایک روشن مثال شیخ عبدالنبی کے کہنے پر 1567ء میں امیر خسرو کے مزار سے قریب واقع میر مرتضٰی شریف شیرازی کی قبر کھدوا کر اس کی ہڈیاں نکلوادی گئی تھیں۔ اس اقدام کے لئے یہ جواز پیش گیا تھا کہ اسلام کے راستے سے بھٹکے ہوئے شخص کی قبر کو اتنے قد آور سنّی بزرگ کے قریب نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بلاشبہہ ایک انتہا پسندانہ اقدام تھا حتیٰ کہ بدایونی نے بھی اس اقدام کو بلاجواز قرار دے کے تنقید کی ہے۔(23)

1572ء کے لگ بھگ پرگنہ بلگرام کے محتسب عبدالصمد کے نام اکبر کا فرمان اسے حکم دیتا ہے کہ وہ پرگنہ کے علاقے سے ان لوگوں کا صفایا کرنے میں تعاون کرے جو اسلام کے راستے سے بھٹک گئے ہوں اور انحراف کرتے ہوں۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شیعت کے خلاف جبر کے اطلاق کا رجحان اوائل ستر تک جاری رہا تھا۔(24)

مہدوی فرقے کے خلاف اکبر کا اشتعال انگیز رویہ بھی اس وقت زیادہ نمایاں رہا تھا۔ یہ رویہ 1573ء تک جاری رہا تھا جب اس نے گجرات میں بہت ہی سفاکانہ اقدامات کے ذریعہ مہدویوں کی کمر توڑ دی تھی۔ ان اقدامات ہی کے دوران اہم رہنما مہدوی بزرگ میاں مصطفےٰ بندگی کو قید کرنے کے بعد زنجیریں پہنا کر اکبر کے دربار میں لایا گیا تھا۔(25)

لگ بھگ 1571ء سے اکبر روز بروز زیادہ شدت کے ساتھ وحدت الوجودی صوفی اصول سے متاثر ہو رہا تھا۔ جس کے نتیجے میں تیزی کے ساتھ دنیا کے بارے میں اس کے نقطہ نظر کی نشو ونما میں موڑ آیا تھا۔ سوچ میں اسی بدلاؤ نے فقیہان تقلید کی طرف سے مسلط کئے گئے اسلامی نظریئے کو مسترد کرنے کی راہ ہموار کی تھی اور اس کی جگہ ایک بالکل نئے اور مکمل طور پر مختلف اسلامی نظریئے نے لے لی تھی اور جو مختلف مذاہب کے مابین قائم سرحدوں سے بالاتر تھا۔ اکبر کے بقول اس نئے نظریئے کی روح ایمان کے ظاہری معمولات سے چمٹے رہنا یا فتنہ کروالینا نہیں بلکہ نفس امارہ کو مارنا تھا۔ اکبر اس قسم کے نظریئے سے تقریباً ساٹھ کی دہائی میں اس وقت متعارف ہوا تھا جب وہ پہلی بار اجمیر اور فتح پور سیکری میں چشتی خانقاہوں پر گیا تھا۔ اس سے بھی کچھ پہلے اس کا شیخ غوث گوالیاری سے تعلق نے بھی موقع فراہم کیا ہوگا اور اسے صوفی وحدت الوجود اور فنا کے بارے میں جانکاری ملی ہوگی۔ 1573ء تک اکبر شیخ معین الدین چشتی کو اپنا روحانی پیر و مرشد ماننے لگا تھا۔ مرزا مصطفےٰ بندگی سے اپنی ایک بات چیت کے دوران بتایا گیا ہے کہ اس نے برملا اعلان کیا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی میرے پیر و مرشد ہیں اور جو بھی ان کو گمراہ کہتا ہے وہ کافر ہے۔ ایسا کہنے والے کو میں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔(26)

اس کی سند کی تصدیق بدایونی کے بیان سے کہ 1577ء تک بادشاہ باقاعدگی کے ساتھ چشتی سلسلے کی عبادتوں کو ادا کرتا تھا۔ 1575ء کے بعد کسی موڑ پر اس نے شیخ چاپا کدھ سے چلّہ معکوس کے عمل کی تعلیم اور تربیت بھی حاصل کی تھی۔(27)

صوفی فنا کی اصولیات کے گہرے اثرات سے ایسا نظر آتا ہے کہ اکبر کو فلسفے سے دلچسپی لینے کی تحریک فراہم کی تھی۔ شیخ مبارک، ابوالفضل، غازی خان بدخشانی، حکیم عبدالفتح اور دوسرے تعقل پسند سوچ کاروں کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے 1578-1582ء کے دوران وہ

ابن العربی کے نظریہ وحدت الوجود کی معنوی جہات سے دھیرے دھیرے واقف ہو گیا تھا اور اسے وسیع تر فلسفیانہ تناظر میں سمجھا تھا۔ جیسا کہ عرفان حبیب نے نشاندہی کی ہے ابن العربی کی وحدت الوجودیت تعقل پسندی کی بنیاد سے محروم ہونے کے باوجود اتنی طاقتور تھی کہ وہ بعد غزالی کے روایتی اسلام کے لئے ایک نظریاتی چیلنج ہو گئی تھی۔ اکبر کو ابن العربی کے اثرات کی یہی خوبی اس کے افکار و نظریات سے قریب لائی تھی۔ خصوصاً یہ اثر 82-1572ء کے دوران اس سماجی و سیاسی ادراک میں بدلاؤ لایا تھا۔ ابوالفضل نے اسے خسرو کی اٹھان کی آخری بلندی یا بلند پائیگی قرار دیا ہے۔ ابن العربی کا موقف کہ وہ تمام جواب اکبر کی حقیقت کا حصہ نہیں ہے تمام تر التباس ہے۔ اکبر نے اس موقف کو مان کر یہ موقف اختیار کیا کہ تمام مذاہب یا تو ایک ہی طرح کی صداقت کے ترجمان ہیں اور سچے ہیں یا پھر وہ بھی سارے کے سارے محض التباس ہیں۔ (28) یہ وہ موقف تھا جس کے بارے میں تمام فرقوں کے کٹر پنتھی اہل الرائے کا خیال تھا کہ وہ صراط مستقیم سے انحراف ہے۔ عیسائی راہبوں کے لئے بھی جو اس زمانے کے شاہی دربار میں موجود تھے یہ موقف ناقابل قبول ہی تھا۔ 1581ء میں جلالہ یعنی اپنے ذاتی رسوم کے عمل کے آزادی کی روشنی کے حوالے سے اکبر کی یقین دہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے مونسیریٹ کا مشاہدہ ہے کہ بادشاہ کو اس سے غرض نہیں تھی کہ ہر شخص اس کے عقائد پر عمل کرے بلکہ اصل میں وہ تمام لوگوں یا اجتماع عام کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔ (29) شاہی دربار میں اس نئے نظریاتی رجحان کے ابھارنے دنیا کے بارے میں بادشاہ کے نقطہ نظر کے حوالے سے بڑے بڑے صاحبان علم کو کنفیوژن میں ڈال دیا تھا۔ بدایونی نے دربار کی فکری فضا کے بارے میں لکھا ہے کہ (لگ بھگ 1581ء) کہ یہ رجحان راسخ العقیدگی کی ہار اور شریعت کی فتح تھی۔ (30)

یہ موڑ بہر حال ایک دنیا کے بارے میں اکبر کی سوچ میں بدلاؤ کا ایک اور موڑ تھا جو اسے مروجہ اسلامی عقائد اور معمولات سے جن کو مانا جاتا تھا اور دور لے گیا تھا۔ اتنی دوری اس سے پہلے کے زمانے میں ممکن نہیں تھی۔ یہ ساری تبدیلی اسلامی تصوف کے نظریہ وحدت الوجود کے تناظر سے جڑنے کے بعد آئی تھی۔

ابن العربی کے وجودی فلسفے کے گہرے اثرات کے نتیجہ میں دنیا کے بارے میں اکبر کے انداز نظر کا بدلاؤ ہی اسے صلح کل کے نظریئے تک لے گیا تھا۔ اس نظریئے کو اس نے یا اس

۔کے لئے ابوالفضل نے کچھ اس طرح وضع کیا تھا کہ وہ تصوف کے اصول کے معیار سے اوپر جا کر بلاواسطہ طور پر حالت فنا اور اس کے نتیجے میں ایک کثیر الثقافتی تناظر میں مختلف ایک دوسرے سے علیحدگی کی طرف جانے والے گروہوں کے مابین ایک موزوں اصول یعنی باہمی رواداری اور اشتراک و ایکتا کو بڑھاوا دے۔ البیرونی کے ایک مشہور وجدانی اقتباس کے حوالے کی مدد سے جس میں فکری تنگ نظری کی بنیاد پر ایک برہمن کو تنقید کا موضوع بنایا گیا ہے کہ ابوالفضل نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندستان میں بنیادی طور پر صلح کل کی تحریک کی غیر موجودگی سماج میں اختلافات کا سبب بن گیا۔ وہ مزید آگے جاتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہندستان میں صلح کل کی تحریک کی ناموجودگی کا اصل سبب ایک تقلیدی طرز عمل کی حاکمیت اور خرد افروزی و اسباب وعلل کو جبر کے ذریعہ دبانا ہے۔(31) اکبر کا صلح کل پر 1581ء کے بعد اعتقاد اسے رواں دھارے کے کٹر پنتھی نظریہ اسلام سے دور لے گیا تھا اور وہ اس حد تک گیا کہ اب اس کے ذہن میں فرض کی گئی نمازوں اور بغیر کوئی سوال اٹھائے گئے نبوت کو مان لینے کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے خیالات اب معاصر نرگون بھگتی فرقے سے مطابقت رکھتے تھے جو ہندو دھرم اور اسلام دونوں پر اس لئے تنقید کرتا ہے کہ وہ بہت زیادہ تقلیدی اور لوگوں میں تقسیم پیدا کرنے والے ہیں۔ اپنے ایک کم جانے جانے والے بیان میں اکبر نے فرد کے خدا سے تعلق کا تعین کرتے ہوئے اکثر معاملات میں اس قرب کا انکشاف کرتا ہے جو نرگون بھگتی کی تعلیمات ہی ہیں۔ 1551ء میں مراد کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اکبر کہتا ہے کہ ”بے مثال کی محبت بول چال کی زبان کے حدود سے باہر ہوتی ہے خواہ زبان کے حروف جسم کے بارے میں ہوں، جسمانیت یا مادی خواص کے بارے میں ہوں یا حرف وصوت کے۔ ایک بے مثال واحد مطلق سے محبت بجائے خود بے مثال ہوتی ہے۔ اگر خدا یہ چاہتا ہے تو تم اس حیرت ناک الٰہیاتی پر اسراریت کے ذاتی خانے میں قدم رکھ سکو گے۔ لمحہ موجود میں کامیاب ابتدا یہ ہے کہ مراد قابل قبول وفاداری کے ساتھ اپنی شخصیت کو بنائے سنوارے اور صفہائے خاطر سے معاملہ کرے اور ہماری خوشنودی حاصل کرنے کی جدوجہد کرے تاکہ اس کے بعد وہ اس دوسرے خدائی خانے کی طرف بڑھ سکے جس کے دروازے اس پر کھل گئے ہیں۔(32)

اس اقتباس میں حق کی حقیقت کے مطلق ہونے پر زور اور یہ نازک مشورہ کہ رسمی نماز کی

ادائیگی کے ذریعہ کوئی اس منزل تک نہیں پہنچ سکتا ہے سوائے جب وہ اپنی خودی کی تربیت کرے اور ایک مرشد کامل کی مدد سے رجوع کرے ہمیں نانک اور کبیر کی تعلیمات کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ مزید یہ کہ معاصر بھگتی طرز کی عبادات کی طرح اکبر کے نظام خیالات میں مرشد کامل کے کردار پر سختی کے ساتھ زور دیا گیا ہے وہ جیسے کہ اوپر کے اپنے اقتباس میں مراد سے کہتا ہے کہ خدا کی پراسراریت کو سمجھنے کی امید صرف اسی صورت میں کر سکتا ہے جب وہ اکبر کی مدد اور رہنمائی حاصل کرے، جو مرشد کامل کا درجہ رکھتا ہے اکبر کے نظام خیال میں مرشد کامل کا ادراک انسانِ کامل کا مقام رکھتا ہے جس کا ماخذ اسلامی تصوف ہے۔

دنیا کے بارے اکبر کی نئی سوچ نے تعقل پسندی کے رجحان کے ساتھ ساتھ اخلاقی عمل کے اس معیار کی ہمت افزائی جو اکبر نے وضع کیا تھا اور جو محض اس کے ذاتی چاہنے والوں یا ارباب ارادت ہی کے لئے نہیں تھا بلکہ درباری شرفاء کے حلقہ سے تعلق رکھنے والے عام اراکین پر لاگو کیا گیا تھا۔ ابوالفضل نے اپنی نظری وضاحت میں بہت عمدہ انداز سے بادشاہت کے تصور کا ذکر کیا ہے۔ وہ بادشاہت کی تعریف دوہرے انداز سے کرتا ہے اول فرّ ایزدی یعنی نور خداوندی اور دوم سماج اور حکمراں کے درمیان سے ابھرنے والے سماجی معاہدے کا تناظر۔(33) ان کے علاوہ خود بادشاہ کے اپنے اقوال (34) اور دوسری دستاویزات ہیں جن کو ابوالفضل نے نقل کیا ہے اور ثقافتی اقدار کے ایک نئے نظام کو نمایاں کیا ہے۔ جن کی جڑ عقلی تجربات میں ہے مگر وہ صلح کل کی تحریک کی خلاف ورزی نہیں کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض اقدار حیرت انگیز حد تک جدید دکھائی دیتے ہیں۔

اکبر کے بہت سے مشاہدات کو قلمبند کرتے ہوئے ابوالفضل نے بتایا ہے کہ اس نے حکمرانی کو اس فرض سے مشروط کیا تھا کہ عام لوگوں کی فلاح و بہبود کا کام ہو۔ اس نے ایسے بیانات کا بھی حوالہ دیا ہے جن میں بادشاہ نے عورتوں کے احترام اور ان کے مسائل سے دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ 1591ء میں جو جواب بادشاہ نے مراد کو دیا تھا میں اسے یہاں نقل کرنا چاہوں گا، یہ ڈاک چوکی کے ایک ملازم بہادر کے تبادلے سے متعلق تھا۔ بادشاہ نے اس کے بارے میں درج ذیل حکم لکھا تھا۔

بہادر کی بیوی تبادلے کے مقام پر جانے کے لئے راضی نہیں ہے۔ ہم اگر اسے راضی

کرنے کی ترغیب دیں تو اس کے بعد ہی بہادر کو بھیجا جا سکتا ہے۔ دوسری صورت میں اس کا تبادلہ کرنے کے بجائے ہم اسے چند دن بیتنے کے بعد ڈاک چوکی سے فرمان لے کر جانے پر متعین کریں گے اور اس آوت جاوت کے دوران چند دنوں کے لئے تم (مراد) اسے روک سکتے ہو۔(35) یہاں بہادر کی بیوی کی رائے کا احترام اور یہ مبہم امید کہ وہ اسے ترغیب دے کر اس کی رائے کو تبدیل کیا جائے قابل توجہ انداز نظر ہے اور اس لئے زیادہ قابل توجہ ہے کہ جس شخص کے حوالے سے بادشاہ نے یہ رائے دی تھی وہ ڈاک چوکی کا ایک معمولی نامہ بر ہے۔ اسی طرح بادشاہ کا یہ موقف تھا جب اس نے ہندوؤں میں رائج رسم ستّی کے خلاف اظہار کیا۔ ایک اور موقع پر اس نے مسلم پرسنل لاء پر بھی تنقید کی جس کی رو سے عورتوں کو وراثتی جائیداد میں مردوں کے مقابلے میں کم حصہ دیا جاتا ہے۔ اس کا موقف تھا کہ کمزور کو زیادہ حصہ ملنا چاہئے۔(36) اکبر کی اس طرح کی سوچ بہت صحت منداور عام لوگوں کے لئے افادی تھی۔

گوشت خوری کے خلاف اکبر کے اقدام کی جڑیں مذہب میں نہیں تھیں بلکہ اس کے مزاج اور فطرت میں تھیں کیونکہ جانداروں کو اس طرح ذبح کرنے کو وہ پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کا ایک قول یہ بھی ہے۔ ''میری خواہش ہے کہ میرا جسم عنصر یعنی عناصر سے بنا ہوا جسم ہاتھی کی طرح بڑا اور بھاری بھر کم ہوتا کہ گوشت خور یہ جاہل میرے جسم کا گوشت کھا کر اپنی پیٹ کی بھوک کا جہنم بھریں۔ اس طرح دوسرے جاندار کم سے کم ذبح ہونے سے تو بچ جائیں گے۔''(37) اس بیان کی معنوی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں بادشاہ نے مذہب کو بالکل نہیں چھیڑا ہے بلکہ انسانی حوالے سے بات کی ہے۔ اس قسم کے اقوال سرکاری طور پر مانے گئے انسان کامل یا پیرومرشد کے حوالے سے نہیں ہیں بلکہ بطور ایک انتہائی حساس انسان پرست اور ذہین ذات کے نجی خیالات کے حوالے سے ہیں جو بدقسمتی سے باقاعدہ رسمی تعلیم حاصل نہیں کر سکا تھا۔

صلح کل کی بنیاد پر قائم اکبر کا سماجی و مذہبی موقف آگے کی طرف بڑھا اور اپنے لئے ایک نظریاتی جگہ بنا لی۔ اس کے لئے تقابلی مذہب کے تناظر میں رواں دھارے کے کٹر پنتھی اسلامیوں کے ساتھ پُرجوش مکالمات نے راستہ صاف کیا تھا۔ نظریاتی تناظر میں صلح کل اسی طرح ہندو اعتقاد اور معمولات پر بھی تنقید کرتا ہے گوکہ یہ پہلو ہمیشہ ہی پردے کے پیچھے رہا تھا۔ غالباً اس لئے کہ جن ہندو فرقوں پر تنقید کی گئی تھی انہوں نے چیلنج کا کوئی جواب ہی نہیں دیا

تھا۔(38) جبکہ کٹر پنتھی مسلمان علماء کا ردعمل انتہائی شدید اور جارحانہ تھا۔ یہ نہ ختم ہونے والی جارحانہ مکالموں کی لڑائی جو کٹر پنتھی مذہبی علماء کے ایک بڑے حلقے اور صلح کل کے نظریئے کے ماننے والوں کے مابین تھی پچیس برسوں تک یعنی اکبر کے زمانہ حکمرانی کے آخری آدھے تک جاری رہی تھی۔ تمام اول الذکر علماء کا دعویٰ تھا کہ اکبر کا اسلام کے خلاف انداز نظر اشتعال انگیز تھا اور وہ مغل سلطنت کی حدود میں اسلام کو دیوار سے لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کٹر پنتھی قبیلے میں زیادہ جارحانہ اور برملا اکبر کے خلاف اس کی ترجمانی کرنے والوں میں ملا بدایونیؔ اور شیخ احمد سرہندی سرفہرست رہے تھے۔ تاہم اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہئے کہ بدایونیؔ اور شیخ سرہندی کا مبالغہ سے آلودہ اختلافی ردعمل سے کٹر پنتھی علماء کی اکثریت اتفاق نہیں کرتی تھی۔ بدایونیؔ نے خود بھی منتخب التواریخ کی تیسری جلد میں لکھا ہے کہ جب کٹر پنتھی اسلام کے خلاف صلح کل کے ماننے والوں کا پُر زور موقف اپنی انتہا پر تھا اس قسم کے علماء کی بہت بڑی تعداد اکبری دربار سے اپنے گہرے رشتے قائم کئے ہوئی تھی۔ اس زمانے کے معروف ماہرین دین شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے بیٹے شیخ نورالحق کے بعض بیانات بھی اس صورت حال کا اعتراف کرتے ہیں۔ گو کہ اکبر کے بعض خیالات سے ان دونوں نے اختلاف کیا تھا لیکن اکبر کی پالیسیوں کا جو پُر خطر تاثر بدایونیؔ نے پیش کیا تھا اس سے دونوں نے اتفاق نہیں کیا تھا۔ 1605ء کے اواخر تک شیخ عبدالحق نے اپنی کتاب تاریخ حقیقی مکمل کر لی تھی۔ اس میں ایک دعا ہے جو اکبر کے حوالے سے ہے کہ وہ عہد ساز پادشاہ ہے اس لئے ہم اس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اسلام کا دفاع کرے۔ اسی برس شیخ نورالحقؔ نے اپنے سابق موقف سے ہٹ کر کہا تھا کہ مذہبی مباحث کی ہمت افزائی کی جو تحریک اکبر نے جاری کی تھی اسے عام لوگوں نے نہیں سمجھا تھا اور غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔(39)

اس مقالے کو تمام کرتے ہوئے میں نعمت اللہ (40) اور محمد صادق (41) کے حوالے سے ان شکوک پر بھی تبصرہ کرنا پسند کروں گا جو اطہر علی نے اٹھائے ہیں۔ بدایونی اور سرہندی کے الزامات سے عدم اتفاق کرتے ہوئے کہ اکبر نے کٹر پنتھی اسلامی معمولات ادا کرنے والوں کے خلاف جبر کا رویہ اختیار کیا تھا وہ متفق دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ اطہر علی نے اول الذکر بیانات کی صداقت پر شک کا اظہار کیا ہے اور بتایا ہے کہ 1592ء میں مانؔ سنگھ نے راج محل میں ایک

بڑی مسجد بنوائی تھی۔اس مسجد کے حوالے سے انہوں نے آرکیالوجیکل سروے کی رپورٹ درج کی گئی مقبول روایت کا اقتباس قلمبند کیا ہے کہ اصل میں عمارت کا نقشہ ایک مندر بنانے کے ارادے سے بنایا گیا تھا لیکن بعد میں بادشاہ کے خوف کی بنا پر اسے جمعہ مسجد کے نقشے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ایسا لگتا ہے کہ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسجدوں کے بند ہونے کے بارے میں موجود رپورٹیں ان مشکلات کا مبالغہ آمیز بیان ہو سکتا ہے جو اسلامی اداروں کے لئے مہیا کی جانے والی مالی رقوم میں کٹوتی کے سبب پیدا ہوئی تھیں۔ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اکبر کے جن مذہبی خیالات کا ذکر کیا گیا ہے ان کے حوالوں سے بھی کٹر پنتھی اسلامی معمولات ادا کرنے والوں پر جبر کا موقف غلط ہی محسوس ہوتا ہے۔

اب مگر کچھ ایسے مضبوط شواہد دستیاب ہیں جو بدایونی اور سرہندی کے موقف کو سند فراہم کرتے ہیں۔ہمیں اس شہادت پر بھی اس سے پہلے کہ اطہر علی نے جو موقف اختیار کیا ہے لوگوں کی توجہ کا مرکز ہو جائے بحث کرنا چاہئے۔

اس سے پہلے کہ میں ان اضافی شواہد کا جائزہ لینے کی طرف بڑھوں یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ کیا موجودہ بحث کے لئے 1591ء میں راج محل کے اندر مان سنگھ کے مسجد بنوانے کی کوئی اہمیت ہے۔اس کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی معمولات اور اداروں کے حوالے سے جبر کا رویہ جیسا کہ بدایونی اور سرہندی نے بیان کیا ہے ان کا وقوع 1592ء کے بعد یا تقریباً1600ء میں ہوا تھا۔

مسجدوں کو بند کرنے کی کوشش اور باجماعت نماز ادا کرنے کو ممنوع قرار دینے کا ایک واضح حوالہ شاہزادہ سلیم کی طرف سے جاری کئے جانے والے ایک فرمان میں ملتا ہے۔جب مقامی حاکموں کے خلاف اس نے 1601ء میں بغاوت کی تھی۔اس کا متن رفیع الدین ابراہیم شیرازی نے اپنی کتاب تذکرۃ الملوک میں کیا ہے۔جیسا کہ پہلے میں لکھ چکا ہوں اگرچہ رفیع الدین شیرازی (متوفی 1626ء) نے اپنی کتاب بیجاپور میں اوائل سترہویں صدی کے دوران لکھی تھی مگر اس نے اکبر کے زمانے سے متعلق تاریخ پر نئی اطلاعات اور دستاویزات کو نقل کیا تھا اور جن کی صداقت پر شک کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔(42) اس نے 1601ء کا سلیم کا جو فرمان نقل کیا ہے اپنی قسم کا ایک نمونہ ہے اور اس کا متن ہے کہ "چند شری لوگوں کے اکسانے پر

میرے والد نے خطیبوں، مؤذنوں اور اماموں کے اہتمام کو منسوخ کر دیا ہے اور مسجدوں میں باجماعت نماز کی ادائیگی کو بھی روک دیا ہے۔اس نے بہت سی مسجدوں کو گودام اور اصطبل بنا دیئے تھے۔اس قسم کے عمل کا اظہار اکبر جیسے شخص پر زیب نہیں دیتا ہے۔لوگوں (جنھوں نے یہ فرمان پایا ہو) کو چاہئے کہ وہ خطیب مؤذن اور امام کو نذرانہ دیتے رہیں اور لوگوں کو نماز ادا کرنے کی ترغیب دیں۔کوئی بھی اس معاملے میں اگر سستی کا مظاہرہ کرے گا تو اسے سزا دی جائے گی۔(43)

زیرِ نظر فرمان شک کی کسی گنجائش کا خاتمہ کر دیتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سولھویں صدی کے خاتمے تک اکبر کے حکم سے بعض مسجدوں میں نماز باجماعت کو ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ اس طرح یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ بغاوت کے دوران مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اس مسئلے کا استعمال گیا تھا۔اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ 1601ء میں سلیم کے ذہن میں اسلام کے حوالے سے اکبر کے انداز نظر نے جس طرح مسلمانوں کے نازک جذبات سے دھچکا پہنچایا تھا اس کا تاثر کافی گہرا تھا اور اس مسئلے کو استعمال میں لا کر وہ اپنی بغاوت میں عوام کی حمایت اکٹھا کر سکتا تھا۔

عبدالباقی نہوندی نے معاصر رحیمی مطبوعہ 1614ء میں جو کہانی بیان کی ہے۔

شہادت پیش کرتی ہے۔اس کی اطلاع کے مطابق 1601ء میں نئے مفتوحہ صوبہ دکن اور خان دیش میں دانیال کی تقرری کے بعد اکبر نے اسے لکھا تھا کہ وہ اسیر گڑھ کی جامعہ مسجد کو تباہ کر دے اور اس کی جگہ ہندو مندروں جیسی عمارت بنوا دے۔اس کہانی کے مطابق دانیال بہرحال صاحب دانش تھا چنانچہ اس نے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے اسے نظر انداز کر کے چپ سادھ لی تھی۔اس نے وقت بیتنے دیا تا کہ مسجد کو گرانے اور اس کی جگہ مندر جیسی عمارت بنوانے کا موقع کسی طرح ٹل جائے۔(44)

اس کہانی کے حوالے سے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ عبدالباقی نہوندی اسے اپنے حاکم عبدالرحیم خانِ خاناں کے دکن میں بطور دانیال کے اتالیق کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا تھا۔نہوندی کو ملازم خانِ خاناں نے رکھا تھا۔جس طرح یہ کہانی قلمبند کی گئی ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اکبر سے غیر معمولی حکم کو نظر انداز کرنے کا سہرا جزوی طور پر خانِ خاناں کے سر

جاتا ہے جو کہ اس وقت دانیال کو کمان کرنے والا دوسرا شخص تھا۔ اس کہانی کو دوسرے کسی معروف لکھاری نے بیان نہیں کیا ہے۔ غالباً باقی نہوندی ماخذ علم خود عبدالرحیم خانِ خاناں ہی ہو۔ مزید یہ ہے کہ ایک ایسے متن میں اس قسم کی کہانی کی قلم بندی جو عبدالرحیم خانِ خاناں سے منسوب ہے یہ بتانے کی کوشش بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی قلم بندی (یعنی 1614ء) کے وقت 1601ء کے زمانے میں کٹر پنتھی اسلام کے خلاف اکبر کے جبریہ اقدامات عام طور پر سب کے ہی علم میں تھے اس لئے تاریخی متون میں ان کے سرسری تذکروں کو جہانگیر اور اس کے درباری بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔

اس سے پہلے حوالے میں آنے والے میمورنڈم میں اکبر کا لکھا ہوا ایک حکم شامل تھا جو 1591ء میں مالوہ سے بھیجے جانے والے مراد کے سوالات اور درخواستوں کا جواب ہیں۔ ان میں ایک سوال یہ ہے کہ اگر اس کے (مراد کے) کیمپ میں کوئی شخص اس طرح کی نماز پڑھتے ہوئے دکھائی دے جو فقہہ تقلید شعائیر سے مطابقت رکھتی ہو تو کیا اسے روکا جائے یا اسے اپنے طریقے سے نماز ادا کرنے دی جائے۔ اکبر کا جواب تھا کہ اس طرح نماز ادا کرنے والے کو اس کے بڑے نصیحت کریں اور راہ عقل کی طرف اسے واپس لانے کے لئے اس کی مدد کریں لیکن ساتھ مراد سے یہ کہا گیا کہ ایسے شخص پر جبر نہ کیا جائے اور اسے اس کے طریقے سے عبادت کرنی دی جائے۔ اس پر جبر کا نفاذ صلح کل کے قاعدے کے خلاف ورزی ہوگی۔(45) یہ دستاویز صورت حال کے دو پہلوؤں کی نشاندہی کرتی ہے اول کہ 1591ء کے دوران بعض شہزادے اور شرفا جو فوجوں کے کمان دار یا مختلف علاقوں کے منتظمین میں تھے ان کے ذہن صاف نہیں تھے کہ کیا وہ غلط طریقے سے نماز پڑھنے والوں کو روکیں یا نہ روکیں اور دوم 1591ء تک سرکاری پالیسی مغل منتظمین کو یہ پالیسی دی گئی تھی کہ وہ غلطی کو سدھارنے کے لئے نصیحت تو کریں لیکن راہ عقل کی طرف لانے کے لئے غلطی کرنے والے یا والوں پر جبر نہ کریں۔ اس سے بعض لوگوں نے محسوس کیا کہ یہ شاید ایک ایسی صورت حال کی طرف جھکاؤ کی ابتدا ہے جس کی بنا پر 1601ء میں سلیم کی بغاوت سے پہلے کسی وقت یہ تاثر عام ہوگیا تھا کہ اکبر نے تمام مسجدوں سے انتظامات کے حوالے سے اپنی حمایت کا خاتمہ کردیا ہے حتیٰ کہ بعض مسجدوں کو تباہ کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔

یہ نظر آتا ہے کہ اس کا زمانہ بہت مختصر ہی رہا تھا (یعنی نماز سے روکنا اور مسجدوں کو تباہ کرنا وغیرہ) نماز باجماعت کی ہمت افزائی نہ کرنے کی کوشش اور اسلام کے دوسرے معمولات کی ادائیگی پر پابندی سے اکبر 1601ء میں آئین اکبری مکمل ہونے سے پہلے دستبردار ہو گیا تھا۔ اس کی تصدیق آئین اکبری میں شامل ابوالفضل کے بیان سے ہوتی ہے کہ خدا کی عبادت کے ظاہری اور روحانی تقاضے پورے کرتا تھا جس کے نتیجے میں اس زمانے کے رسمیان روزگار اس کے خلاف جو ہڑبونگ برپا کیے ہوئے تھے خاموش ہو گئے تھے۔ بلوخ مان نے اس اقتباس کا مطالعہ کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا ہے کہ اکبر اکثر اپنے عہد کے مخالفوں اور کٹر پنتھیوں کی زبان کو روکنے کے لئے لوگوں کے ساتھ نماز ادا کیا کرتا تھا۔(46) یہ خیال زیادہ معتبر نہیں ہے۔ اوپر کے اقتباس میں فقرہ ''ریاضت صوری''۔ اکبر کے نماز پڑھنے کی کوئی سند نہیں ہے اور جب کہ ابوالفضل نے لکھا بھی ہے مخالفوں کو خاموش رکھنے کی کوشش تھی۔ یہ اس حقیقت کا واضح اعتراف بھی ہے کہ 1601ء تک اکبر کے عقائد اور نماز کے حوالے سے اس کی آراء پر سخت تنقید ہوتی تھی جس کی وجہ سے اس نے مسلمان عوام کے ردعمل کو محسوس کرتے ہوئے نماز کی ادائیگی جیسے مسئلے پر اپنے انداز نظر میں نرمی پیدا کر لی تھی۔ اپنی حکمرانی کے آخری چار برسوں کے دوران اسلام کے حوالے سے اکبر کے رویئے میں جو نرمی پیدا ہوئی تھی اس کا اعتراف تعریفی انداز میں 1605ء میں شیخ عبدالحق محدث اور شیخ نورالحق نے بھی کیا ہے۔

اپنی موت کے وقت مسلمانوں میں اس کی پالیسیوں کے حوالے سے کوئی اختلاف باقی نہیں رہا تھا اور نہ کٹر پنتھی مذہبی حلقوں میں کوئی اختلاف باقی رہ گیا تھا۔ دوسری طرف 1605ء اکبر کی وفات کے سمے عبدالحق جیسے کٹر ماہر دینیات کا یہ خیال تھا کہ اپنی تمام تر اختراعات کے باوجود وہ رہا ایک مسلمان بادشاہ ہی۔

حوالہ جات

1- اطہر علی۔ اکبر اینڈ اسلام جواسلامک سوسائٹی اینڈ کلچر۔ ایسیز ان آنر آف پروفیسر عزیز احمد ایڈیشن ملٹن اسرائیل اینڈ این کے ویگل۔ دہلی 1983ء میں شامل ہے۔

2- اکبر کے بارے میں بدایونی اور شیخ احمد سرہندی کے بیان کا غور سے جائزہ لینے کے لئے عرفان حبیب کی ایک یادگار تحریر کے ساتھ دی پولیٹیکل رول آف شیخ احمد سرہندی اینڈ شاہ ولی اللہ دہلوی کا مطالعہ ضروری ہے۔ پروسیڈنگز آف انڈین ہسٹری کانگریس علی گڑھ کا 23 واں اجلاس 1960ء۔ اطہر عباس رضوی کے اہم کام مسلم ریوایولسٹ مومنٹس اِن ناردرن انڈیا اِن 16 تھ اینڈ 17 تھ سنچریز۔ آگرہ 1964ء۔ اور ان ہی کا ایک تازہ مطالعہ ریلیجس اینڈ انٹیلکچول ہسٹری آف مسلمز ان اکبرس رین۔ دہلی 1975ء۔

3- ایشوری پرشاد۔ دی مغل ایمپائر۔ الہ آباد۔ 1976ء ص346

4- ابوالفضل۔ اکبر نامہ مرتبہ آغا احمد علی۔ کولکتا۔ 1877ء ص254۔ اور بایزید بیات، تاریخ ہمایوں و اکبر ہدایت حسین کا ایڈیشن۔ کولکتا 1941ء ص74۔ اس شہادت کی تشریح کے لئے دیکھئے میرا مقالہ ''وزارت انڈر ہمایوں (1545-1555ء)''۔ میڈیول انڈیا کوارٹرلی V نمبر 1 سال 1963ء علی گڑھ ص76۔

5- اکبرنامہ۔(II) ص20

6- اس شہادت پر بحث کے لئے دیکھئے میرا مقالہ ''دی مغل کورٹ پالیٹکس ڈیورنگ بیرم خانس ایجنسی۔ میڈیول انڈیا، اے۔ میسلینی (1) علی گڑھ/ممبئی 1969ء۔ ایف۔ این۔ ایس 20، 36، 56 اور 59 کی طرف توجہ کیجئے۔

7- علی قلی خان ازبک اور بیرم خان کے ساتھ منعم خان کے گہرے روابط پر میری کتاب

''دی پولیٹیکل بائیوگرافی آف اے مغل نوبل: منعم خان، خانِ خاناں 1575-1497ء دہلی 1973ء ص 59، 85 اور این 3 پر بحث ملتی ہے۔

8- یاسائے چنگریزی کے اثرات کے تسلسل کے لئے جو ہمایوں تک کی تیموری سیاست پر مرتب ہوئے تھے۔ دیکھئے ''دی پولیٹیکل بائیوگرافی آف اے مغل نوبل۔ تعارف نامہ ص IX-XIV

9- تاریخ جہاں گشا مرتبہ مرزا محمد (1) لندن 1912ء ص 19-18 ترجمہ کار جے۔ اے۔ بوائل مانچسٹر 1958ء ص 26

10- افضل حسین۔ گروتھ آف ایرانی ایلیمنٹ ان اکبرس نوبیلٹی۔ پروسیڈنگز آف انڈین ہسٹری کانگریس 36 واں اجلاس 1975ء ص 179-166

11- اینٹونیو مونسیر یٹ۔ کامنٹری آن ہز جرنی ٹو دی کورٹ آف اکبر ترجمہ کار جے۔ ایس۔ ہوئی لینڈ اینڈ مختصر تبصرہ ایس۔ این۔ بنرجی، کولکتا، 1922ء ص 197

12- اکبرنامہ II ص 152

13- اکبرنامہ III ص 242-241

14- عارف قندھاری۔ تاریخ اکبری۔ معین الدین غوری، اظہر علی اور امتیاز علی عرشی کا ایڈیشن۔ رامپور 1962ء ص 43-42

15- اکبرنامہ III ص 393۔ بقول ابوالفضل تجربہ کی ابتدا 11 مارچ 1579ء اور 10 مارچ 1580ء کے دوران ہوئی تھی۔ چند نومولود بچوں کو ایک گھر میں بند کر دیا گیا تھا جہاں مکمل تنہائی تھی۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے نرسیں مقرر تھیں۔ ان کو حکم تھا کہ نہ بولیں 9 اگست 1582ء کو اس گھر کا دورہ اکبر نے کیا۔ اس تجربے میں لائے جانے والا کوئی بچہ کوئی زبان سمجھ نہیں سکا۔ اس سے اکبر کو یہ ثبوت ملا کہ ہر قبیلے میں بچے لوگوں کو سنتے رہنے کے بعد زبان بولنا سیکھتے تھے۔ اس طرح بادشاہ کا اپنا خیال صحیح ثابت ہوا۔

16- آئینِ اکبری III نولکشور 1893ء ص 183-182

17- اکبر کے اقوال۔ آئینِ اکبری III ص 181۔ اور زبدۃ التواریخ۔ ترجمہ کار ایلیٹ اور ڈوسن، ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹوریز۔ لندن 1964ء۔ VI

ص189۔ جہاں شیخ نورالحق کہتے ہیں کہ 986ھ/1578ء تک اکبر پابندی کے ساتھ نماز پنج گانہ ادا کرتا تھا۔

18- واقعات مشتاقی بی آر لائبریری۔ او آر۔ 1929ء ایف 7194

19- بدایونی۔ منتخب التواریخ III احمد علی ولیز ایڈیشن۔ کولکتا 1864ء ص 74

20- ایضاً II ص 261۔ لو کا کہنا ہے کہ ہوم اصل میں بدل تھا پارسیوں کی رسم کا جس میں وہ سوم کا شربت پیش کرتے تھے۔ منتخب التواریخ ترجمہ کولکتا 1924ء ص 269۔ یہ غلط ہے۔ بدایونی ایک ہندو رسم کا حوالہ دیا ہے۔ مزید صحیح وضاحت کے لئے دیکھئے جان۔ ٹی۔ پلاٹس۔ ایک ڈکشنری آف اردو، کلاسیکل ہندی اور انگریزی۔ طبع ثانی دہلی 1977ء ص 1242۔ اس میں ہوم کی اصطلاح کا بیان ملتا ہے۔

21- اکبرنامہ جلد II ص 190 اور 204-203۔ تاراپد مکرجی اور عرفان حبیب، اکبر اینڈ دی ٹمپلز آف متھرا اینڈ اٹس انوائیرنس، 48 واں اجلاس پروسیڈنگز آف انڈین ہسٹری کانگریس۔ گوا 1987ء ص 237-235

22- ساٹھ کی دہائی کے دوران ایرانی امراء کے مقام ومناصب میں بہتری کے لئے دیکھئے میرا مقالہ "دی نوبلٹی انڈر اکبر اینڈ دی ڈیویلپمنٹ آف ہز ریلیجس پالیسی۔ جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی 1968ء ص 31 اور ایف۔ این۔ 7 اور دی پولیٹیکل بائیوگرافی آف اے مغل نوبل کا تعارف نامہ ص XVI-XVII

23- منتخب التواریخ III ص 321

24- شرایق عثمانی۔ ایم ایس۔ شعبہ تاریخ علی گڑھ ایف ایف 7126-7132۔ مزید دی نوبلٹی انڈر اکبر اینڈ دی ڈولوپ منٹ آف ہز ریلیجس پالیسی ایف۔ این۔ 17۔

25- علاؤ الدین قزوینی۔ نفائس المعاصر ایم۔ ایس۔ بی آر لائبریری ایف 162 اور بی۔ غوثی شطاری گلزار ابرار۔ ایم۔ ایس۔ جان اے لینڈس لائبریری ایف 207 بی۔ شہادت کے تفصیلی جائزے کے لئے دیکھئے اطہر عباس رضوی کی کتاب "مسلم ریوائی ولسٹ مومینٹس ان ناردرن انڈیا ان دی 16 تھ اینڈ 17 تھ سنچریز آگرہ 1965ء ص 116-118

26- مجالس۔مکتبہ ابراہیمیہ۔حیدرآباد 1367ھ ص 58
27- منتخب التواریخ II ص 201 اور (III) ص 110
28- عرفان حبیب۔ریزن اینڈ سائنس ان میڈیول انڈیا (سائیکلو اسٹائیل میں)۔یہ مقالہ ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کانفرنس آسٹریلیا میں پیش کیا گیا تھا۔1981ء
29- کامینٹری آن ہز جرنی ٹو دی کورٹ آف اکبر، ص 133-132
30- منتخب التواریخ II ص 211۔جہاں بدایونی ملا محمد یزدی پر الزام لگاتا ہے جو ابھی حال ہی میں ولایہ (ایران) سے آیا تھا کہ اس نے اکبر کو شیعی عقائد کی طرف مائل کیا تھا۔جلد III ص 74 میں شیخ مبارک کے کیریئر پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ یہ عراقی یا ایرانی شیعہ ہی تھے جو اس زمانے میں اکبری دربار پر چھائے ہوئے تھے۔
31- آئین اکبری III ص 4-3
32- اکبر نامہ۔ایم۔ایس۔(غالباً ابوالفضل کا پہلا مسودہ)۔بی۔آر۔لائبریری ایڈ 270، 247 ایف ایف 404 بی۔اس میں ایک میمورنڈم کا متن ہے جو اکبر کے حکم پر مشتمل ہے حکم ان سوالوں اور درخواستوں کے جواب میں جو 1591ء میں مالوہ کے مقام پر مقرر ہونے کے بعد مراد نے بھیجے تھے۔آخری مسودے میں اس میمورنڈم کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔اوپر بطور حوالہ اقتباس کے لئے اکبر کے بیان کو اسی ایم ایس کے ایف 402 پر پڑھیے۔
33- ان نظری خیالات پر ابوالفضل کی وضاحت کے لئے دیکھئے آئین اکبری کے متعلقہ متند حصے خصوصاً حصہ بہ عنوان رولیت روزی۔
34- آئین اکبری III ص 191-177۔ان میں سے کچھ اقوال اکبر نامہ میں بھی قلمبند ہوئے ہیں۔اصل موقع کے حوالے سے ہیں جب اور جہاں اکبر نے یہ کہے تھے۔
35- اکبر نامہ۔ایم۔ایس۔بی آر لائبریری ایڈ 27، 247 اور ایف 403 بی۔
36- آئین اکبری III ص 184 اور 190
37- ہر سہ دفتر۔نولکشور۔1862ء ص 123
38- جیسا کہ اطہر علی نے کہا (دی ریلیجس ورلڈ آف جہانگیر۔پروسیڈنگز۔آف انڈین

ہسٹری کانگریس۔کولکتا 51 واں اجلاس 1990ء ص 298 الف این 57) حلول کے نظریئے کے مسترد کردینے کا انعکاس اکبراس بیان میں ہوتا ہے کہ ہندستان میں کوئی بھی پیغمبری کا دعویٰ کرنے والا نہیں ہے جس کی وجہ نظریہ حلول ہے۔ابوالفضل ٹوڈرمل کو ایک سادہ لوح شخص کہتا ہے کیونکہ اسے اپنے پرائیویٹ دیوتا سے بہت لگاؤ تھا وہ نہ متعصب تھا اور نہ کینہ پرور تھا۔دبستان مذاہب میں اکبر کا ایک بیان ہے جس میں کافی بحث تھی جس میں اس نے اوتار یا پیمبروں کے ظہور کے برہمنی اعتقاد پر تنقید کی تھی۔

39- دیکھئے تاریخ حقیقی ص 181 پر متعلقہ پیراگراف کا ترجمہ اور ایلیٹ اور ڈاؤسن کی کتاب VI ص 191 پر زبدۃ التواریخ۔

40- تاریخ خان جہانی۔سید محمد امام الدین کا ایڈیشن۔ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان (اب بنگلہ دیش) ڈھاکہ 1962ء ص 671-670

41- تاریخ شاہ جہانی۔ایم۔ایس۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کلکش نمبر 226 الف 451 جس کا حوالہ اطہر علی نے اپنی کتاب ''اکبر اینڈ اسلام'' ص 171-170 پر دیا ہے۔

42- دیکھئے میرا مضمون ''دی تذکرۃ الملوک'' مصنفہ رفیع الدین ابراہیم شیرازی بطور ماخذ برائے تاریخ زمانہ اکبر کی۔اسٹڈیز ان ہسٹری (II) نمبر 1۔دہلی 1981ء ص 44-41

43- تذکرۃ الملوک۔ایم۔ایس لائبریری۔ایڈ 28،883 الف 224 بی۔

44- معاصر رحیمی۔(II) ہدایت حسین ایڈیشن۔کولکتا۔1925ء ص 474

45- اکبرنامہ۔ایم۔ایس۔بی آر لائبریری ایڈ 27،247 الف 404 اے۔

46- آئین اکبری۔نولکشور۔1882ء (1) ص 105۔اس کا مقابلہ ایچ۔بلوخ مان کے آئین اکبری کے انگریزی ترجمے سے کیجئے۔کولکتا۔1873ء ص 163

❁❁❁❁❁

اکبر اور جین

پشپا پرشاد

اکبر کے مذہبی خیالات کے بننے میں کسی ایک قسم کا نہیں بھانت بھانت کے مختلف دھاگوں کے ملاپ سے ابھرنے والی اکائی ہے جن کی الگ الگ پہچان کرنا آسان نہیں ہے۔ مختلف وقتوں میں مختلف اثرات و محرکات مختلف حدود میں کار فرما رہے تھے۔ اکبر کے زمانہ اقتدار سے متعلق تاریخی مواد اور معاصر محفوظ سرمایہ یہ واضح کرتا ہے کہ وہ تمام رائج معاصر مذاہب کے اصولوں اور لائحہ ہائے عمل کی جانکاری حاصل کرنے کے لئے بے چین رہتا تھا۔ بہت سے دانشوروں نے جینوں سے اکبر کے تعلقات پر مختلف پہلوؤں سے پہلے بحث کی ہے۔ ان میں قابل ذکر چمن لادھیا بھائی دلال، وی۔اے۔اسمتھ اور کالی پدمترا ہیں۔(1) اس مقالے میں جین ماخذ ہی کے معاصر شواہد کے آئینے میں جینوں کے لئے اکبر کے انداز نظر از سرنو جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ان ماخذ میں بہت زیادہ افادی ہیرساؤ بھاگ یم۔ (ہاکاویا۔ دیومل گنی کا سموت 1646-1589ء)، جے سوم کا کرم چندر و مسا پرابندھا (ایس 1650-1593ء) جچند رسوری (ایس 1658 / 1601ء) کا اکبر پراتھی بودرس اور سدّھی چندر کا بھانو کندرا کارت ہیں۔(2) بعد میں سترہویں صدی کے جینی ادبی بیانیوں کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔جینی مندروں میں پائے جانے والے سولہویں صدی کے کتبات جو گجرات اور آگرہ میں ہیں اکبر کے زمانے میں جینیوں کے مشاغل کے بارے میں جانکاری فراہم کرتے ہیں۔(3) ابوالفضل نے لکھا ہے کہ مختلف مذاہب کے مختلف فرقوں کے نمائندے عبادت خانے میں جمع ہوتے تھے اور بحثوں میں حصہ لیتے تھے۔صوفی فلسفیوں، مقرّروں،

سنیوں، سبیوں، زرتشتیوں اور دوسرے شرکت کرنے والوں کو لطف و مسرت کا احساس ہوتا تھا۔(4) لفظ جاتی (سنسکرت یاتی) اوپر دیئے گئے حوالوں میں جینیوں کو نشان زد کرتا ہے نہ کہ بودھ بھکشوؤں کو۔ سیورا (سنسکرت کا سیوتمبر) سیوتمبر جینیوں کے استعمال میں آیا ہے۔(5) یہاں بدایونی کا ایک حوالہ کہ بدایونی کا اقتباس مستند ہے اور اس کا اقتباس ہے کہ سامانی اور برہمن اکثر نجی طور پر بادشاہ سے ملنے آتے تھے۔(6) یہاں لفظ سامانی (یعنی سنسکرت میں سامان اور پراکرت میں سامان) کے معنی ہیں بھکشو یا درویش یا عقیدت مند۔ لو نے سامانیوں کو بودھ بھکشو کہا ہے حالانکہ یہ جینی برہمچاری کی نشاندہی کرتا ہے جن کو اب عموماً یاتی کہا جاتا ہے۔(7)

یہ واضح ہے کہ تین اصطلاحات یاتی، سیورا یا سیورا اور سامانی سوتمبر فرقہ کو نشان زد کرتے ہیں۔ پرتگالی راہب پن ہیریو 1595ء کے لاہور کے ایک خط میں بیان کرتا ہے کہ اکبر جینیوں کے فرقے درتوی کا پیروکار تھا۔(8) اسمتھ صحیح لکھتا ہے کہ اکبر کسی بھی حد تک بودھ مت کے اثرات کی زد میں نہیں آیا تھا۔ فتح پور سیکری میں جو مذہبی جلسے منعقد ہوتے تھے ان میں کوئی بھی بودھ راہب شریک نہیں ہوتا تھا۔(9) یہی وجہ ہے کہ بودھ مت کے بارے میں بادشاہ کی معلومات بہت محدود تھیں۔ دوسری طرف بہت سے جینی دربار میں آتے یا مختلف وقتوں میں وہاں رہتے تھے۔ یہ 1605-1578ء کا زمانہ تھا آئین اکبری کے آخری باب میں ابوالفضل نے اس زمانے کے علماء کی جو فہرست دی ہے ان میں جین درویشوں کے نام ہیں۔ پہلی قسم نمبر 16 پر ہریجی سور ہے جو ان لوگوں میں ہیں جنہیں دونوں دنیاؤں کی پراسراریت کا علم ہے۔ بجے سین سور نمبر 140 اور بھانو چند نمبر 140 ان لوگوں کی پانچویں قسم میں ہیں جو سند پر مشتمل سائنسی موضوعات کو سمجھتے تھے۔(10) یہ ہیراوجے سوری، وجے سین سوری اور بھانو چندراپادھیائے کا حوالہ دیتے ہیں۔ ہیراوجے سوری ٹپا گچا کا مہان اور وجے دن سوری کا چیلا تھا۔ اس نے 1566ء میں گرو کا منصب حاصل کرلیا تھا۔(11)

وہ جب کابل سے واپس آرہا تھا تب 1582ء میں اکبر نے اسے بلایا تھا۔ آگرہ میں تھان سنگھ کی سربراہی میں پوری جینی کمیونٹی نے سوری کی آمد کے موقع پر جشن برپا کیا تھا جس میں دوسرے بھی شریک تھے۔(12) اس جشن میں لوگوں نے درویش سوری کو خراج عقیدت

پیش کیا تھا۔(13) ہیراو جے سوری کے بارے میں سنسکرت ماخذ اور کتبات بہت سی تفصیلات بتاتے ہیں۔سوری سے ملاقات کے دوران بادشاہ نے جو تاثر لیا تھا اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بہت شان دار تھا، جب جین بزرگ نے قیامت، زندگی بعد قیامت، زندگی کی اذیت اور شخصی خدا کے تصور جیسے معاملات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔(14) اپنی تعریف کا اظہار اکبر نے اسے بہت سی مذہبی کتابیں پیش کر کے کی تھیں۔ بزرگ نے پہلے تو کتابیں لینے سے انکار کردیا مگر ابوالفضل اور تھان سنگھ کے کہنے پر کتابیں قبول کرلیں۔ان تمام کتابوں کو تھان سنگھ کی نگرانی میں قائم آگرہ کی لائبریری میں رکھا گیا تھا۔(15)

وی ایس 1639 / 83-1582ء کے پلیٹن مندر کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوری نے اکبر کو ایک حکم نامہ جاری کرنے کی ترغیب دی تھی جس کے ذریعہ چھ مہینوں تک کے لئے جانوروں کے ذبح کئے جانے کو ممنوع قرار دے، مرنے والوں کی جائیداد کو منسوخ کرنے کا قانون ختم کرے، بجوجیا اور سُلک ٹیکس ختم کرے، بہت سے قیدیوں کو آزاد کردے، جینیوں کے مقدس مقام سترونجا کو پیش کئے جانے والے شکار کئے گئے پرندوں اور جانوروں کا تحفظ کرے، ایک جین لائبریری قائم کرے اور شاہ سرینک کی طرح سادھو بن جائے جس نے لمپاکس میگھ جی کے سرکو تبدیل کردیا تھا، بہت سے لوگوں کو ٹاپاگچا کا چیلہ بنادیا تھا، گجرات میں بہت مندر بنوائے تھے، دوسرے علاقوں میں بھی مندر بنوائے تھے اور مالوہ کے بہت سے مقامیوں کو سترنجایاترا کے لئے تیار کیا تھا۔(16)

اکبر نے بھی 6 جون 1584ء کو ایک فرمان کے ذریعہ حکم جاری کیا کہ اس کے متعلقہ حکام جین پریوجن تہوار کے موقع پر بارہ دن تک جانوروں کو ذبح نہ ہونے دیں یعنی ان علاقوں میں جہاں جین رہا کرتے تھے۔(17)

دوسرے جین ماخذ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے اچاریہ کو جگت گرو کا لقب دیا تھا۔(18) اور اس کی تقریب میں پنجروں کے اندر بند پرندوں کو دامہ ندی کے کنارے آزاد کر کے اڑایا گیا تھا۔تاہم نہاتا کی ''یوگا پرادھن سری جے چندسوری'' میں ایک اقتباس دیا گیا ہے اور اس کا ذکر کھرترا گچا کے جے سوم اپادھیائے پراسوتر گرنتھ سے مستعار ہے جس کے مطابق بادشاہ نے ہیراو جے سوری کو جگت گرو کے لقب سے کبھی نہیں نوازا تھا۔(19) اس کا دعویٰ ہے

کہ اس کے عقیدت مندوں نے اسے اس لقب سے نوازا تھا جو اس کے چیلے تھے مگر ڈیسائی اپی گرافک اور ادبی شہادتوں کی بنیاد پر کہتا ہے کہ اکبر ہی نے اسے جگت گرو کے لقب سے نوازا تھا۔(20)

1535ء میں ہیراوجے سوری آگرہ سے گجرات چلا گیا تھا اور مغل دربار میں اپنے چیلے شانتی چندر کو چھوڑ گیا تھا۔ اپنی روانگی کے سمے ہیراسوری نے شانتی چندر کو اپادھیائے کے لقب سے نوازا تھا۔(21) شانتی چندر بادشاہ پر لکھے گئے کا مصنف بھی ہے۔ جو سنسکرت زبان میں لکھا گیا ہے اور اس کا نام ہے ''کرپ رس کوس'' یعنی (بادشاہ کے رحمیہ کاموں کا خزانہ)(22)۔ وہ اس کی ابیات کو بادشاہ کے سامنے پڑھ کر سنایا بھی کرتا تھا اور بادشاہ ان کے تقدس کا پورا پورا احترام کرتا تھا۔ شانتی جب 1578ء میں گجرات سے چلا تھا تو کہا گیا ہے کہ اکبر نے جانوروں کے ذبیحے اور جزیہ ٹیکس دونوں ممنوع قرار دے دیئے تھے۔ جانوروں کے ذبیحے کو سال میں چھ مہینوں کے لئے منع کیا گیا تھا۔ ان چھ مہینوں میں سابق بارہ دن بھی شامل تھے پریوسن کے آٹھ دن، نو روز کا دن اور تمام اتواریں شامل تھے۔ ان میں سوفین کے دن، عید، اس کے جنم دن جن کے مہینے الٰہی میہری تھے، رجب کا مہینہ اور اس کے بیٹوں کے جنم دن بھی شامل تھے۔(23) 6- آذر کو یعنی 35 الٰہی (6 نومبر 1590ء) اکبر نے ایک طویل فرمان جاری کیا تھا اس فرمان کی زبان ابوالفضل کے زورِ قلم کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس میں صلح کل کے لائحہ عمل کے تقاضوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس میں ہیر بیجائی سور سیورا (ہیر وجے سوری) کا بطور ایک قدآور درویش حوالہ بھی ہے جو دربار میں آیا تھا۔ فرمان تمام حکام کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ مع حاجی حبیب اللہ جینیوں کو شعوری طور پر خوشی سے برداشت کریں۔(24)

شانتی چندر کی جاوت کے بعد سوراچندر کے ایک چیلے بھانو چندر اکبر کے زمانہ حکمرانی کے ختم تک دربار میں موجود رہا تھا۔ وہ جہانگیر کی حکمرانی کے زمانے میں بھی دربار سے وابستہ تھا۔ دربار میں بھانو چندر کے قیام سے متعلق تفصیلات جینی سوانح کے کاموں میں ملتی ہیں جیسے ''بھانو چندر چتر'' جو اس کے چیلے سدھی چندر نے لکھی تھی۔ بھانو چندر کا لقب تھا پراجن (پنڈت) جو اسے ہیراوجے نے دیا تھا۔(25) دربار میں قیام کے دوران بھانو چندر نے اپنے علمی معیار سے سب کو متاثر کیا تھا۔ اس نے سورج کے ایک ہزار ناموں پر سنسکرت میں ایک

تفسیر لکھی تھی جس کا نام ہے "سوریا شاشتر نامہ۔" اس کے اکبر کوان کی معنوی افادیت سے آگاہ کیا تھا اور باقاعدہ ان ناموں کو سکھایا بھی تھا۔(26) دربار میں آتے ہی بادشاہ جو پہلا کام کرتا تھا وہ بھانو چندر کے لکھائے ہوئے سورج کے ہزار ناموں کو دہراتا تھا اور اس عمل میں بڑے خلوص کا مظاہرہ کرتا تھا۔

سیاسی اور مذہبی دائروں میں اکبر پر بھانو چندر کے اثرات کی حد کیا تھی اسے جاننے کے لئے ان واقعات کو دیکھنا چاہئے جو اس نے بیان کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ جام ستو جی ستر سال کے ہارنے کی خبر سن کر جو 1591ء کے دوران گجرات کا ایک زمیندار تھا اکبر نے بھانو چندر کو ایک پورن پتر قیمتی چیزوں سے بھرا ہوا ایک صندوق پیش کیا تھا۔(27) لیکن اچاریہ نے اس سے درخواست کی وہ قیمتی تحفہ واپس لے کر اس کے عوض قیدیوں کو آزاد کردے۔ اس درخواست کے نتیجے میں فرمان جاری کر دیا گیا تھا اور بھانو چندر کو پہنچا دیا گیا تھا جس نے فوراً اسے گجرات روانہ کر دیا تاکہ قیدیوں کو آزادی مل جائے۔(28)

سدھا چندر ہمیں بتاتا ہے کہ بھانو چندر کی یہ دلی خواہش تھی کہ لاہور شہر میں جین سادھوؤں کے لئے قیام کرنے کی کوئی جگہ ہو۔ ایک موقع پر جب اسے شاہی دربار میں پہنچنے میں دیر ہوگئی تھی تو بادشاہ نے اس سے دیر میں پہنچنے کی وجہ پوچھی تھی۔ بھانو چندر نے جواب میں بتایا کہ اس کا گھر بہت دور ہے۔ اس کے بعد بادشاہ نے جین کمیونٹی کو (لاہور قلعہ) میں زمین کا ایک ٹکڑا دے دیا تھا۔ یہاں ایک شاندار مندر بنوایا گیا تھا جس میں سادھوؤں کے رہنے کے لئے کمرے بھی بنوائے گئے تھے۔ جین تیرتھنکر کا ایک بت شانتی ناتھ اس مندر میں تھا۔

ایک اور موقع پر جب شہزادہ سلیم کے یہاں ایک بیٹی نے جنم لیا تھا۔(29) اکبر کو بتایا گیا تھا کہ جس سیارہ کے زیر اثر وہ پیدا ہوئی ہے اس کے اثرات شہزادے یعنی باپ کی صحت کے لئے براشگون ہے۔ اس کے لئے بھانو چندر نے استوستر۔ ست۔ سناتر کی رسم ادا کرنے کی تجویز دی تھی (یعنی جین مندر میں بت کو ایک سو آٹھ مرتبہ اشنان دیا جائے) جو مؤثر طریقے سے بدگھڑی کو بدل دے گی۔(30) اس رسم کو حسب روایت تھان سنگھ اور منتری کرم چند نے ادا کیا تھا۔(31) اکبر اور سلیم دونوں نے جین بت کے سامنے کھڑے ہوئے اور بھانو چندر سے بھکتا مار استوتر کی قرأت سنی تھی جو آدھی ناتھ جین تعریف میں مستونگ سوری کا بھجن تھا۔ (اس

کی شروعات لفظ بھکتامار سے ہوتی ہے) بھجن کی زبان سنسکرت تھی۔ بادشاہ نے سونے کی گڑدی سے کچھ اسنا ترا پانی لیا، اپنی آنکھوں سے ملا اور پھر اسے حرم بھیج دیا۔ اس کے بعد جتنے بھی لوگ وہاں موجود تھے ان کو سونے کی مہریں دیں اور جب اچاریہ نے بدگھڑی ٹل جانے کا اعلان کیا تب وہ محل کو واپس ہوا تھا۔(32) اکبر بھانو چندر کو اپادھیائے کا لقب دینا چاہتا تھا لیکن اسے بتایا گیا کہ لقب نواز نے کا حق صرف جین سنگھ کے سربراہ تک محدود ہے۔ اس کے بعد ابوالفضل نے ہیراوجے سوری کی جو رادھن پور کے ایک رہا کوتا پاگچا کا سربراہ تھا شاہی فرمان بھجوایا تھا۔ ہیراوجے نے فرمان کے مواد کی صحت کا ذکر کیا تھا اور بھانو چندر کو تقرری کا ایک خط اور مقدس بنا کر واساک سیپ بھیجا تھا۔ جس کی رو سے وہ اپادھیائے کا لقب رکھنے کا مجاز قرار دے دیا گیا تھا۔(33)

بعد میں 1592ء میں بھانو چندر کشمیر کے دوسرے دورے کے وقت اکبر کے ساتھ گیا تھا۔ یہاں اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ وہ ستر نجے پہاڑوں کو جانے والے میلے پر لگائے گئے ٹیکس ختم کر دے۔ اس کے لئے بھی ایک فرمان جاری کر دیا گیا تھا۔(34)

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جین رہنماؤں سے اکبر کی برابر ملتے رہنے کی خواہش میں کبھی کمی نہیں آئی تھی۔ ایک موقع پر اس نے ایک معروف جین درجانا سلائے سے یہ معلوم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ہیراوجے سوری نے کسے اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ایک مہان اور وجے سین سوری کا چناؤ کیا جا چکا ہے۔(35) یہ سن کر بادشاہ نے ایک فرمان جاری کیا کہ وجے سین سوری خود کو دربار میں پیش کرے۔ جین اچاریہ 31 مئی 1593ء کو دربار میں حاضر ہوا تھا۔ اس کے ساتھ سو چیلے تھے۔ ابوالفضل اور بھانو چندر نے اس کا سواگت کیا تھا۔ اس کا ایک چیلانندی وجے نے آٹھ اودھانا کی رسم ادا کی تھی۔ (اودھانا۔ ایک وقت میں آٹھ چیزوں کا طواف)۔ اس رسم سے بادشاہ بہت متاثر ہوا اور اس شخص کو ''خوش فہم'' کے لقب سے نوازا تھا۔(36) وجے سین سوری نے واکا کا بھانو چندر کے ساتھ کئی بار شاہی دربار میں حاضری دی تھی۔(37)

وجے پراساستی کاویا کے مطابق مغل دربار میں جین اچاریہ کو جو معزز مقام مل گیا تھا اس سے برہمنوں میں جذبہ حسد پیدا ہو گیا تھا۔ اسی لئے انہوں نے راجا رام داس (کچھ والا) کو

بھیجا تھا تا کہ وہ بادشاہ کو بتائے کہ جینی لوگ دہریئے ہوتے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ ایک مباحثے کا انتظام کیا جائے جس کا موضوع وجود باری تعالیٰ ہوگا۔ اس میں تمام علماء مع برہمنوں کو دعوت دی جائے۔ وجے سین سوری نے جین دھرم کی پوتھی کے حوالے سے بحث کے دوران ثابت کر دیا کہ الزام جھوٹا ہے اور شیوخ، برہمنوں، بادشاہ اور دوسروں کو پوری طرح مطمئن کر دیا کہ جینیوں کا تصور برہمنوں کے سمکھیا فلسفہ کی تشریحات کے عین مطابق ہے۔ اس کے بعد اسے سوائی ہیراوجے سوری کا لقب مل گیا تھا۔ (38) یعنی اپنے گرو ہیراوجے سوری سے چوتھا حصہ بڑا۔

ایک اور موقع پر وجے سین سوری نے بادشاہ یہ ماننے پر مجبور کر دیا تھا کہ گاؤ کشی کو ممنوع قرار دینا اور بے وارث مرنے والوں کی جائیداد کی منسوخی اور لڑائی میں جنگی قیدیوں پر حق جیسے قوانین کے خاتمے کی ضرورت ہے۔ یہ تفصیلات ایس وائی 1593 /1650ء یا 1594ء کے پلیتان کتبے میں مطابقت رکھتے تھے۔ (39)

اکبر کی خواہش تھی کہ وجے سین سوری لاہور میں رسم ادا کرے جو بھانو چندر کے لقب اپادھیائے کے اعتراف میں ادا کی جائے۔ اس موقع پر ابوالفضل نے چھ سو روپئے اور ایک سو آٹھ گھوڑے خیرات کئے تھے۔ (40) گجرات کے ایک جین کتبے میں یہ اضافی اطلاع ہے کہ اب وجے سین سوری کو اکبر کی طرف سے کالی سرسوتی کا لقب مل گیا تھا۔ وجے سین سوری 1595-964ء میں دربار سے روانہ ہوا تھا۔ (41)

اسی دوران ہیراوجے سوری نے اپنے دو سب سے بہترین چیلوں بھاؤ چندر اور سدھی چندر کو شاہی دربار میں بھیجا تھا۔ سدھی چندر سنسکرت اور فارسی کا عالم تھا اور اکبر پر اپنا گہرا تاثر قائم کر لیا تھا۔ اس نے ایک سو آٹھ اودھاناؤں کی رسم ادا کی تھی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اسے خوش فہم کا لقب دیا تھا۔ اس کے بعد وہ جہانگیر کے زمانہ اقتدار کے اواخر تک دربار میں رہا تھا۔ (43)

سدھی چندر نے اپنے استاد بھانو چندر اپادھیائے کی سوانح میں اکبر اور ابوالفضل کی خوبیوں اور نیکیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ بادشاہ کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ جواں سال اکبر ہر فن علم کے ہر شعبے، حوصلے کے ہر عمل اور قوت پر عبور رکھتا ہے۔ وہ اسے شلیہ کے بیٹے (رام) سے

مقابلہ کرتا ہے اور مزید مدعی ہے کہ اس کی سلطنت میں چوروں اور ڈاکوؤں کا نہ ہونا قابل توجہ بات ہے۔ اس کی شان و شوکت آسمان پر چمکتے ہوئے چاند جیسی ہے کیونکہ اس نے اپنے ہر دشمن کو زیر کر لیا تھا۔ اس کے مذہبی خلوص نے دوسرے چھ فلسفیانہ نظاموں کو انتہائی حد تک برداشت کرنے کی قوت کو کمزور نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ ہر قسم کے فنون میں دلچسپی لیتا تھا اور علم و آگہی کے ہر شعبے سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے تین بیٹے شیخو جی یا سلیم، بہادری یا مراد اور دانا ساہ یا دانیال تھے۔(43)

ابوالفضل کے بارے میں سدھی لکھتا ہے کہ اس قدرت نے آٹھ ذہنی خوبیاں عطا کی تھیں۔ وہ لوگوں کی بات سننے کی خواہش رکھتا تھا، بات سن کر دوبارہ تفتیش کرتا تھا، غور سے سنتا تھا، اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اپنے اظہار کو واضح کرتا تھا، دلائل کے ذریعہ شکوک کو دور کر دیتا تھا، اپنے ذہن میں کسی چیز کو قائم رکھتا تھا اور اس پر عمل کرتا تھا۔ اس ادب کے سمندر کو کھنگھالا تھا اور اس زمانے کے تمام علماء میں سب سے بہتر تھا فلسفے کے مختلف مکاتب جینیت، ممام سائیت، بودھ، وے سیسکائیت، کاروا کائیت، جیمیمیت، پاتانجلی، یوگا، ویدانت، ذخیرہ الفاظ و لغت، سُر سنگیت، ڈراما، فن خطابت، نجوم، سیاست، علم ریاضی اور جانوروں کی سائنس پر عبور رکھتا تھا۔ جس زمانے میں مراد مصیبت سے دوچار تھا اس کی خدمات کے اعتراف میں اکبر نے اسے ''تھمبھان'' کے لقب سے نوازا تھا یعنی (فوج کا ستون)۔(44)

1597ء میں جب اکبر تیسری بار کشمیر گیا تھا سدھی چندر اور بھانو چندر اس کے ساتھ تھے۔ بادشاہ جب ہرنوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا تو شدید زخمی ہو گیا تھا۔ ہرن کے سینگ کی نوک بادشاہ کے کولہے میں گھس گئی تھی۔ اس زمانے میں سوائے بھانو چندر اور ابوالفضل جن پر بادشاہ کو پورا اعتماد تھا کوئی دوسرا اس کے نزدیک نہیں رہتا تھا۔ اپنے صحت مند ہو جانے کے بعد بادشاہ نے جین سادھوؤں کے پڑاؤ کے مقام پر پانچ سو گائیں ان میں تقسیم کرنے کے لئے بھیجی تھیں۔(45)

بادشاہ نے ایک موقع پر بعض وجوہات کی بنا پر آگرہ میں چنتامنی پارا سوناتھ سے منسوب نئے جین مندر کی تعمیر کو روکنے کا حکم جاری کیا تھا۔ سدھی چندر نے اپنے شخصی اثرات سے کام لے کر اس حکم کو منسوخ کروالیا تھا اور بادشاہ سے دوبارہ منظوری حاصل کر کے مندر کی

تعمیر کے کام کو شروع کروادیا تھا۔(46)

اسی زمانے میں کھرتار گچا کے جینیوں نے سوراشٹر میں دمالا کال ٹیلے کے اندرونی علاقے میں مندر بنانا شروع کر دیا تھا۔ ٹاپا گچا کے حریفوں نے اختلافات کی بنا پر مندر بنانے کے حوالے سے اعتراض کیا تھا اور تاپا گچا کے بھانو چندر کی وساطت سے جو اکبر کے بہت قریب تھا بادشاہ کو اپنی عرض داشت پہنچائی تھی جس کے بعد بادشاہ نے مندر بنوانے کے عمل کو روکنے کے لئے فرمان جاری کر دیا تھا۔(47)

شترنجا میں مرزا خرم (مرزا عزیز کوکا کا بیٹا جو 1600ء/1009ھ میں سوراتھ کا فوجدار تھا) کی طرف سے مندر کو ڈھانے کا خطرہ تھا۔(48) سدھی چندر نے اکبر سے اپنے قریبی تعلقات اور اثرات کو استعمال کرتے ہوئے بادشاہ سے مندر کے تحفظ کے لئے ایک حکم حاصل کر لیا۔(49) وجے سین سوری پٹادھار (یعنی تاپا گچا کا سربراہ) نے جب سلیم گجرات میں اقتدار قائم کر لیا تھا اکبر پر موقع غنیمت جان کر اپنے اثرات سے کام لیا اور اس پر مختلف سامانتوں کو مقرر کر دیا۔(50) لگ بھگ یہ حوالے 1601ء کے ہیں جب سلیم نے بغاوت کر دی تھی اور ہوسکتا تھا کہ اس نے گجرات میں اپنے حکام کا تقرر بھی کیا ہو۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اکبر نے پہلے جو احکامات جانوروں کو ذبح کرنے اور یاترا ٹیکس کو ممنوع کرنے کے حوالے سے جاری کئے تھے ان کے بارے میں مشکلات پیدا ہوگئی تھیں۔ اب جانوروں کو ذبح کرنے اور یاترا ٹیکس ادا کرنے کا دوبارہ حکم لاگو ہو گیا تھا۔ ان حالات کے تحت وجے سین سوری نے بادشاہ سے ملاقات کی جس کے نتیجے میں 1601ء کا ایک جامع فرمان جاری کیا گیا تھا جس کے ذریعہ جینی فرقے کے حق میں جو احکامات پہلے جاری کئے گئے تھے ان کو قابل عمل اور مستند قرار دیا گیا تھا۔

شہزادے (دانیال) کے ایک نشان سے جو 25 اگست 1601ء کو صوبہ گجرات اور سورت سرکار کے حکام کو جاری کیا گیا تھا اور بادشاہ کے اول الذکر فرمان کی تعمیل میں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ پر دانیال کو کچھ اختیارات دیئے گئے تھے حالانکہ اس وقت مرزا عزیز کوکا صوبہ کا بااختیار گورنر تھا۔ شہزادے کے نشان میں فرمان کا ذکر بی جے سر سور سیورا کے حوالے سے ہوا ہے (یعنی وجے سین سوری) جو ہیر بجئے سور یعنی ہیر وجے سوری کا خلیفہ یعنی جانشین۔ اس میں

تمام حکام کو کہا گیا ہے کہ وہ جین مندروں کے تحفظ کو ممکن بنائیں۔اس نشان میں یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ حکام جین سنتوں و سادھوؤں کو بلا جواز الزامات کہ ان کی جادوئی رسموں کی وجہ سے برسات نہیں ہوئی اور جس کے نتیجے میں ان کے خلاف عوام کا ردعمل رونما ہوا ہے پوری طرح بچائیں۔(51)

اکبر پراتی بودھارس میں لکھا گیا ہے کہ 1591ء میں کرم چندر کے ذریعہ اکبر کو جین استاد جینا چندر سوری کے بارے میں معلومات ملیں جو کھاراتر اگچا کا سب سے بڑا اور محترم گرو تھا (یا پیر و مرشد)۔اکبر نے اس کو دربار میں آنے کی دعوت دی تھی۔ جینا چندر سوری اپنے اکتیس جینی سادھوؤں کے ساتھ 14 فروری 1592ء کو لاہور پہنچا تھا۔کرم چندر اس کی سواری لے کر دربار آیا تھا۔ یہاں بادشاہ نے اس سے درخواست کی تھی کہ جتنے بھی مذہبی مباحث منعقد ہوں ان سب میں وہ ضرور حصہ لے۔بادشاہ نے جس احترام کا مظاہرہ جینی استاد کے لئے کیا تھا اس سے متاثر ہو کر لوگ استاد کو ’’بڑے استاد‘‘ کے نام سے پکارنے لگے تھے۔(53)

ایک دن سوری کو معلوم ہوا کہ نورنگ خان دوارکا کے نزدیک مندروں کو ڈھانا چاہتا ہے چنانچہ اس نے بادشاہ سے درخواست کی تھی کہ تمام جین مندروں کے تحفظ کا اہتمام کیا جائے۔ اکبر پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے 1592ء میں ایک فرمان جاری کر کے سترونجے اور جینیوں کی دوسری مقدس جگہوں کو جینوں کے حوالے کر دیا تھا۔(54)

کشمیر کے اپنے دوسرے دورے پر روانگی سے پہلے اکبر نے دھرم لابھ (یعنی مذہبی آشیر واد لینا) کے لئے جینا چندر سوری کو بلایا تھا۔اس زمانے میں دربار کا اہتمام راجا رام داس کے باغ میں کیا گیا تھا۔اس میں شہزادہ سلیم، بہت سے دھرم وادی حکمراں، برہمن، علماء اور پنڈت بھی موجود تھے۔ جینا چندر اپنے چیلوں سمیت بھی اس دربار میں شریک ہوا تھا۔اس ایک چیلے سام یا سندر نے آستلاکشی کے متن کو پڑھ کر سنایا جو اسی کی تخلیق تھا اس نے تشریح کرتے ہوئے بادشاہ کو بتایا کہ تین سادہ سنسکرت لفظوں راجنو دادا تے سوکھیام پر مشتمل ایک چھوٹا سا جملہ ہے (معنی ہیں کہ صرف بادشاہ ہی خوشیاں عطا کرتے ہیں۔) اس کے معنوں کی آٹھ سو طریقوں سے تشریح کی جاسکتی ہے جبکہ کہ گرامر کے حوالے سے اس جملے کے دس لاکھ بائیس ہزار چار سو سات معنی نکلتے ہیں۔اکبر نے اس کے وسیع عالمانہ نظر کی تعریف کی۔(55) مان سنگھ،

ہرش ویلا اور اس کے دوسرے چیلوں نے اکبر کے ساتھ کشمیر یاترا کی تھی۔ وہ جب سری نگر پہنچا تھا تو اس نے ہر قسم کے جانداروں کے آٹھ دنوں تک تحفظ کا حکم دیا تھا۔ جیسے کہ مچھلیاں، سمایا سندر اور گناونائے کو اپادھیائے کا لقب دیا گیا تھا۔ اسی تسلسل میں اکبر نے جینا چندر سوری کو یوگا پردھان اور مان سنگھ کو اچاریہ کے القاب سے نوازا تھا۔ اس روز بھی مچھلیاں پکڑنے اور جانوروں کو ذبح کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔(56)

جینا چندر سوری کو جو فرمان 1592ء میں دیا گیا تھا کہیں کھو گیا تھا۔ اس کے حوالے سے اسی کے چیلے جن سمہا سوری (مان سنگھ) نے ایک عرضی اکبر کے حضور گذاری کہ فرمان کی نقل دی جائے۔ اکبر نے 1604-1603ء میں فوراً ایک فرمان جاری کیا تھا کہ بریوسن تہوار کے بارہ دنوں کے دوران نہ جانوروں کو ذبح کیا جائے اور نہ گوشت کا استعمال کیا جائے۔(57)

درج بالا شہادت کی بنیاد پر جس کے بعض حصوں میں بلاشبہ بہت مبالغہ بھی ہوا ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں ہی حلقوں تاپا اور کھارتر سے تعلق رکھنے والے اساتذہ کا دربار اکبری میں سواگت کیا گیا تھا اور ان کو سرپرستی دی گئی تھی۔ دربار میں وہ جین مت کے اصولوں اور طور طریقوں کی تشریحات کرتے تھے۔

ہوسکتا ہے کہ جین دھرم میں جانداروں کو نہ مارنے، تمام جانداروں کی محبت اور آتماؤں کے آواگون کا اعتقاد سے اکبر جین مت کی طرف مائل ہوا ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹے ہونے کے باوجود اکبر نے جین فرقے کو تحفظ دینے میں خصوصی دلچسپی لی تھی اور ان کے ساتھ تعلقات نبھانے میں اپنے اقتدار کے آخری پچیس برسوں کے دوران حدود سے تجاوز بھی کیا تھا۔ اسی لئے جینی تاریخ کی روایت نے اسے ایک ہمیشہ قائم رہنے والا اعزاز حاصل ہو گیا تھا۔

حوالہ جات

1- چمن لال دہیا بھائی دلال، ہیراوجے سوری یا اکبر کی عدالت میں جین حضرات۔ جین سوسان۔ بنارس۔ ایس۔ وائی 1910ء ص 128-113 وی۔ اے۔ اسمتھ۔ اکبر کے جینی اساتذہ بھنڈر کارس کھیموریشن والوم پونا 1917ء ص 276-265، کالی پد متر۔ جین انفلوینس اِن مغل کورٹ۔ پروسیڈنگز آف انڈین ہسٹری کانگریس 1939ء ص 1059-1071

2- دیوی وِمل گنی، ہیراساوٗبھاگیامہاکاویامرتب کے۔ پی۔ پراب، کاویامالانمبر 67۔ ممبئی 1900ء۔ جے سوم، کرم چندومسپر ابندھ کاویم ایڈیشن۔ جی۔ ایس۔ اوجھانیوریویو 58 بڑودہ 1939ء۔ سدھی چندر، بھانو چندر چیرترا ایڈیشن سیری موہن لال والی چند ڈیسائی۔ سنگھی جین سیریز 15 کولکتا 1941ء۔ دِن چندر سوری۔ اکبر پرتھی یودارس ایڈیشن 1 گھر چندنہات۔ اتہاسک جین کاویاسم گھرا ص 78-58 کولکتا 1944ء

3- جی۔ بوہلر، دی جین انسکرپشنس فرام سطر کے۔ اپی گرافیکا انڈیکا (II) ص 86-34 پورن چندنہر۔ جین انسکرپشنس (II) ص 142 نمبر 1628ء

4- اکبرنامہ ترجمہ بیورج III ص 365

5- مونیرولیمز، سنسکرت انگلش ڈکشنری ایس۔ وی۔ ابوالفضل، نو مکاتب کا مختصر مطالعہ کرتے ہوئے سیوتمبر کا بطور سیورا حوالہ دیتا ہے۔ تایاوے سیسیکا مماسا، ویدانت، سام کھیا، یاتانجل، جین، بودھ اور ناستک (آئین اکبری۔ ترجمہ جیرٹ III کولکتا 1918ء ص 143) وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مصنف دونوں کے احکامات سے باخبر ہے اور دگمبر وں کے اس کی تفصیلات لکھی ہوئی ہیں جیسا کہ تاریکی میں تھے لیکن سیوتمبر سے واقف ہونے

کی بنا پر جن کو سیورا بھی کہا جاتا ہے۔ص 222

6- منتخب التواریخ ترجمہ۔ڈبلو۔ایچ۔لو۔دہلی۔1973ء ص 265

7- ایضاً۔ایف۔این۔1

8- وی۔اے۔اسمتھ،اکبر۔دی گریٹ مغل۔دہلی 1962ء ص 189

9- ایضاً۔ص 116

10- آئین اکبری۔ترجمہ ایچ۔بلوچ مان (1) ص 606 اور 617

11- منیراج ودے وجے۔سریشورا پنے سمرات۔(بھاون گر۔ایس۔وائی۔1976ء (v) 22-83، 78-83، 94-98 اور 106-101۔

12- اسے سمہاد مالا نے جین بنالیا تھا وہ جین سادھو تھا۔بھانو چندر کاریتا۔ص 26

13- ایضاً۔

14- ایضاً۔ص 26 اور 27

15- ایضاً۔

16- لیگارڈ جیکوب،انسکرپشنس فرام پلیٹان۔جرنل آف دی بامبے برانچ آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی (II) ص 56-63

17- فرمان کے فارسی متن کے لئے دیکھئے سوریشور آپنے سمرات کا ضمیمہ ص 375-378۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھانو چندر حیرت ضمیمہ II ص 77-78۔فرمان ممبئی یونیورسٹی کے جرنل IX ص 9-10 پر بھی چھپا تھا۔سی۔ایف۔ایس۔اے۔آئی ترمذی۔مغل ڈاکومینٹس دہلی 1982ء ص 62 نمبر 68۔فرمان کی نقل کا انگریزی ترجمہ صوبہ مالوہ بھیجا گیا تھا جو جان مالکم نے میموائیرز آف سینٹرل انڈیا دوسرا ایڈیشن لندن 1824ء (II) ص 163-165 پر چھپا ہے۔

18- اسمتھ۔ص 267-268

19- یوگا پرادھن سری چندر سوری ص 103-104

20- بھانو چندر رویک ولاس ٹکا۔بیت 3 سی۔ایف بھانو چندر چرت۔ضمیمہ (1) ص 37

21- ایضاً۔ص 27

22- ایضاًباب I-V-127 ص 8
23- ہیراسو بھاگیہ مہا کویا باب 14 ابیات 274-273
24- موہن لال دلی چند ڈیسائی۔ جین ساہتیا نوسم کشپتا اتہاس۔ ص 545 کے سامنے کا متن۔
25- بھانو چندر چرت۔ ص 27
26- ہیرا نند ساستری۔ اکبر بطور سورج کا پجاری (''اکبر امیز سن ورشپر) دی انڈین ہسٹاریکل کواٹرلی۔ IX 1933 ص 138-137
27- بھانو چندر چرت۔ ص 30-29
28- ایم۔ایس۔ لکمس ساریات، اے ہسٹری آف گجرات (II)۔ دہلی 1957ء ص 34-233
29- رشابھا داس، ہیرا وجے سوری راس، سنن جو آنند کاویا مہو دھاری، وی۔ ورسیس 37-36 ص 182۔ یہاں تعمیر کے اخراجات بیس ہزار روپیہ بتایا گیا ہے۔
30- ہیراوجے سوری راس، ورسیس 44-38 سورس واراپنے سمرات ص 154
31- کرم چند بچاوت خاندان کا ایک لوسول بیناتھا۔ وہ راؤ کلیان سنگھ اور اس کے بعد بیکانیر کے رائے سنگھ کا منتری تھا گجرات کے الحاق کے بعد 1577ء میں ترسون خان نے سروہی کو لوٹا تھا اور تقریباً دھات کے بنے ہوئے ایک ہزار بت آگرہ اٹھالے گیا تھا۔ 1583ء میں جیسا کہ کہا گیا ہے منتری ان کو واپس لے آیا تھا۔ ان کو بیکانیر لایا گیا تھا جہاں ان کو چنتا منی کے مندر میں رکھا گیا تھا۔ بعد میں اس نے بیکانیر کی ملازمت چھوڑ دی تھی اور اسے اکبر کے دربار میں ملازمت مل گئی تھی۔ دیکھئے یوگا پرادھن سری جینا چندر سوری ص 239-213
32- ایضاً۔ ص 87-85 ہیراوجے سوری راس ص 183
33- بھانو چندر چتر ص 33۔ ہیراسو بھاگیہ کاویا ص 741۔ ورسیس 286-285
34- بھانو چندر چتر ص 34
35- درجنا سالیہ، لاہور کے جادیا گوتر کا اوسوال بنیا تھا۔ اس نے ساوری پور تیرتھ کے میلے میں ایک اجتماع کی قیادت کی تھی۔ یہاں اس نے مندر کی مرمت کروائی تھی اور جین بت

کوتقدس کی سند دی تھی وہ ہیرا سوری کا دیوانہ پیرو کار تھا۔ بھانو چندر چترص38

36- جہانگیر کے فرمان 1610ء اس کی صحت کا اندازہ ہو جاتا ہے یہ ایک جین کے حق میں جاری کیا گیا تھا۔ اسے (نند بجائی) کو خوش فہم کا لقب ملا تھا۔ ڈیسائی جین۔ ساہتیا نوسم کشپتاص553

37- بھانو چندر چترص 38 ہیرا سو بھاگیہ کاویا باب XIV ص 742-743 ویرسیس 287-290۔

38- بھانو چندر چترص10

39- جی۔ بوہلر۔ جین انسکرپشن فرام گجرات۔ اپی گرافیکا انڈیکا(II) ص54-53

40- جیناوجے، پراجین جین لیکھا سم گرھ (II) نمبر 454۔

41- جوہینس کلاٹ، ایکسٹریکٹس فرام ہسٹاریکل ریکارڈس آف جینز۔ انڈین اینٹی کویٹری XI(1882ء)ص256

42- بھانو چندر۔ص 41

43- ایضاً۔ص24-23

44- بھانو چندر باب اول۔ ویرسیس65-39اور67-66

45- دیکھیے حوالہ 44ایضاً ص42

46- ایضاً ص43اور ہیرا سو بھاگیہ کاویا باب XIV ویرسیس452

47- بھانو چندرص43

48- مراۃ الاحمدی۔ سید نواب علی ایڈیشن بڑودہ(1)1928ء ص183

49- بھانو چندرص46

50- ایضاً۔

51- ڈیسائی، جین ساہتیا نوسم شیات اتہاس کا متن جوص552 کی طرف ہے۔

52- اتہاسک جین کاویا سام گھرص138-135

53- یوگا پردھان سری جینا چندر سوری۔ص84-73۔ اتہاسک جین کاویاص78-58

54- اپی گرافیکا انڈیکا(1) ص37

55- یوگ پردھان سری چندر سوری ص 91، 95۔ کرم چندر منتری ومسا پربندھا۔ وریسیس 403-400

56- یوگ پردھان سری چندر جیناسوری ص 101-99

57- بھانو چندر چریتا ص 82-81۔ یوگا پردھان سری جیناچندر سوری ص 278

❁❁❁❁❁

شعبہ تاریخ عمومی، جامعہ کراچی

14- جنوری 2006ء کو اکبر کے عہد پر ایک کانفرنس

بعنوان

"اکبر اور اُس کا عہد"

کا اہتمام کررہا ہے۔

متعلقہ دانشوروں سے التماس ہے کہ وہ اپنے تحقیقی

مضامین کا خلاصہ 15- دسمبر 2005ء تک

شعبہ تاریخ عمومی کراچی یونیورسٹی

کو ارسال کردیں۔

اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں سائنس اور توہمات

علم فلکیات کے نظام کا مشاہدہ

شیریں موسوی

آسمانی دنیا میں رونما ہونے والے اتفاقی واقعات جیسے دم دار ستارے کا ظہور، ٹوٹ کر گرنے والے ستارے (شہاب ثاقب) سے نکلنے والی آگ کی لکیر اور چاند و سورج گہن وغیرہ پرانے زمانے میں سب ہی تہذیبوں کے لئے حیران کرنے اور خوف دلانے والے واقعات ہوا کرتے تھے۔ عام حالات میں روزانہ ہی تمام ستاروں کا ہجوم اور چاند وسیاروں کی باقاعدہ حرکت وغیرہ سے لوگ مانوس تھے لیکن جب کبھی ان میں کوئی بالکل ہی عجیب گڑبڑ دیکھنے میں آتی تھی تو لوگوں میں سخت تشویش کے ساتھ خوف کا بھی عنصر پیدا ہو جاتا تھا۔ عقل پسند لوگ تو یہ کوشش ضرور کرتے تھے کہ ان اتفاقی مظاہر کا مطالعہ دلائل کے ذریعہ کیا جائے۔ قدیم زمانوں میں بھی کچھ عقل پسندوں نے چاند اور سورج گرہن کے عمل کی وضاحت کی تھی۔ وقت کے ایک خاص تناظر میں اجرام فلکی کی پوزیشن کو براہ راست افراد کی تقدیر سے منسوب کیا جاتا تھا جس کی بنا پر علم نجوم اور نجومیت یا جوتشیت بہت پرانے زمانے ہی سے اکائی بنا کر ایک شعبہ قائم کر دیا گیا تھا۔ نادر واقعات کو خواہ وہ دیکھے جانے والے گرہن ہوں یا نہ دیکھے جانے والے بے قاعدہ واقعات جیسے دم دار ستارہ راہب اور جوتشی معنی پہناتے تھے جو کہ فطری رجحان بیان گیا تھا۔ ان معنوں کو لوگوں کی تقدیر، خودمختار حکمرانوں اور معمولی عام لوگوں پر منطبق کیا جاتا تھا۔ گرہن کے موضوع پر قابل برہم گپت نے وارا ہمیر سے تبادلہ خیالات کیا تھا تا کہ وہ سائنس

والوں کے مقابلے میں مذہبی راہبوں کے لئے حمایت حاصل کرے۔ یہ وہ تنازعہ تھا جس کو البیرونی نے اپنے دانشمندانہ تبصرے کے ذریعہ امر بنادیا تھا۔(1)

مغل شہنشاہوں نے حیرت ناک اور نامعلوم نجوم کے عوامل پر کس طرح ردعمل کا اظہار کیا تھا اس کا مطالعہ کوئی غیر اہم موضوع نہیں ہے۔ ہمیں یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ علم نجوم سے متعلق ان کے بنیادی مفروضوں کا ماخذ ارسطو اور بطلیموس تھے گو کہ کئی صدیاں بیت جانے کے بعد مشاہدات کی بنا پر بہت کچھ ورثے کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ مغلوں کے آباؤ اجداد الغ بیگ (پندرھویں صدی) نے ایک شاندار رصد گاہ بنائی تھی اور اعداد پر مشتمل ایک کتاب بھی چھوڑی تھی۔ جو ہندستان میں سوائے جے سنگھ (متوفی 1745ء) تک اعداد مرتب کرنے میں اپنے لوازمات کے حوالے سے بطور سند استعمال میں لائی جاتی تھی۔ مغل ماہرین نجوم اصطرلاب (ایک آلہ جس سے سمندر کو حوالہ بنا کر سورج چاند کی ناپ کی جاتی تھی)، سورج گھڑیاں یا شمسی گھڑیاں، سفید گلاسیز اور آبی گھڑیاں استعمال کرتے تھے۔ ان کے نتائج بڑی حد تک صحیح ہوتے تھے۔ ان میں سے کچھ آلات جہانگیر کی لائبریری میں محفوظ تصویروں کے ایک البم میں دیکھے جاسکتے ہیں۔(2) یونانی اور عرب ورثے کے ساتھ ساتھ مغل ہندستانی علم نجوم اور ریاضی کی روایت سے بھی واقف ہو گئے تھے۔ بھاسکر کی مشہور ہندستانی ریاضی پر نصابی کتاب ''لیلا وتی'' کا 1587ء میں فارسی ترجمہ مشہور شاعر فیضی کے جو ابوالفضل کا بھائی تھا اکبری دربار میں رہتے ہوئے کیا تھا۔ اس کا بڑا بھائی سرکاری مورخ کے منصب پر فائز تھا۔(3) نہ ہی وہ عرب روایات اور نہ ہی ہندستانی روایات توہمات سے عاری تھیں جن کو عموماً منطقی نقطہ نظر کا لباس اوڑھا دیا جاتا تھا۔ ان کے اثرات کا اظہار مغل شہنشاہوں اور درباریوں کے رویوں سے بھی ہوتا تھا یعنی اس وقت جب دم دار ستارے نکلتے تھے اور گرہن ہوتے تھے۔

اکبر اور جہانگیر کے زمانہ اقتدار میں ان کے بارے میں بیانات جو مغل تحریری سرمائے میں ملتے ہیں کیا تھے یہاں ان کا ذکر ہوگا۔ کیا جو مشاہدات قلم بند کئے گئے تھے ان کی کوئی سائنسی قدر و قیمت تھی؟ اس کا فیصلہ تو پیشہ ور ماہر نجوم ہی کریں گے لیکن یقیناً وہ ان عجوبوں پر جو ان کے چاروں طرف تھے مغلوں کے انداز نظر پر روشنی ضرور ڈالتے ہیں۔

دم دار ستارے اور شہاب ثاقب

ڈیڑھ سو برسوں کے دوران جو عظیم مغلوں کے زمانے 1707-1556ء پر محیط ہیں۔ تحریروں کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ سات مرتبہ دم دار ستارے آسمان پر ظاہر ہوئے تھے۔ اس اعتبار سے وہ قابل حوالہ ہیں کہ ان کو کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا تھا۔(4) ان میں سے 1577ء اور 1618ء میں نکلنے والے دم دار ستارے بتایا گیا ہے کہ اتنے روشن اور چمک دار تھے کہ ان کو دن کی روشنی میں دیکھا جا سکتا تھا۔(5) 1577ء کا دم دار ستارہ اتنا تھا کہ کیپلر نے بھی اس کا مشاہدہ کیا تھا اور یہ نوٹ کیا تھا کہ وہ تمام ستاروں میں وہی حیثیت رکھتا ہے یعنی اسی جگہ پر اتنا ہی بڑا دکھائی دیتا ہے خواہ اسے ارنی برگ سے دیکھا جائے یا چار سو میل دور جا کر پراگ سے دیکھا جائے۔ اس لئے کیپلر نے یہ نتیجہ نکالا کہ دم دار ستارہ چاند کے مقابلے میں زمین سے بہت فاصلے پر ہے۔ البتہ اس کا یہ دعویٰ کہ دم دار ستارے خط مستقیم میں حرکت کرتے ہیں بالکل غلط ہے۔(6) مغلوں کی تحریروں میں بھی ان دونوں دم دار ستاروں کا بیان ہوا ہے۔ دوسرے دم دار ستارے جن میں دوبار نکلنے والا ہیلے کا دم دار ستارہ بھی شامل ہے جو 1607ء اور پھر 1680ء میں نکلا تھا یا تو ان کو دیکھا ہی نہیں گیا تھا یا پھر ان کو اتنا اہم نہیں سمجھا گیا کہ اہم ہندستانی تاریخ کے بیانیوں میں اس کا ذکر شامل کیا جائے۔

1597ء میں اپنے مشاہدات قلمبند کرتے ہوئے عارف قندھاریؔ نے 1577ء میں نکلنے والے دم دار ستارے کا بیان لکھا ہے۔(7) اس موضوع پر ابوالفضلؔ کے دو تحریری بیانات ملتے ہیں۔ ایک بیان براہ راست مگر مختصر ہے جو اکبر نامہ کے ابتدائی مسودے میں شامل ہے۔(8) اور دوسرا مرتب اور زیادہ واضح ہے جو اکبر نامہ کے آخری مسودے میں شام ہے۔(9) اس کے معاصر بیانیہ نگار بدایونیؔ نے بھی دم دار ستارے کے دیکھے جانے کا ذکر کیا ہے۔(10)

عارفؔ لکھتے ہیں کہ جمعرات کی ایک رات 25 شعبان 985ھ (7 نومبر 1577ء) کو پورب کی سمت میں دکنی کی سمت کی طرف جھکتا ہوا ایک چمک دار ستارہ دیکھا گیا تھا جس کے اوپری دہانے سے لاتعداد چھوٹے چھوٹے ستارے باہر آئے تھے اور پورا منظر ایک سرو کے

درخت جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ منظر چار گھڑیوں (یعنی ایک گھنٹہ چھتیس منٹ) تک قائم رہا تھا جسے آگرہ، دہلی اور لاہور کے شہروں میں دیکھا گیا تھا۔ یہ دم دار ستارہ اسی سال شوال کے مہینے میں غائب ہوا تھا (12 دسمبر 1577ء۔9 جنوری 1578ء)۔ وہ بعد میں ''ستارۂ دم دراز'' کے نام سے لوگوں میں مشہور ہوا تھا۔(11)

دم دار ستارہ نکلنے پر دربار میں جو تشویش اور اعصابی بحران پیدا ہوا تھا عارف قندھاری نے اپنے بیانیے میں اس کا کوئی تاثر یا احوال نہیں دیا ہے۔ اس موقع پر اکبری دربار کے شاعر شعری نے جو نظم تخلیق کی تھی اس کی کچھ ابیات ضرور قندھاری نے قلمبند کی ہیں۔(12) اس نظم میں شاعر نے دم دار ستارے کو ایک شان دار جمالیاتی مظہر کہا ہے اور دنیا میں جو شان دار اور قیمتی چیزیں دکھائی دیتی ہیں ان سے اس کا موازنہ کیا ہے۔

عارف قندھاری نے اپنی تحریر کا سرنامہ اسی نظم کو بنایا ہے جو دم دار ستارے کے کسی برے یا شیطانی پہلو کا کوئی ذکر نہیں کرتی ہے البتہ یہ بیان ضرور دیتی ہے کہ اسی دم دار ستارے کے اثرات کی وجہ سے ایران کے شاہ اسمٰعیل کو جو شاہ طہماسپ کا بیٹا تھا 14 رمضان کو اسی برس (26 نومبر 1577ء) قتل کر دیا گیا تھا۔

ابوالفضل غالباً یا تو قندھاری کے کام سے واقف ہی نہیں تھا یا اس کو استعمال میں نہیں لایا تھا۔ اس کے پہلے مسودے کے مطابق نومبر 1577ء میں جب اکبر نئے محل میں بنائے جانے والے فوارے کا سنگ بنیاد رکھ رہا تھا۔ (نیا قلعہ فتح پور سیکری کے قریب مول منوہر نگر میں بنایا گیا تھا) کہ سورج ڈوبتے ہی پورب کی سمت میں ایک دم دار ستارہ نظر آیا جس کا جھکاؤ اتر کی طرف تھا۔ اور وہ صبح ہونے سے دو گھنٹے پہلے تک آسمان پر رہا تھا۔ اس حیرت زدہ کرنے والے واقعہ نے لوگوں کے دل دہلا دیئے تھے کیونکہ اس قسم کے اجنبی دم دار ستاروں کے نکلنے کو بہت ہی برا شگن سمجھا جاتا تھا۔ مورخ بدایونی حسب عادت اپنے برجستہ لکھنے کے اسلوب میں لکھتا ہے کہ چونکہ اکبر کا بدقماش وزیر مالیات شاہ منصور کے سر پر ایک لمبی دم والی پگڑی تھی اس لئے لوگوں نے اس کو دم دار ستارہ یا ستارہ دمبالہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ اسی زمانے میں ایران کے شاہ اسمٰعیل کو قتل کیا گیا تھا اس لئے ایران میں دم دار ستارے کی بدشگونی پر یقین کیا جانے لگا تھا۔

اکبر بادشاہ نے جو اس وقت مشکل سے پینتیس برس کا تھا اس مسئلے کو سنجیدگی سے لیا تھا۔ اکبر نامہ کے پہلے متن کے مطابق اس نے معروف وزیر راجا ٹوڈرمل کو ہدایت کی کہ وہ جوتشیوں کو اکٹھا کرے جو اس مسئلے پر تحقیق کریں اور اس کے نتائج پیش کریں۔ کافی احتیاط سے غور کرنے کے بعد جوتک رائے کی قیادت میں جوتشیوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس دم دار ستارے کا کوئی بد اثر ہندستان پر نہیں ہوگا۔(13) اپنے آخری متن میں (14) غالباً ابوالفضل کا خیال تھا کہ ایک خودمختار بادشاہ کی یہ تشویش اس کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے چنانچہ وہ مزید تفصیلات سے بچ کر زیادہ زور سائنسی انداز وضاحت پر دیتا ہے۔ وہ دم دار ستارے کے ظاہر ہونے کی صحیح تاریخ 25 آبان 22 الٰہی (7 نومبر 1577ء) بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ جب سورج پوری شان کے ساتھ برج عقرب میں تھا تب ستارے جیسا یہ آسمانی جسم پورب کی سمت میں برج عقرب کے اندر نمودار ہوا تھا اور اس کا جھکاؤ اتری سمت کی طرف تھا۔ اس کا سر چمکدار اور دم لمبی تھی۔ اس نے مزید بتایا ہے کہ بعض ملکوں میں وہ پانچ مہینوں تک دیکھا جاتا رہا تھا۔ جوتشیوں کی پیش گوئی تھی کہ ہندستان کے بعض حصوں میں غلہ کی کمی ہوگی۔ انہوں نے ایسے علاقوں کو بھی نشان زد کیا تھا جہاں کمی واقع ہوگی۔ ان بیانات کے بعد آگے جا کر ایسی تشریح بھی پیش کرتا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے ممدوح بادشاہ کی ساکھ کو تحفظ دیتا ہے اور مدعی ہے کہ یہ ظل الٰہی کا اپنا پاک و صاف وجود تھا کہ دم دار ستارے کا ہندستان پر کوئی برا اثر مرتب نہیں ہوا تھا۔

ان بیانات پر اکبر نامہ کے دونوں پہلا اور آخری مسودے متفق ہیں تاہم دم دار ستارے کے ایران پر تباہ کن اثرات مرتب ہوئے تھے اور دو خودمختار بادشاہ مر گئے تھے۔ ایک تھا طہماسپ اور دوسرا اسمٰعیل۔ ان دونوں کی موت کے درمیانی وقفے میں بہت خون بھی بہا تھا۔

اکبر نامہ کے آخری مسودے میں دم دار ستارے کے نکلنے کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابوالفضل نے دم دار ستاروں اور شہاب ثاقب کے بارے میں ان معلومات کو سمیٹ کر یکجا کیا جو اس وقت تک اس شعبہ علم کی حدود میں شامل ہو چکی تھیں۔ وہ ان مظاہر کو طبعی سائنسوں کی قلمرو سے منسوب کرتا ہے جس کے لئے وہ ''حکمت طبعی'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ ان موضوعات پر جو سرمایہ تحریر کے طور پر دستیاب ہے ابوالفضل اس کی بھی سند کو مانتا ہے۔ اس سرمائے میں یونانی تحریروں کے مجموعے اور بطلیموس کے کام شامل ہیں جو سورج اور

دم دار ستارے کے درمیان گیارہ نشانوں کی حدوں سے فاصلے کا تعین کرتے ہیں۔(15)
ابوالفضل کے نزدیک دم دار ستارے اور شہاب ثاقب کی بنیاد زمین (یعنی ارض) کو قرار دیتا ہے اور زمین کے عناصر پر سورج کی روشنی کا عمل ان کو پیدا کرتا ہے۔ سورج کرنوں میں جو ذرات جلتے ہیں وہ بہت زیادہ بے وزن ہو جاتے ہیں، فضا کی ہوا میں مل جاتے ہیں اور اوپر آسمان کی طرف چلے جاتے ہیں۔ ان منتشر ذرات کو بھاپ یا دھواں (دخان) کہتے ہیں اور یہی دھواں یا بھاپ کی وجہ سے بادل بنتے ہیں، برسات ہوتی ہے، طوفان آتے ہیں، گرج پیدا ہوتی ہے، بجلی چمکتی ہے اور اسی قسم کے مظاہر رونما ہوتے ہیں۔ یہی دبیز دھواں جب فضا کی بالائی تہوں میں پہنچتی ہیں جس میں آگ ملی ہوتی ہے تو وہ ہلکا ہو جاتا ہے جس کو شہاب ثاقب کہتے ہیں۔ پھر جب یہ نیچے زمین کی طرف آنا شروع ہوتا ہے تو اسے آسمان سے ٹوٹنے والا ستارہ کہا جاتا ہے جو محض لغو تصور ہے۔ دھواں اگر اپنی کثافت کی وجہ سے زیادہ بہتر نہیں ہو پاتا ہے تو وہ منتشر نہیں ہو پاتا ہے بلکہ جلنا شروع کر دیتا ہے اور ہمیں وہ دم دار ستارے کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔ دم دار ستارہ مختلف صورتیں بناتا ہے جو ایک دم دار چیز جیسی ہوتی ہیں، ان میں سے بالوں جیسی شعاعیں نکلتی ہیں کبھی اس کی صورت بھالے جیسی اور کبھی سنگین رکھنے والے سر جیسی ہو جاتی ہے۔ دم دار ستاروں کی موجودگی کا وقت کبھی کم تو کبھی زیادہ ہوتا ہے۔ ابوالفضل اس کے بعد دم دار ستاروں کے لئے ان کی شکل کے حوالے سے استعمال میں آنے والی اصطلاحات میں فرق کرتا ہے۔ ذوذوابہ بکھرے ہوئے بالوں جیسا ہوتا ہے (یعنی گیسو دار)۔ ذوذنب 1577ء میں ظاہر ہونے والے دم دار ستارے کے لئے استعمال کی ہے گو کہ اپنے کام کے پہلے مسودے میں اور اپنے معاصر بدایونی کے متن میں اصطلاح ذوذوآب استعمال کی تھی۔ ہندستانی جوتشی لکھتے ہیں کہ ابوالفضل نے سو سے زیادہ دم دار ستاروں کا ذکر کیا ہے۔(16) جبکہ یونانیوں نے صرف سات قسموں کا ذکر کیا تھا تاہم انہوں نے بھی ذوذنب اور ذوذابہ کو سب سے اہم قرار دیا ہے اور ان کو اعلیٰ تر روح سے منسوب کیا ہے۔ یونانیوں کے موقف کو دہراتے ہوئے اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ ذوذوآبہ صبح کے سمے پچھم کی طرف اور ذوذنب سورج ڈوبنے پر پورب کی طرف نکلتا ہے۔

ابوالفضل مزید لکھتے ہوئے مختصراً تین سابق زمانے میں نکلنے والے دم دار ستاروں کا ذکر

کرتا ہے جو 662ھ/1264ء میں نکلا تھا اسے چین اور وسطی ایشیا میں دیکھا گیا تھا۔ 803ھ/1400-1401ء میں نکلنے والے دم دار ستارے کو ایشیائے کوچک میں دیکھا گیا تھا۔ ان دونوں کو یورپ میں بھی دیکھا گیا تھا۔ دم دار ستاروں کی ان قسموں میں جو دن کے وقت بھی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ 837ھ/34-1433ء کے ایک اور دم دار ستارے کا بھی ذکر کرتا ہے جس کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ اس کے بڑے تباہ کن اثرات ظاہر ہوئے تھے۔ جب وہ ظاہر ہوا تھا تو دم دار تھا لیکن اس نے شکل بدل دی تھی اور بھالے جیسا ہو گیا تھا۔ یورپی تحریروں کے سرمائے میں اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی ہے۔

جہانگیر نے 1618ء کے دم دار ستارے کے بارے میں دلچسپ بیان قلمبند کیا ہے جو گہرے اور محتاط مشاہدے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اپنی ڈائری میں وہ لکھتا ہے کہ 18 آبان، 13 آر۔ وائی یعنی 3 نومبر 1618ء سے چند دن پہلے رات کو بہ وقت تین گھڑی یعنی ایک گھنٹہ بارہ منٹ تک صبح سے پہلے ایک چمک دار دھواں ظاہر ہوا تھا۔ ہر رات کو یہ ایک گھڑی یعنی چوبیس منٹ تک زیادہ بڑھتا تھا یا دیر تک نظر آتا تھا۔ پہلے اس کی شکل عصا جیسی تھی لیکن بعد میں اس کی شکل جیولن جیسی ہو گئی تھی جس کے دونوں سرے بہت پتلے تھے۔ بیچ کا حصہ موٹا تھا اور وہ درانتی کی طرح ٹیڑھا ہوتا تھا۔ اس کا پچھاڑا دکن کی سمت اور سامنے کا حصہ اتر کی طرف تھا۔ اس بیان کے لکھتے وقت غالباً 3 نومبر 1618ء یہ پورے ایک پہر یعنی رات کے چوتھائی حصہ تک دکھائی دیا اور صبح ہوتے ہوئے غائب ہو گیا جوتشیوں نے اپنے علم کے ذریعہ حساب لگایا کہ وہ مختلف وقتوں میں آسمان کے اطراف چوبیس ڈگری میں ابھرا تھا۔ (17) دم دار ستارہ آسمان کی حرکت کے ساتھ حرکت کرتا تھا (ارسطوئی اور بطلیموسی نظریہ کہ آسمان گھومتا ہے) لیکن اس کی اپنی بھی حرکت تھی اور یہ حرکت برج عقرب میں تھی جہاں سے وہ برج میزان میں گیا تھا۔ اول الذکر تاریخ سے سولہ دن بعد یعنی 3 نومبر کے سولہ دن کے بعد وہ مدہم ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ پر ایک ستارہ نظر آنے لگا تھا جس کی دم دو سے تین گز تک لمبی تھی لیکن دم میں چمک نہیں تھی۔ جہانگیر نے مزید لکھا ہے کہ آٹھ راتوں تک دم دار ستارے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنے مشاہدات تحریر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ وہ دم دار ستارے کے غائب ہونے اور اس کے اثرات کے بارے میں بھی لکھے گا مگر اس نے بعد میں یہ تفصیلات قلمبند نہیں کی تھیں۔

جہانگیر نے جس انداز میں دم دار ستارے کا بیان قلمبند کیا ہے اس میں توہمات کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جوتشی حضرات نے اپنی کتابوں میں اس قسم کے دم دار ستارے کو حرباً لکھا ہے اور یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اس کا نکلنا عرب حکمرانوں کی کمزوری اور ان کے دشمنوں کی ان پر فتح کی نشاندہی کرتا ہے۔(18) معتمد خان نے اگرچہ دم دار ستارے کے بارے میں تقریباً وہی کچھ لکھا ہے تاہم اس نے ستارے کے بداثرات بھی بیان کئے ہیں۔ اس کی وجہ سے طاعون کی وبا کا طوفان برپا ہوا۔ اس نے خرم (شاہ جہاں) کی بغاوت 1622ء کو بھی اسی ستارے کے اثر سے منسوب کیا ہے اور لکھتے ہوئے آخر میں بتاتا ہے کہ بہت خون بہا تھا اور دم دار ستارے کے نکلنے کے بعد اس کے بداثرات سے کوئی گھر بچ نہیں سکا تھا۔(19)

شہاب ثاقب کے گرنے کے موضوع پر صرف ایک مفصل بیانیہ ملتا ہے۔ اس کا راوی خود جہانگیر ہے۔ وہ قلمبند کرتا ہے کہ جلوس کے سولہویں برس 1030ھ ربیع الثانی یعنی 19 اپریل 1621ء پرگنہ جالندھر کے ایک دیہات میں ایک خوفناک واقع ہوا اور پچھم کی طرف بہت دل خراش شور وغل اور چیخیں سنائی دینے لگیں۔ دیہات کے لوگ بری طرح ہل گئے تھے اور سخت خوف ان پر سوار ہو گیا تھا۔ آسمان سے آگ کا ایک شعلہ زمین پر اس طرح گرا جیسے آسمان سے آگ کی برسات ہو رہی ہے۔(20) جب لوگوں کے ہوش وحواس بحال ہوئے تو ایک تیز رفتار پیغام رساں کو علاقے کے عامل کے پاس بھیجا گیا تھا۔ (عامل سے مراد ٹیکس جمع کرنے والا)۔ محمد سعید تیزی کے ساتھ علاقہ کی طرف گیا تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر دیکھا تھا کہ تقریباً دس سے بارہ گز تک زمین کا حصہ جل گیا تھا اور اتنا جلا تھا کہ اس حصے پر کوئی پیڑ پودا تک نہیں باقی رہ گیا تھا۔ زمین کا یہ حصہ پیغام رساں کے پہنچنے تک گرم تھی۔ اس نے زمین کے اس حصے کی کھدائی کروائی کھدائی جتنی گہری ہوتی جاتی تھی زمین کی گرمی بھی زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ آخر میں ایک دہکتا ہوا سرخ لوہے کا ٹکڑا ملا جو اتنا گرم تھا جیسے کسی آگ کے گولے سے ٹوٹ کر نکلا ہو۔ کچھ وقت بیت جانے کے بعد وہ ٹھنڈا ہوا تو اسے ایک سربمہر ڈبے میں بند کر کے بادشاہ کو بھیجا گیا تھا۔ معائینے کے بعد جہانگیر نے اس کا وزن ایک سو ساٹھ تولہ یعنی چار اعشاریہ چوبیس پاونڈ بتایا تھا۔ اس نے لوہے کے ٹکڑے کو اپنے ایک لوہار (آہن گر) داؤد کو دیا اور کہا اس سے ایک

تلوار ایک برچھا اور ایک چھری بنائے۔لوہار نے بادشاہ کو بتایا کہ لوہا بہت بھربھرا ہے اور اگر اس پر ہتھوڑا چلایا گیا تو یہ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جائے گا۔بادشاہ نے لوہار کو حکم دیا کہ اس لوہے کے ساتھ عام لوہے کو ملایا جائے۔اس کے بعد شہاب ثاقب کے لوہے (آہن برق) کے تیسرے حصے کو ایک حصہ عام لوہے سے ملا کر دو تلواریں، ایک برچھا اور ایک چھری بنائی گئی تھیں۔ جہانگیر نے بتایا کہ یہ تلواریں یمنی اور دکنی تلواروں کے معیار ہی کی طرح بہترین ہیں اور وہ اتنی لچک دار ہیں کہ اگر ان کو موڑ کر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنی اصل جگہ پر آ جاتی ہے۔اس نے اپنی موجودگی میں ان کو پرکھا اور ان کو بہترین تلواروں ہی جیسی پائیں۔اس نے ان میں سے ایک تلوار کو ''شمشیر قطع'' کا نام دیا تھا جبکہ دوسری تلوار کے لئے ''برق سرشت'' کی ترکیب استعمال کی تھی۔ان کی تعریف میں ایک درباری شاعر نے قطعہ بھی کہا تھا اور زور اس بات پر دیا تھا کہ ان تلواروں کا تعلق آسمانی دنیا سے تھا۔اس قطعے میں شاعر نے تاریخ بھی نکالی تھی جس کا مصرعہ تھا ''شعلہ برقِ بادشاہی۔'' (21)

اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ شہاب ثاقب گرنے کے واقعہ کا بیان جہانگیر نے تعقل کی بنیاد پر کیا تھا۔اپنے بیان میں اس نے کہا ہے کہ یہ ایک آمیزہ (Siderite) تھا جس میں دھاتوں کے ساتھ زیادہ حصہ لوہے اور نکل کا ملا ہوا تھا۔یہ پتھر (Aerolite) نہیں تھا۔چونکہ وہ ایک چھوٹا ٹکڑا تھا جس کا وزن تین اعشاریہ تین پونڈ تھا چنانچہ جس طاقت سے وہ زمین پر گرا ہوگا وہ زیادہ نہیں ہوگی۔

گرہن

یہ تعجب کی بات ہے کہ چھپن سورج گرہنوں میں سے (جن میں انتالیس اکبر کے زمانہ اقتدار میں اور سترہ جہانگیر کے زمانہ اقتدار میں رونما ہوئے تھے) (22) اکبر کے زمانے کا ایک سورج گرہن اور جہانگیر کے زمانے کے دو سورج گرہن ہی تحریروں میں ملتے ہیں۔ابوالفضل نے اگر صرف 1590ء کے ایک گرہن کے بارے میں بیان کو ترجیح دی تو اس کی وجہ جوتشیوں کی یہ پیش گوئی کہ یہ ایک مکمل گرہن ہوگا۔

ابوالفضل نے 1590ء کے گرہن کے دو بیانات قلمبند کئے ہیں جو اس کے اکبر نامہ کے

پہلے اور آخری دونوں مسودوں میں ملتا ہے۔ پہلے مسودے میں جلوس کے پینتیسویں برس (1590ء) کو بیان کرتا ہے۔اس میں کوئی حتمی تاریخ کا ذکر نہیں ہے بلکہ وہ اسے دو واقعات کے درمیان بتاریخ ہفتہ 7 جولائی اور ہفتہ 15 ستمبر 1590ء لکھتا ہے۔(23) مطبوعہ متن کے آخری نسخہ میں تاریخ 23 اور داد 35 الٰہی کا حوالہ ہے۔(24) لیکن 23 یقیناً غلط ہے کیونکہ 8 امرداد جب فارسی میں ہشت لکھا جائے تو اسے آسانی کے ساتھ غلطی سے بست پڑھا جائے گا۔ 8 امرداد اگر صحیح ہے تو اس کا عیسوی متبادل 31 جولائی 1590ء ہوتا ہے جو کہ ہندستان میں رونما ہونے والے سورج گرہن کی صحیح تاریخ تھی اور جس کا ایل۔آرچ کی ٹیبل میں بیورج نے حوالہ دیا ہے۔(25) آر۔سچرام بھی اس گرہن 21 جولائی 1590ء لکھتا ہے جو گریگورین کیلنڈر کے مطابق 31 جولائی ہوگی۔(26)

دم دار ستاروں کے نکلنے اور شہاب ثاقب کے گرنے کے برعکس گرہنوں کے بارے میں ان واقع ہونے سے بہت پہلے ان کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔جیسا کہ البیرونی نے لکھا ہے کہ قدیم زمانوں سے ہندستانی جوتشی گرہن کے نظام سے خوب واقف تھے جن کے ساتھ اب بہت سی دیو مالائیں اور بہت توہمات عام ہو گئے ہیں۔(27) ہندستانیوں میں سورج گرہن کو خواہ وہ مکمل یا جزوی براشگون سمجھا جاتا تھا اور اب بھی سمجھا جاتا ہے۔اکبر بھی جو عقلی طرز فکر و عمل پر بہت یقین رکھتا تھا گرہن کے بارے میں توہمات کا شکار ہوا تھا۔

اکبرنامہ کے پہلے مسودے کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر سورج گرہن کی پیش گوئی کے بعد اس کے بداثرات کے حوالے سے کافی پریشان تھا کیونکہ یہ اعتقاد تھا کہ اگر گرہن کے وقت بادل سورج کو ڈھانپ لیں تو گرہن کے بداثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ بادشاہ نے برہمنوں کو بلا کر ان سے کہا کہ وہ اپنی ان رسومات کو ادا کریں جن کے ذریعہ گرہن کے وقت بادل آکر سورج کو ڈھانپ لیں۔ برہمنوں نے رسومات ادا کیں۔مگر کامیاب نہیں ہوئے اور اپنی ہار مان لی۔گرہن میں صرف ایک گھڑی یعنی 12 منٹ ہی رہ گئے تھے اور آسمان بالکل صاف تھا۔اب بادشاہ خود نماز کے لئے کھڑا ہو گیا اور دعائیں مانگیں۔وہ کامیاب ہوا۔آسمان پر بادل جمع ہو گئے اور انہوں نے گرہن کے وقت سورج کو ڈھانپ لیا اور بارش بھی ہوئی۔ بادلوں کے باوجود سورج کی چمک دکھائی دے رہی تھی جو یہ بتاتی تھی کہ سورج گرہن جزوی ہے

مکمل نہیں ہے۔ مورخوں نے اپنے بیان میں یہ جوتشیوں کی شرمندگی پر پردہ ڈالتے ہوئے ان کی پیش گوئی پر کہ مکمل گرہن ہوگا توجہ نہیں دی کیونکہ گرہن جو ہوا تھا جزوی تھا۔

چونکہ یہ خیال کرنا کہ بہت مشکل ہے کہ اکبر کے جوتشی یہ نہیں جانتے تھے کہ مدار قمر کے نزدیک ہونے کی وجہ سے پیش گوئی کیا جانے والا گرہن مکمل نہیں بلکہ جزوی ہوگا اور چاند کے چاروں طرف سورج کا دائرہ رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ روشنی توقع سے اتنی زیادہ ہوگئی تھی جس کی بنا پر لاہور میں گرہن جزوی نظر آیا تھا۔ اس مقام یعنی لاہور کی پیش گوئی کی غلطی کی وجہ لاہور کے طول البلد کے تعین میں غلطی تھا۔ جس کے بارے میں ابوالفضل خود بتاتا ہے کہ دہلی کے تناسب سے لاہور کے طول البلد کے تعین میں غلطی 4° 6° تھی۔ (28) اس زمانے میں طول البلد کا حساب کرنا ہر صورت میں بے حد مشکل تھا اور حساب کے نتیجے میں غلطی باقی رہ جاتی تھی۔

اپنے اکبرنامہ کے آخری مسودے کو ابوالفضل نے زیادہ احتیاط کے ساتھ مرتب کیا تھا اور اس میں اس نے اکبر کی شخصیت کو بروقار انداز میں نمایاں کیا ہے۔ اس کے بیان میں وہ کہتا ہے کہ بادشاہ نے برہمنوں کو نہ بلوایا تھا اور نہ ان کو کوئی حکم دیا تھا۔ برہمن خود ہی آئے تھے اور اپنی مرضی سے پوجا پاٹ کی خصوصی رسم ادا کی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بادشاہ جو منطقی استدلال پر یقین رکھتا ہو اور روایت شکنی اس کا شعار رہا ہو توہمات پر اس طرح یقین کا اظہار کرے۔ (29)

جہاں تک گرہنوں کا معاملہ تھا تو اس کے حوالے سے توہم پرستی کا اتنا طاقتور رجحان عام تھا کہ جہانگیر بھی اس سے نہ بچ سکا تھا۔ جس کی شہادت اس بیان سے ملتی ہے جو اس نے اپنی یادداشتوں میں قلمبند کیا ہے۔ اس نے دو سورج گرہنوں اور ایک چاند گرہن کا ذکر کیا ہے۔ (30) ان میں ایک کی تاریخ اس نے 28 رمضان 1024ھ (14 دسمبر 1610ء) اور دوسرے کی اتوار 9 ربیع الاول 1024ھ (8- اپریل 1615ء) بتائی ہے۔ پہلی تاریخ سچرآم کی دی گئی تاریخ 5 دسمبر 1610ء سے قریب تر ہے۔ (بہ حوالہ جولیان کیلنڈر) لیکن دوسری تاریخ بالکل صحیح تاریخ سے زیادہ قریب تر ہے۔ نہم یعنی نو اگر پڑھتے ہوئے غلطی سے سیام یعنی تین پڑھا گیا ہو چونکہ سچرآم کے مطابق سورج گرہن 19 مارچ 1615ء (جولیان) کو ہوا جو 29

مارچ گریگورین کے برابر ہے اور دن بھی اتوار نکلتا ہے۔ جہانگیر نے بھی دن یعنی اتوار صحیح قلمبند کیا ہے البتہ اس کی ہجری تاریخ تین دن غلط تھی۔

10 دسمبر 1610ء کے سورج گرہن کے بارے میں جہانگیر نے کوئی تفصیلات نہیں لکھی ہیں سوائے کہ یہ بتایا ہے کہ اس کے بداثرات کو زائل کرنے کے لئے اس نے قیمتی ہیروں و جواہرات کے ذریعہ اپنا وزن کروایا تھا اور ان ہیروں و جواہرات کو دوسری چیزوں کے ساتھ جن میں جانور جیسے کہ گھوڑے ہاتھی اور بیل شامل تھے آگرہ اور دوسری جگہوں پر بطور صدقہ تقسیم کروائے تھے۔(31) مارچ 1615ء کے موقع پر ہونے والے گرہن کے حوالے سے اس نے زیادہ توجہ دی ہے کیونکہ وہ پورا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ گرہن بارہ گھڑی (4 گھنٹہ 48 منٹ) بعد صبح ہوا تھا۔ اس کی شروعات پورب سے ہوئی تھی۔ گرہن کی مقدار اتنی تھی کہ سورج چار بٹے پانچ حصہ چھپ گیا تھا (جیسا کہ آگرہ میں دیکھا گیا تھا) گرہن آٹھ گھڑی (3 گھنٹے بارہ منٹ) تک رہا تھا۔ اس بار بھی قیمتی دھاتیں، جانور اور اناج ضرورت مندوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔(32) چاند گرہن جس کا ذکر ہوا ہے مکمل تھا اور ہفتہ 13 شوال 1018ھ (20 جنوری 1609ء) کو ہوا تھا۔ اس کی شروعات چار گھڑی (ایک گھنٹہ چھتیس منٹ) تک رہی تھی۔ چاند پر مرحلہ وار سایہ بڑھا تھا۔ گرہن پانچ گھڑی تک رہا تھا (یعنی 2 گھنٹے) رات میں۔ اس موقع پر بھی جہانگیر نے اپنا وزن سونے، چاندی، کپڑوں اور اناج سے کروایا تھا اور ان چیزوں کے ساتھ دوسری چیزوں، جانوروں اور پندرہ ہزار روپیہ ضرورت مندوں میں تقسیم کیا تھا تا کہ گرہن کے یہ اثرات زائل ہو جائیں۔(33)

نجوم کے نظام کے بارے میں مغل تاریخی سرمائے کے بیان کا ابتدائی مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی معلومات اگرچہ جدید سائنسی معلومات کسی حد تک بھی قریب ہوں تو بھی علم نجوم کی تاریخ اور روایت میں اس کی اپنی اہمیت اور افادیت ضرور ہے۔ فکری ترقی کے لئے مورخ کے بقول سائنس اور توہم کے درمیان بیاہ جو علم نجوم اور علم جوتش کے اتحاد سے ظاہر ہوتا ہے (الکیمیا اور کیمیا کے درمیان تقابل) ہمیشہ ہی ایک دلچسپ موضوع رہے گا۔ ہمیں یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ استدلال اور توہم کے درمیان جدوجہد کوئی سادہ یا براہ راست عمل نہیں ہے۔

حوالہ جات

1- البیرونیز انڈیا۔ ترجمہ ای۔سی۔سخاؤ، لندن (II) 1910ء ص 107-114

2- جہانگیر کے البم میں ایک ورق کے حاشئے سے نقل جو لیوبور ہاجک کی کتاب ''انڈین منی ایچرس آف دی مغل اسکول، 1960ء'' پراگ پلیٹ میں شامل ہے۔

3- سی۔ ایف۔ اسٹوری، پرشین لٹریچر (II) حصہ (1) 1972ء لندن ص 4-5

4- جارج۔ ایف چیمبرس، دی اسٹوری آف دی کامٹس، 1910ء آکسفورڈ ص 37۔ ان کے نکلنے کے سال 1556، 1577، 1607، 1618، 1661، 1680 اور 1689 تھے۔

5- ایضاً ص 8

6- ایضاً ص 48۔ اس کی شہادت ہے کہ یورپ میں کافی وقت تک یہ دم دار ستارہ دیکھا جاتا رہا تھا اور اسی لئے کیپلر نے مختلف مقامات پر جا کر اس کا مشاہدہ کیا تھا۔

7- تاریخ اکبری مرتب معین الدین ندوی، اظہر علی دہلوی اور امتیاز علی عرشی۔ رام پور 1962ء ص 231-232

8- برٹش لائبریری۔ ایم۔ ایس۔ ایڈ 27، 247، الیف 291 اے اینڈ بی۔

9- اکبر نامہ III مرتب احمد علی۔ کولکتا۔ 1987ء ص 222-224

10- عبدالقادر بدایونی۔ منتخب التواریخ (II) مرتب احمد علی اور ڈبلو۔ این۔ لیز کولکتا 1864ء، ص 240-241 اس میں تاریخ 984ھ (1576-1577ء) ہے۔

11- عارف قندھاری۔ ص 231-232

12- ابوالفضل نے اکبری دربار کے شاعروں کی فہرست میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ آئین

اکبری (I) ص 162

13- ایک جوتشی کو جوتک رائے کا لقب دیا گیا تھا جس کا حوالہ اکبر نامہ میں دو جگہوں پر دیا گیا ہے۔ ایک جب اسے بگلان کے سردار ایک پیغام پہنچانے کے لئے بھیجا گیا تھا (اکبر نامہ III ص 30) اور دوم جب اس سے کہا گیا تھا کہ راجدھانی میں بادشاہ کے داخل ہونے کی شبھ گھڑی معلوم کرے۔ ایضاً ص 38

14- اکبر نامہ III ص 224-222

15- بطلیموس نے دم دار ستاروں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ سی۔ ایل۔ پور، دی سولر سسٹم لندن 1908ء ص 273۔ دم دار ستاروں کے موضوع پر عربی کتاب اندرات العوائب جس کا لاطینی زبان میں بھی ترجمہ ہوا ہے مستند نہیں ہے۔ کارموڈی نے بھی اپنی بحث میں یہی رائے دی ہے۔ مزید دیکھئے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ دوسرا ایڈیشن (1) ص 1101۔

16- البیرونی کہتا ہے کہ ہندستانی دانشوروں کے مابین دم دار ستاروں کی تعداد پر اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ تعداد ایک سو ایک ہے جبکہ دوسرے ایک ہزار کہتے ہیں۔ ایڈورڈ۔ سی۔ ساچو۔ البیرونیس انڈیا (II) لندن 1910ء ص 236

17- 1618ء کے کامٹ کے لئے لکھا گیا ہے کہ اس کی دم میں تھرتھراہٹ تھی۔ اسٹوری آف کامیٹس ص 25

18- توزک جہانگیری مرتبہ سیود احمد، غازی پور اور علی گڑھ 1864-1863ء ص 250

19- معتمد خان، اقبال نامہ جہانگیری۔ جلد 3 نولکشور پریس لکھنو 1870ء ص 552

20- ایسا نظر آتا ہے بیان کرنے والے اتنے خوف زدہ تھے کہ انہوں نے واقعات کی ترتیب الٹ دی اور بتایا کہ آواز پہلے آئی اور روشنی بعد میں نظر آئی تھی۔

21- توزک جہانگیری ص 328-327 ایک سو ساٹھ تولے کو ایک تولہ برابر ایک سو پچاسی اعشاریہ پانچ گرینوں کے پیمانے پر تبدیل کیا گیا تھا جو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مُتی سمجھا گیا تھا۔ عرفان حبیب۔ ایگریرین سسٹم آف مغل انڈیا، ممبئی 1913ء ص 367

22- ان کا حساب آلہ سچرام کی ٹیبل سے لگایا گیا ہے جو ہندوستان میں نظر آنے والے سورج گرہن کی ٹیبل تھی اور جو آر۔ سیویل کی کتاب "دی انڈین کیلنڈر۔ لندن 1896ء

ص125-126 میں شامل ہے۔

23- ایڈ۔27،247۔ایف387بی۔

24- اکبرنامہIII ص579

25- اکبرنامہIII ترجمہ ایچ بیورج انڈین ری پرنٹ 1993ء ص877

26- آر۔سیول۔دی انڈین کیلنڈر۔ٹیبل اے ص125

27- البیرونی،البیرونیز انڈیا(II) ص107-114

28- سی۔ایف۔عرفان حبیب۔کارٹوگرافی اِن مغل انڈیا،میڈیول انڈیا۔اے مسیلینی (1) ص132

29- آئین اکبریII مرتبہ بلوچ مان،کولکتا،1867ء ص217

30- توزک ص77-176اور138

31- ایضاً ص88

32- ایضاً۔ص138

33- توزک۔ص77-76 یہ واضح نہیں ہے کہ جہانگیر کی پانچ گھڑی صرف مکمل گرہن کا احاطہ کرتی ہے کیونکہ اس صورت میں یہ زیادہ سے زیادہ ممکن وقت 1 گھنٹہ 43 منٹ سے تجاوز کر جائے گی یا اس میں جزوی گرہن کی مدت بھی شامل ہے۔جو تقریباً دو گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔جہانگیر نے رات کی چھوٹی گھڑیاں (ہر 22 منٹ اور چوبیس سیکنڈ کی) استعمال کی ہوں گی۔سی۔ایف۔عبدالحامد لاہوری۔پادشاہ نامہ۔ببلوگرافیکا انڈیکا۔کولکتا۔72۔1866ء(II) ص337-339 جس میں گرین کی مدت کا مسئلہ جیسا اس نے حساب لگایا تھا ایک گھنٹہ اور باون منٹ ہے۔

❁❁❁❁❁

ابوالفضل کی آئین اکبری میں سائنسی تصورات

اقبال غنی خان

اکبر کے کردار کے بارے میں بعض یورپی اور مقامی بیانیوں سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا سائنس وٹیکنالوجی سے تعلق سرسری نہیں بلکہ خاصا گہرا تھا۔ اس کے وزیر اور ترجمان ابوالفضل نے اپنی کتاب آئین اکبری میں اس موضوع پر کئی ابواب وقف کئے ہیں۔ آئین پیدائشِ فلزات کے عنوان سے باب میں تمام مادوں کے چار عناصر کی ارسطوئی تھیوری اور قدرتی عمل کا ذکر شامل ہے۔ ارسطو کا دعویٰ ہے کہ تمام دنیاوی معمولات چار عناصر سے بنتے ہیں یعنی آگ (آتش)، ہوا، زمین (ارض) اور پانی (آب)۔ آگ، ہوا، زمین اور پانی نہیں ہیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں بلکہ بنیادی مادے کے مختلف پہلو بھی ہیں جن کو وہ ''پروٹائیل'' کہتا ہے۔ پروٹائیل کا ہر پہلو مختلف خواص اور قوی صورتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس کا اظہار چار بنیادی خواص گرمی، نمی، ٹھنڈک اور خشکی سے ہوتا ہے۔ یہ خواص اپنی مفرد صورت میں نہیں ہوتے ہیں بلکہ جوڑوں میں ہوتے ہیں جیسے ہوا جو گرم اور نم ہوتی ہے، آگ گرم اور خشک ہوتی ہے، زمین ٹھنڈی اور خشک ہوتی ہے اور پانی ٹھنڈا اور نم ہوتا ہے۔ (1)

ارسطو نے مزید قدرت میں پائے جانے والے گردشی آہنگ (ردِم) کی بھی تشریح کی جیسے کہ تبخیریت، برسات، برف اور سیلاب جس کے لئے اس نے خشک اور نم دھوئیں کے تصور کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً زمین کے حصے گرم ہو کر ہوا میں مل جاتے ہیں اور خشک دھواں بناتے ہیں (ابوالفضل نے لفظ دخان استعمال کیا ہے)۔ یہ خشک دھواں نم دھوئیں کے ساتھ مل جاتا ہے اور زمین کے ٹکروں میں عمل کے بعد معدنیات اور دھاتوں کی کانوں کو جنم دیتا ہے۔ (2)

اسلام کے ابتدائی زمانے (800ء) میں یونان کے سائنسی کام ترجموں کے ذریعہ پہنچے تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب علوم حاصل کرنے اور کسی صاحب سند پر تنقید کو مذہب دشمنی تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ ارسطو کے خیالات پر مسلمان علماء نے تنقیدی بحث کے بعد اس کے خیالات میں تبدیلیاں پیدا کر کے ان سے استفادہ کیا تھا۔ جن صورتوں میں یہ خیالات قرونِ وسطیٰ کے ہندستان میں پہنچے تھے ان کا انعکاس ''آئینِ پیدائش فلزات'' میں ہوا ہے۔(3) اس طرح ابوالفضل لکھتا ہے کہ حق نے مختلف صورتوں میں خود کو ظاہر کیا ہے (جیسے کہ چار بنیادی عنصر آگ، پانی، ہوا اور دھرتی)۔ آگ گرم وخشک اور نسبتاً ہلکی ہوتی ہے۔ ہوا نسبتاً گرم اور ہلکی ہوتی ہے، پانی ٹھنڈا اور وزنی ہوتا ہے اور دھرتی ٹھنڈی، خشک اور سب سے زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ گرمی ہلکا پن پیدا کرتی ہے۔ نمی بھاری پن کو جنم دیتی ہے۔ پانی آسانی کے ساتھ کسی بھی چیز کو علیحدہ کر سکتا ہے جبکہ خشکی تقسیم کے عمل کو روکتی ہے۔ اس حیرت ناک انداز میں چار عناصر خود بطور قدرتی مظاہر پیش کرتے ہیں (اسرار علویہ یعنی برسات، برف اور بجلی کی چمک)۔ قدرت کے اظہار کی دوسری صورت پتھر ہیں، تیسری صورت پیڑ پودے اور چوتھی جانور ہیں۔(4) ابوالفضل بیان جاری رکھتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ ارسطو نے خشک اور نم دھوئیں کا جو ذکر کیا ہے وہ دخان اور بخار ہیں۔ (فارسی میں دخان کے معنی ہیں بھاپ اور بخار کے معنی ہیں پانی سے اٹھنے والے بخارات) یہ دونوں ہی زمین کی فضا میں مل کر برسات، برف اور طوفان وغیرہ پیدا کرتے ہیں۔ زمین کی سطح کے نیچے خشک اور نم دھواں مل کر بھونچال، آگ کا طوفان اور دھاتیں پیدا کرتے ہیں۔(5) یہ کہا جا سکتا ہے کہ ارسطوئی نظریئے کے مقابلے میں ابوالفضل کے عناصر، ان کے خواص اور ساتھ ساتھ اس کی اصطلاحات زیادہ جامع اور ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھنے والی ہیں۔ مزید یہ کہ وہ چینی ثنویت کو بھی ساتھ ملاتا ہے (اپنے جابری روپ میں۔ جابری= جابر بن حیان)۔ جب وہ گندھک اور پارے تمام معدنیات اور دھاتوں کے بننے کی اینٹیں کہتا ہے۔ اس حوالے سے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ خشک اور نم بخارات مختلف طریقوں سے مل کر گندھک اور پارے کی دھاتیں پیدا کرتے ہیں۔ پارے اور گندھک کی یہ قسمیں مل کر پانچ قسم کی معدنیات اور سات دھاتیں بناتی ہیں۔

ان بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابوالفضل الکیمیا کے معتقدات کو مانتا ہے۔ وہ لکھتا ہے

کہ گوکہ گندھک اور پارہ سات دھاتوں کا ساختیاتی حصہ ہوتے ہیں ان کی خالصیت سے یا آمیزے کے خصوصی حالات یا ساختیاتی حصوں کے ایک دوسرے پر عمل کی مختلف قسموں سے ان دھاتوں کی مزید مختلف قسمیں بنتی ہیں۔اس طرح جب کسی بھی دو ساختیاتی حصوں کو زمینی ذرات کے ساتھ نہ ملایا جائے تو چاندی بنتی ہے۔ جب وہ خالص اور پوری طرح جڑی ہوئی ہوتی ہیں اور جب گندھک کی مقدار کم اور اس کا رنگ سفید ہوتا ہے تو پارہ بنتا ہے۔ جب دونوں کی مقدار کا تناسب برابر ہو، گندھک کا رنگ سرخ ہو اور وہ رنگ ظاہر کرے تو سونا بنے گا۔(6) اس موضوع پر مزید لکھتے ہوئے وہ ساتوں دھاتوں کے بننے کی جن کا ذکر وہ پہلے کر چکا ہے اسی طرح تفصیلات قلمبند کرتا ہے۔ البتہ اپنے اس موضوع کو تمام کرتے ہوئے وہ تھوڑا سا اپنے موقف سے پیچھے آیا ہے جب اس نے ایک دھات کے دوسری دھات میں تبدیل ہونے کا بیان لکھا ہے الکیمیا کے موقف پر عمل کرنے والے اہل صنعت کے خیالات سے معاملہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ کچے کی حالت میں ٹین چاندی ہوتا ہے اور جستہ کچا سونا ہوتا ہے اور الکیمیا کے ماہرین طبیبوں کی طرح ان کا علاج کر کے ان کو ان کی اصل حالت پر واپس لا سکتے ہیں۔ اس کے لئے وہ اختلاف اور مماثلت کے طریقوں کو استعمال کرتے ہیں۔(7)

ابوالفضل کا اپنا عملی مزاج دھاتی جست کی کس طرح درجہ بندی کی جائے کے بارے میں زیادہ سنجیدہ تھا جس کو زاور (اودے پور کے نزدیک) سے کھود کر الگ کر کے نکالا گیا تھا مگر جس کا کوئی حوالہ ''نامہ حکمت'' یعنی علوم و سائنس کی کتابوں میں کہیں نہیں ملتا تھا۔(8) اس کا ابوالفضل نے اس نکالی گئی دھات کا ذکر اس کے مقامی نام جست سے کیا اور اس کے لئے جست کے اوکسائیڈ کی فارسی اصطلاح ''روح توتیا'' استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد بھرت میں اس کے استعمالات جیسے کہ پیتل (کال پتر) اور سم سوختہ کی تفصیلات بتا کر اس کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

دھاتوں کی درجہ بندی

معدنیات کے ماخذ کو بیان کرنے کے بعد وہ ان کی درجہ بندی کے لئے بھی سخت کوشش کرتا ہے۔ ایک طرف تو ابوالفضل ارسطو کے اصولوں خشکی، نمی، گرمی اور ٹھنڈک کا استعمال کرتا

ہے اور کثافت اضافی کے ان کے خاکوں سے کام لیتا ہے۔(9)

معدنیات کی درجہ بندی عرب کیمیا دانوں کی دلچسپی کا اہم موضوع تھا جیسے کہ جابر ابن حیان ذکریا الرازی اور ابو سینا۔ ان کی کوششوں نے سائنسی طریقہ کار اور کیمیا کی ترقی میں زیادہ بہتر دھاتوں کی قسمیں حاصل کرنے کی خواہش نے البیرونی کو مزید آگے جانے پر مجبور کیا اور اس نے ایسے موڑ سے کام شروع کیا جس پر کہ آرشمیڈیش نے اپنے کام کا خاتمہ کیا تھا۔ البیرونی نے معدنیات کی بہت زیادہ قسموں کثافت خصوصی اور اضافی کثافت کی ایک صحیح اور طویل ٹیبل مرتب کی۔

اس کی صحت اور اطلاق کے کاروباری استعمال کا خیال ابوالفضل کے ذہن میں پیدا ہوا تھا اور اس نے ایک پورا باب موضوع کے عنوان ''ہر چیز کے بھاری پن اور ہلکے پن'' کے لئے وقف کیا۔ اس باب کی نظری (تھیوریٹیکل) بنیاد جو بہت سے خاکوں سے بھرا ہوا ہے، خاصی آسان ہے۔ ابوالفضل کے بقول باوجود بڑی جسامت کے بعض اشیاء دوسروں کے مقابلے میں ہلکی ہوتی ہیں اور اس کی وجہ خشک اور نم دھوئیں یا بخارات کا نامکمل ملاپ ہوتی ہے۔ ایسے جسم کے مابین جگہوں کے اندر ہوا داخل ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ جسامت میں تو زیادہ ہوتے ہیں لیکن ان چیزوں کے مقابلے میں جن کا ملاپ مکمل ہوتا ہے ہلکی ہوتی ہیں۔

بین الاشیاء جگہ اور ایٹمیت کے مقام (جب وہ کسی خاص جسم ذرات (اجزا) کے درمیان ہوا داخل ہونے کی بات کرتا ہے)، ابوالفضل کی علمی صلاحیت کی ایک مثال ہے نئی تھیوری کو مان لینے کی بشرطیکہ وہ اس کے اپنے عقلی دلائل سے تجاوز نہ کرتی ہو۔(10)

کثافت خصوصی یا کثافت اضافی کی طرف واپس آتے ہوئے ابوالفضل ایک شعری اشارتی لغت کو نقل کرتا ہے (جس کے ذریعہ بہت کم وقت میں حسابی جواب حاصل کئے جا سکتے ہیں) اس کے ذریعہ پڑھنے والے پارے، ملے ہوئے جست (برانز)، ٹین، سونا، سیسہ، پیتل، تانبا اور چاندی اضافی اوزان ذہن میں محفوظ کر سکتا ہے، دونوں صورتوں میں لین بطور اعداد اور ابجد میں (حرف کے اوزان کے دیئے ہوئے اعداد کے حوالوں سے)۔

وہ زمانہ حاضر کے ایک آلے ایلن میئر فلاسک (اعلیٰ المخروطیہ) سے ملتے جلتے آلے کا بیان کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ کوئی بھی پانی کی اضافی مقداروں کو جو مختلف چیزوں کے برابر

اوزان ہٹاتے ہیں ان کی پیمائش کرسکتا ہے۔آئین میں بہت سی قسموں کے ترازوؤں کا بھی بیان ملتا ہے۔(11) ابوالفضل اضافی اوزان کی تفصیلی ٹیبلوں اور سونے، چاندی، جواہرات، قیمتی پتھروں اور ملے ہوئی دھاتوں جیسی اشیاء کے وزن کی کمی پر اپنے باب کو تمام کرتا ہے۔(12)

اس نظریئے کو جو اہمیت دی گئی تھی اور اضافی اوزان معلوم کرنے کے مختلف طریقوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محض عقلی سند تک محدود نہیں تھا بلکہ اس حقیقت سے بھی آگاہ کرتا ہے کہ بہت سے امراء قیمتی دھاتوں اور ہیرے جواہرات کی خرید وفروخت میں دلچسپی رکھتے تھے اس لئے ان کو کسی ایسے مستند پیمانے کی ضرورت تھی جس کے ذریعہ وہ اپنی اشیاء کی اصلیت کی نقلی اشیاء کے مقابلے میں پہچان کرسکیں۔(13)

اتنی مفصل اور صحیح ٹیبلز کی موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندستانی سائنس طریقہ کار کے ذریعہ تعین کرنے اور اس کی صحت سے محروم نہیں تھی۔ اصل میں حساب کے ذریعہ قدر کو متعین کے سوال پر دلچسپ بات یہ ہے کہ کس طرح ابوالفضل اپنے باب دھاتوں کے ماخذ کو دھاتوں کے کیمیائی ملاپ یعنی دھاتوں میں دوسری اشیاء ملا کر ایک نئی دھات بنانے کے ذیلی باب سے مربوط کرتا ہے۔ مثلاً سفید روئی (یا سفید کانسی کے بارے میں بیان قلمبند کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس بھرت (Alloy) کو ہندی میں کانسی کہا جاتا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس میں چار حصے تانبا اور ایک حصہ ٹین ملا ہوا ہوتا ہے۔ ایک اور کانسی آٹھ حصے تانبے اور تین حصے سیسے کے ملاپ پر مشتمل ہوتا ہے جس کو فارسی روئی اور ہندی میں بھنگار کہتے ہیں۔(14) پیتل بنانے میں تانبے اور جست کی تین مختلف مقداروں کا تعین کیا گیا ہے یعنی تانبا بہتر فی صد، تانبا سٹرسٹھ فی صد اور تانبا اٹھاون فی صد۔(15) زیادہ پے چیدہ بھرت ڈھاتوں کے بنانے کے لئے جیسے کہ تین سے آٹھ تک ان کے حصہ دار دھاتوں کے لئے مقداریں متعین تھیں۔ پہلے دو عناصر کے بھرت جیسے سادہ کا ذکر ہوا ہے اور جب ایک بار ان کے عناصر کے اوزانی تناسب مقرر ہو گئے تو ان کو مزید بڑے دھاتوں کے پے چیدہ بھرت بنانے کے لئے ملاتے تھے جیسے ''ہفت جوش'' اور ''اشت دھات''۔

ٹیکنالوجی سے اکبر کو خود جو لگاؤ تھا اس کے نتیجے میں بادشاہ نے دو حصے سفید کانسی اور ایک حصہ تانبے کو ملا کر ایک بھرت دھات دریافت کی تھی جو بھر بھری اور خوبصورت تھی۔(16) اس کا

ذکر صرف ابوالفضل ہی نے نہیں بلکہ کئی معاصر عیسائی لیکھکوں نے بھی کیا ہے۔(17)
(جے سوئٹس Jesuits= رومن کیتھولک عیسائی)

آوازوں پر

اکبر کو سائنس کے موضوعات پر بحثوں کا بہت شوق تھا۔ آئین اکبری میں آوازوں کی حرکت اور رنگوں پر بحثوں کی دلچسپ تفصیلات ملتی ہیں گو کہ ان میں سے بیشتر بیانات میں صحت کا خیال نہیں رکھا گیا ہے بلکہ براہ راست بیان میں بے ترتیبی بھی شامل ہو گئی ہے مثلاً آواز کے موضوع کا بیان خطاطی کے باب میں ملتا ہے۔ ابوالفضل نے اصل میں حروف تہجی بیان کرتے ہوئے آواز کو حروف کی آواز (صوتیات) سے منسلک کیا ہے۔ یہاں وہ ان نظریات پر توجہ دیتا ہے جن کو تعقل پسند خفیہ برادری اخوان الصناء اور ابن سینا نے بڑھاوا دیا تھا۔ اس حوالے سے ابوالفضل لکھتا ہے کہ کسی سخت چیز کو سخت چیز سے ٹکرانے یا توڑنے پر آواز نکلتی ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں ان چیزوں کے درمیان موجود ہوا موجوں کی طرح حرکت شروع کر دیتی ہے اور اس طرح وہ حالت جسے آواز کہا جاتا ہے پیدا ہوتی ہے۔(18)

غور کیجئے کہ آواز کی ترسیل کے حوالے سے ایٹم اور موج کا جو نظریہ ہے ابوالفضل نے اس کا بیان بہت واضح اور غیر مبہم انداز میں کیا ہے۔ آواز میں تبدیلی کے اثرات سے متعلق وہ مزید معلومات آگے چل کر بیان کرتا ہے مگر ہم جگہ کی تنگی کی بنا پر ان تفصیلات کو قلمبند نہیں کریں گے۔

رنگوں پر

خطاطی اور مصوری کے باب سے پہلے کے باب میں ابوالفضل نے بنیادی رنگوں اور کس طرح ان کے ذریعہ مختلف رنگوں کے روپ پیدا کئے جا سکتے ہیں کے بارے میں مختصر بیان قلمبند کیا ہے۔ دھنک پر ارسطو کے مفروضات کو سر بلند کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ تمام رنگوں کا ماخذ سیاہ اور سفید رنگ ہیں۔ ان کو وہ انتہا اور رنگوں کے حصوں کا لازمی عضو کہتا ہے۔ سفید رنگ کے ساتھ زیادہ مقدار میں اگر تھوڑے سے سیاہ رنگ کو ملایا جائے تو پیلا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ برابر

کے مقدار میں جب سفید اور سیاہ رنگوں کو ملایا جائے تو سرخ اور سفید رنگ میں بہت زیادہ سیاہ ملانے پر ہرا رنگ پیدا ہوگا۔ ان ہی بنیادی دو رنگوں کو مختلف تناسب میں ملا کر دوسرے رنگ حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ ساتھ یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے ٹھنڈک ایک نم جسم کو سفید اور خشک چیز کو سیاہ بناتی ہے۔ گرمی نم چیز کو سیاہ اور خشک چیز کو سفید کر دیتی ہے۔ یہ دو پہلو (گرمی اور ٹھنڈک) اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک چیز کے رنگوں میں تبدیلی قالب پر بھی اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور آسمانی اجسام پر بھی (خصوصاً سورج)۔(19) رنگوں کے جس نظریئے کا ذکر آئین اکبری میں ہوا ہے مثال ہے۔

اس انداز کی جس طرح کہ ارسطوئی نظریات سائنسی معتقدات کے ہند اسلامی نظام میں جڑ گئے ہیں۔ ہمیں اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ ابن ہیثم (1010-965ء) جیسے دانشور کی تحقیقی تحریروں کو جن کا موضوع روشنی اور رنگ ہے اور جن کو کتاب المناظر میں پیش کیا گیا ہے ابوالفضل نے کیوں نظر انداز کر دیا تھا۔ حقیقت کے تناظر میں الہیثم جو کر رہا تھا وہ ان معنوں میں انقلابی تھا کہ اس نے روشنی کے عوامل کے مطالعے میں تجربوں اور آلات کو متعارف کرایا تھا۔ غالباً اس کے خیالات حکمراں اقتدار کے لئے زیادہ خطرناک تھے چنانچہ اسے بغداد سے بھاگنا پڑا تھا اور اس نے زیادہ قوت برداشت رکھنے والے قاہرہ کے ایوبی حکمرانوں کے یہاں پناہ لینا پڑی تھی۔ اسلامی تہذیب میں سائنس کو جس بڑے المیئے سے گذرنا پڑا وہ بعد میں آنے والے ماہرین علم نور اور طبیعات الہیثم کے متعارف کرائے گئے طریقہ کار کی روایت سے جڑت برقرار رکھنے میں ناکامی تھی۔(20) اصل میں قرون وسطی کے ہندستان سائنسی سرمائے کا جائزہ رنگوں کے موضوع پر صرف ایک متن پیش کرتا ہے اور جو غالباً قطب الدین شیرازی کی شرح مناظر کی ایک جلد ہے۔(21)

الہیثم نے جو کچھ بھی کہا تھا اسے گو کہ البیرونی نے بھی نظر انداز کر دیا تھا (شاید اس لئے کہ دونوں معاصر تھے اور البیرونی کو الہیثم کی تحریروں کا کوئی علم نہیں تھا۔) مگر ارسطو کے پیروکاروں کے لئے اس کے مشورے سے ابوالفضل کو بہت فائدہ ہوا۔ البیرونی نے کہا تھا کہ ان لوگوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ارسطو کے خیالات پر مبالغے کی حد تک چلتے تھے اور اس کے ہی تمام خیالات کو حرف آخر تصور کرتے تھے۔ ان کو اس کا بھی یقین تھا کہ ارسطو کے خیالات میں غلطی کا

کوئی امکان نہیں تھا گو کہ انہیں معلوم تھا کہ وہ ایک بڑا مفکر تھا لیکن ان دانشوروں میں نہیں تھا جو غلطی نہ کرتے ہوں۔(22)

آئین اکبری میں مختلف قسموں کے سونے کی اصلیت دریافت کرنے پر بھی ایک باب ہے۔شاہی سکے سازی کا بیان کرتے ہوئے ابوالفضل سونے، چاندی اور تانبے کے زمین سے علیحدہ کئے جانے کا بھی ذکر کرتا ہے۔ان کو کس طرح کچرے سے الگ کر کے صاف کیا جاتا ہے اس کا بھی اس نے بیان لکھا ہے اور پھر کس طرح سکہ ساز ماہر اس کے معیاری درجے بناتے ہیں۔دھات سازی (Metallurcy) کے علاوہ ابوالفضل کیمیائی ٹیکنالوجی کی قلمرو میں پہنچتا ہے جب وہ خوشبویات کی کشید کی تشریح کرتا ہے، صابن بنانے، پوٹاشیم نائیٹریٹ کے ذریعہ پانی کو ٹھنڈا کرنے، کاغذ سازی اور حتیٰ کہ الکوہل کی کشید کے بارے میں لکھتا ہے۔(24)

ٹیکنالوجی کے دوسرے شعبوں پر بھی آئین اکبری میں ابواب موجود ہیں جیسے کہ دھاتوں سے توپیں بنانے کی مہارت، ہاتھ سے چلائی جانے والی بندوقیں بنانا، ایک ہی وقت میں سوار بیرل کی بندوق صاف کرنے اور چکنانے کے طریقے اور ایسی صنعت جو چلتی ہوئی گاڑیوں میں گیہوں پیستی تھیں۔(25)

نظریات کا جن کی تجزیہ کاری کی گئی ہے ان کے علاوہ آئین اکبری میں جانوروں کی سائنس اور فطرت کی تاریخ، ادویات و ادویات سازی، طبعی اور ریاضیاتی جغرافیہ پر بھی مطالعات شامل ہیں جن میں خطی حد تک طول البلد اور عرض البلد کی ناپ کرنے کا بیان ہوا ہے اور اس کے ذریعہ زمین کا گھیراؤ معلوم کیا گیا ہے۔ایک اور اہم مسئلہ شمسی سالوں کا صحیح کیلنڈر بنایا تھا جس کا متبادل طریقہ الٰہی کیلنڈر بنا کر دریافت کیا گیا تھا۔بجائے خود سائنس کا ایک پے چیدہ باب ہے۔

ابوالفضل نے ہندو سائنس کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔آئین اکبری کا آخری حصہ اس نے ہندو سائنس کے لئے وقف کیا ہے۔اس حصہ میں بطلیموسی اور ہندستانی جغرافیہ کا موضوع بھی شامل ہے۔

آخر میں ہمیں خود اکبر کو داد دینا چاہئے جس نے ابوالفضل اور فتح اللہ شیرازی جیسے ذہین دانشوروں کی سرپرستی اور ہمت افزائی کی تھی۔انہوں نے اکبر کو ترغیب دی جس کو نانتے ہوئے

بادشاہ نے اسکولوں کے نصاب میں سائنسی موضوعات اور زیادہ ٹیکنالوجی کی کارکردگی کو شامل کیا۔(26) یہی نہیں بلکہ بادشاہ نے سائنسی نظریات پر بحثوں کی بھی ابتدا کی۔(27) ان اہم تبدیلیوں کے باوجود ہندستانی سائنس کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی نہیں آئی۔ابوالفضل کے تبصروں سے بھی اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ سائنس کے پرانے طریقہ کار اور نظریات کے ڈھانچے میں کوئی دراڑ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ بہت قدیم زمانے ہی سے یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ جانکاری کے لئے تحقیق اور سوال اٹھانے پر پابندی تھی۔اس قسم کے انداز نظر کو مذہب دشمنی سمجھا جاتا تھا۔ چیلا یا شاگرد جو علم اپنے باپ یا گرو سے حاصل کرتا تھا اسے خدائی دین سمجھ کر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا تھا۔ دوسروں کو اس سے آگاہ نہیں کرتا تھا۔ اکبر نے اپنے زمانے میں اس روایت کو توڑنے کا ڈول ڈالا تھا۔(28)

حوالہ جات

1- اولف پیداسین۔اینڈ ایم۔فل۔ارلی فزکس اینڈ ایسٹرنومی۔اے ہسٹاریکل انٹروڈکشن لندن 1974ء ص 146 بحث کی تفصیلات کے لئے رینے ٹیٹون ایڈیشن، اے جنرل ہسٹری آف سائنس، میڈیول اینڈ اینشینٹ۔لندن 1963ء۔اس کے علاوہ کلاسکس کے بعض اچھے جائزے جیسے بینجامن فیرنگٹن، گریک سائنس۔ جے۔ڈی۔ بیرنال۔ سائنس ان ہسٹری۔لندن 1957ء۔ص 140 ایف۔ایف۔جولیان ماریاس۔اے ہسٹری آف فلاسفی۔ڈورلے 1967ء۔ایس۔سیمبرسکی۔دی فزیکل ورلڈ آف دی گریکس۔لندن ص 15-14۔اس تھیوری کے ہندستانی متبادل کے لئے سئس رت سمہتا جلد2 جس کا حوالہ بی۔وی۔سبا راؤ بپّا نے دیا ہے۔اے کوانسائس ہسٹری آف سائنس اِن انڈیا۔دہلی 1971ء ص 460-455

2- سی ایف۔پیدرسین اینڈ ایم۔فل۔ارلی فزکس ص 146 ایف۔ایف۔

3- تفصیلات کے لئے او۔ری، ہاؤ گریک سائنس پاسڈ ٹو دی عربس۔لندن 1957ء مزید پی۔ای۔پیٹرس۔ ارسٹوٹل اینڈ دی عربس۔ نیویارک 1968ء اور جارج سارٹن، انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس۔ہارورڈ 11

4- آئین اکبری۔نولکشور۔لکھنو (1) ص 38-37

5- ایضاً (1) ص 38

6- ایضاً ص 39

7- ایضاً

8- ایضاً

9- سختی، دل پذیری، اور ماہیت وغیرہ کے معیار کو تھیوفریسٹس نے (288-272 ق۔م) میں بڑھاوا دیا تھا۔ وہ ارسطو کا چیلا تھا۔ جارج سارٹن۔ اے ہسٹری آف سائنس ص560

10- آئین اکبری (1) ص40

11- دلچسپ بات یہ ہے کہ ارسطو بطور تھیوری ایٹمیت کو بہت زیادہ ناپسند کرتا تھا اور اسے رد بھی کرتا تھا۔

12- آئین (1) ص 41-40 سی الیف الجاذنی کے میزان الحکمت، حیدر آباد 1940ء ص82-79

13- البیرونی، کتاب الجماہر فی معارف الجواہر حیدر آباد 1355ھ

14- آئین (1) ص14

15- ایضاً ص37

16- ایضاً ص40

17- دیکھئے مونسرّیٹ۔ کامینٹری آن ہز جرنی ٹو دی کورٹ آف اکبر۔ مترجم جے۔ ایس ہوائی لینڈ اینڈ ایس۔ این۔ بنرجی۔ کیٹک 1922ء میں 201 اور ڈو جیرک کے بیان۔ اکبر اینڈ دی جے سوئٹس۔ ترجمہ سی۔ ایچ۔ پین۔ لندن 1926ء

18- آئین اکبری (1) ص 127۔ ابن سینا، رسالہ الموسیقی۔ حیدر آباد 1353ھ ص10 اور رسائل اخوان الصفا۔ ممبئی 1886ء (1) ص1188

19- آئین (1) ص126

20- تفصیلات کے لئے عمر بن شیخ کا ترجمہ ابن الہیثم کی کتاب کتاب المناظر کا شکاگو 1980ء

21- ایم ایس۔ نمبر 2335 عربی میں۔ رضا لائبریری رام پور۔ اے۔ رحمٰن۔ ایم اے علوی۔ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی ان میڈیول انڈیا۔ دہلی 1982ء

22- E.S.Kennedy (tr.), Al Biruni's Kitab Ifrad al Maqala fi Amr al Zalal (on Shadows, etc.), Aleppo, 1976, I, p.32.

23- ای۔ایس۔کینڈی ترجمہ البیرونی کی کتاب افرادالمقالہ فی امرالظلات (سایوں کے موضوع پر)۔الیپو 1967ء (1) ص 32
24- ایضاً (1) پاسم۔
25- عرفان حبیب۔اکبر اینڈ ٹیکنالوجی جو اس کتاب میں شامل ہے۔
26- ایم۔اے۔علوی اینڈ اے۔رحمٰن۔شاہ فتح اللہ شیرازی 1671 تھ سینچری انڈین سائینٹسٹ دہلی 1976ء
27- ٹی۔ایس۔خاں۔دی اسٹرکچر آف سائنٹیفک ریولوشنز۔شکاگو۔1970ء
28- آئین اکبری (III) ترجمہ جارپٹ ریوسرکار۔اورینٹل ری پرنٹ 1978 ص 4-5

❁❁❁❁❁

اکبر اور ٹیکنالوجی

پروفیسر عرفان حبیب

فادر فرانسس منریق نے اپریل 1580ء کی فتح پور سیکری میں قلمبند کی گئی رپورٹ میں بتایا کہ اکبر کو مختلف ٹیکنیکی پیشوں سے بھی دلچسپی تھی اور وہ اکثر اپنے لوگوں کے سامنے ان کا مظاہرہ کرنے کا بھی شوق رکھتا تھا چنانچہ کبھی وہ بڑھئی کا کام کرتا تو کبھی لوہار کا۔(1) اس کے فوراً بعد جولائی کے مہینے میں روڈولف ایکواوا نے بتایا کہ اکبر کو میکانکی فنون سے بھی دلچسپی تھی۔(2) ستمبر کے مہینے میں مونو سریٹ نے لکھا کہ اس نے اکبر کو ربن بناتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اسی طرح یہ کام کرتا تھا جیسے کہ پیشہ ور لیس بنانے والے کرتے تھے۔ وہ لکڑی کا کام بھی کرتا تھا اور سخت محنت کا عادی تھا۔(3) اپنے ایک بعد میں لکھے گئے بیانئے مونسریٹ لکھتا ہے کہ "جلال الدین اکبر کو عمارت سازی کے کام سے اتنا گہرا لگاؤ ہے کہ وہ دوسرے مزدوروں کے ساتھ مل کر اکثر خود بھی پتھروں کو زمین سے کھود کر نکالا کرتا تھا۔ اسے محنت کرنے والوں کو کام کرتے ہوئے دیکھنے میں بھی کوئی شرمندگی نہیں محسوس ہوتی تھی اور کبھی کبھی تو وہ ان کے ساتھ مل کر خود بھی کام میں شریک ہو جاتا تھا۔ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے اس نے محل کے نزدیک ہی ایک ورکشاپ بنوایا تھا جس میں اعلیٰ اور نازک قسم کے فنون پر کام کرنے کے لئے کمرے اور اسٹوڈیو تھے۔ ان کاموں میں مصوری، دھاتوں کے کام، دریوں قالینوں اور پردوں کے بنانے کے کام اور اسلحہ سازی وغیرہ تھے۔ یہاں وہ اکثر آکر ان مزدوروں اور ہنرمندوں کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر ذہنی سکون حاصل کرتا تھا جو اپنے اپنے فنی پیشوں کا کام کر رہے ہوتے تھے۔"(4)

جیسوئٹس کی گواہیوں پر مشتمل یہ بیانات بہت اہم ہیں کیونکہ ان سے اس بات کی بھی سند ملتی ہے کہ ابوالفضل نے مختلف ہنروں اور ٹیکنالوجی سے اکبر کے گہرے لگاؤ کا جو مفصل بیان قلمبند کیا ہے وہ محض بادشاہ کی بے جا خوشامد اور اس کے مجازی امیج کو واضح کرنے کے لئے نہیں تھا۔ صنعتی مصنوعات سازی کی طرف اکبر کا اپنا جھکاؤ تھا اور اس کا مزاج اس سے مطابقت رکھتا تھا۔ ٹیکنالوجی سے اس کی دلچسپی کا ابتدائی بیان 1579ء کی عارف قندھاری کی تحریر میں ملتا ہے۔ اس کا شاہانہ مزاج ایسا ہے کہ جب وہ سفر پر ہوتا ہے تو اس کے پڑاؤ کے لئے خیموں کو پانچ سو اونٹوں پر لادا جاتا ہے۔ اٹھارہ ایسے گھر ہیں جن کو لکڑی کے تختوں سے بنایا گیا ہے۔ ہر گھر ایک بالائی منزل اور بالکونی پر مشتمل ہے۔ ان گھروں کو ایک موزوں اور دلکش جگہ پر بنایا گیا ہے روانگی کے وقت ان گھروں کے تختوں کو آسانی کے ساتھ الگ الگ کر لیا جاتا ہے۔ گھر جب بنائے جاتے ہیں تو لکڑی کے تختوں کو لوہے کے چھلوں کو باہم جوڑ دیا جاتا ہے۔ ان گھروں کے اندرونی حصے کو یورپی بروکیڈ اور ویلویٹ کی چادروں سے سجایا جاتا ہے جب کہ باہر کے حصوں کو چوڑے کپڑوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ (5)

لکڑی کے تختوں سے بنائے جانے والے یہ متحرک گھر ایک نئی ایجاد تھے جس کے بارے میں اگرچہ مزید تفصیل کے ساتھ بعد میں ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے۔ وہ عمومی توجہ سے محروم رہا خصوصاً بلوخ مان کے ترجمے میں اس حقیقت (6) کا ذکر نہیں ہوا ہے کہ زیر حوالہ گھر لکڑی سے بنائے جاتے تھے نہ کہ کپڑے یا کینوس سے۔ میں یہاں آئین اکبری کا ایک نیا ترجمہ پیش کروں گا۔ ''پڑاؤ کا آئین اور مہم: اس موضوع کے بارے میں ہر ہر نکتے کا بیان مشکل ہوگا البتہ قریب کی جگہوں پر شکار کی مہمات اور سفر کے بارے میں کچھ احوال ضرور لکھوں گا۔ پہلے گلال بار کا قلعہ جو کہ عجوبہ ہے اور جو ظل الٰہی کا بنایا ہوا ہے۔ اس میں مختلف مقاصد کے لئے بنائے کمرے بہت پختہ ہیں۔ ان کے راستے کسی طرف سے تو بند ہیں اور کسی طرف سے کھلے ہوئے ہیں جن میں تالوں اور کنجیوں کا استعمال ہوتا ہے۔ ان کا رقبہ سو گز لمبائی اور سو گز چوڑائی سے کم نہیں ہے۔ ان کی پچھلی سمت میں خیمے سے بنایا گیا ایک بڑا ہال ہے (معہ بارگاہ) جن پر دو بہت بلند پول (سرغا) ہیں۔ اس کے ساتھ چون کوٹھریاں ہیں۔ جن کے گرد چون چھوٹے پول ہیں۔ ان کی لمبائی چوبیس گز اور چوڑائی چودہ گز ہے۔ (7) گلال بار ایک بڑی

لکڑی کی بنی ہوئی راوتی کھڑی کی گئی ہے جن کے اطراف دوسرے پردہ دار پولیلین ہیں۔اس سے ملی ہوئی دو خانوں والی (دوآشیانہ) لکڑی کی عمارت ہے اور یہاں ظل الٰہی عبادت کرتے ہیں۔اس کے باہر منتخب ترتیب کے ساتھ چوبیں لکڑی کی راوتیاں ہیں جن میں سے ہرایک دس گز لمبی اور چھ گز چوڑی ہیں جن کو پردوں کی دیواروں سے الگ الگ کیا گیا ہے۔(8) یہاں شاہی حرم کی عورتیں قیام کرتی ہیں۔

بعد کے زمانے میں لکڑی سے بنی ہوئی راوتی کا بیان آئینِ فراش خانہ میں ملتا ہے۔ ''لکڑی کی راوتی''(9) کو دس ستونوں کے ذریعہ کھڑا کیا گیا ہے۔ان ستونوں کا تھوڑا انچلا حصہ زمین کے اندر ہوتا ہے۔سب کا قد ایک جیسا ہوتا ہے۔(10) لیکن وہ دو جن پر دھنی کا بوجھ ہوتا ہے تھوڑی سی اونچی ہیں۔دھنیوں کے اوپر اور نیچے لکڑیوں کے تختے رکھ کر مضبوطی کو بڑھایا گیا ہے۔دھنی اور تختے کے اوپر بھی کچھ دھنیاں تھیں ان سب کو لوہے کے ذریعہ جوڑا گیا ہے جن میں مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ حصے ہیں (ہمارا آہن جامع بہ طرز نرومادگی پیوند دہد)۔چھت اور دیوار بنے ہوئے بانس کی ہیں۔ان میں ایک یا دو دروازے ہیں۔ اندرونی حصے کو بروکیڈ اور مخمل سے سجایا گیا ہے۔جبکہ باہر کا حصہ چوڑے کپڑے اور ریشمی پٹیوں سے لپٹا ہوا ہے۔

دوآشیانہ کا بیان کرتے ہوئے ابوالفضل مزید لکھتا ہے کہ دوآشیانہ کی بنیاد اٹھارہ ستونوں پر اٹھائی جاتی ہے۔چھ گز کا ہر ستون کھڑا کیا جاتا ہے جن پر لکڑی کے تختے لگائے جاتے ہیں ان کو زنان خانے و مردان خانے بنانے کے لئے چار گز لمبے ستون جوڑے جاتے ہیں اور اس طرح اوپر کا کمرہ یا بالا خانہ بنایا جاتا ہے۔ان کو اندر اور باہر سے اسی طرح سنوارا اور سجایا جاتا ہے جس طرح لکڑی کی رواتی کو۔کسی مہم کے دوران یہ کمرے بادشاہ کے آرام کی جگہ ہوتے ہیں۔(11)

دھنیوں اور پولوں کی تیاری میں نئے نئے طریقے استعمال کئے جاتے ہیں جیسا کہ عارف قندھاری لکھتا ہے جن کو لکڑی کے ڈھانچہ میں فوری طور پر جوڑا جاسکتا ہے اور وہ صرف خیموں تک ہی محدود نہیں ہوتے ہیں۔لکڑی اور بانس کا بنا ہوا محل لکڑی کی رواتی کی طرح اور دو منزلہ ڈھانچہ دوآشیانہ کی طرح سفر کے ہر پڑاؤ پر بنایا بھی جاسکتا ہے اور سفر کے ختم پر کھول کر

الگ الگ بھی کیا جاسکتا ہے۔ بلوخ مآن کا ترجمہ بتاتا ہے کہ کیلیں اور لوہے کے نٹ وغیرہ مختلف حصوں کو جوڑنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔(12) اگر صحیح ہوسکتا ہے تو یہ ایک سند ہے اس بات کی کہ اس زمانے میں چیزوں کے جوڑنے کے لئے اسکریو استعمال ہوتے تھے حالانکہ یورپ میں سولہویں صدی سے پہلے بڑھئی کے کام میں اسکریو کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔(13) لفظ آہن جامعہ یا لوہے کا غلاف اسکریو کا کام دیتے تھے۔ ہمیں جو بتایا گیا ہے وہ چھوٹی لوہے کی نلکیاں ہیں جو پولوں اور دھنیوں کے آخری سرے پر پہنا دی جاتی تھیں۔ ایک سے دوسرے پولوں اور دھنیوں کے سوراخوں میں فٹ کرنے کے لئے ایسے ٹکڑے بنائے جاتے تھے جن کو نکالا بھی جاسکتا تھا۔ ان کو لمبائی میں بھی اور زاویہ قائمہ پر بھی پولوں یا دھنیوں پر پھیلایا جاسکتا تھا۔ یہ اس طرح ایسی جدید لوہے کی سلاخوں اور ان پر رکھے گئے تختوں کے ڈھانچے جیسا ہوتا تھا جو عمارت کے باہر چاروں طرف بنایا جاتا ہے اور اکثر رسوں سے باندھا جاتا تھا۔ قدیم ایران میں اس کے عمومی اصول کا علم تھا جہاں چکنی مٹی کے نلکے کاریز ایک دوسرے کے ساتھ اسی طریقے سے فٹ کئے جاتے تھے۔ لکڑی کے کاموں میں وہاں اس طریقے کے استعمال کے بارے میں البتہ مجھے علم نہیں ہے۔

کپڑا سازی (ٹیکسٹائل)

اکبر کو کپڑا سازی کی ٹیکنالوجی سے جو دلچسپی تھی اس کا بھی ابتدائی ماخذ عارف قندھاری ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”ظل الٰہی کو اعلیٰ اور مفید چیزوں اتنا گہرا لگاؤ تھا کہ انہوں نے ہندستان میں ریشمی کپڑوں، بروکیڈ، ٹیپسٹری اور ریشمی دریوں وقالینوں کی صنعت کو متعارف کروایا تھا۔ اس کے فن میں بہت زیادہ تربیت یافتہ ہنرمندوں کو اس نے جمع کیا تھا۔ اس صنعت کے ذریعہ جو اشیاء بنائی جاتی ہیں یورپ اور ایران کے مقابلے میں کہیں بہتر ہیں۔ نمونے اور نقشے یا ڈیزائن بنانے میں مہارت کا یہ معیار تھا کہ مہان فنکار مانی اگر زندہ ہوتا تو وہ ایسی ڈیزائنوں اور نت نئے رنگوں کو دیکھ کر حیرت سے اپنی انگلیاں اپنے منہ میں رکھ کر کاٹ لیتا۔(14) ”اس اقتباس کی اہمیت یہ ہے کہ کپڑے سازی کے کام میں اکبر کی ایجادوں اور ساکھ کا ذکر ابوالفضل نے نہیں کیا تھا حالانکہ جب اس نے آئین اکبری لکھنا شروع کیا تھا اس سے پہلے ہی اول الذکر کارنامے کو

شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ آئین میں اس نے کچھ مزید تفصیلات ہی کا اضافہ کیا ہے۔'' ظل الٰہی کی توجہ اور دلچسپی کے نتیجے میں کپڑا سازی (قماش) کی مختلف قسموں کا رواج ہوا۔ ایرانی، یورپی اور چینی کپڑے آنے لگے۔ کپڑا سازی میں ماہر اور تیز و مستعد اساتذہ آئے اور انہوں نے کپڑا سازی کی صنعت میں گرمی اور تیزی پیدا کر دی۔ لاہور، آگرہ، فتح پور سیکری، احمد آباد اور گجرات کے علاوہ شاہی دربار میں مختلف قسم کی تصاویر، نقوش، اور بنت سازی اور نت نئی حیرت زدہ کرنے والی ڈیزائننگ یا (طرح) کا رواج ہوا۔ دنیا سے آنے والے سیاح جب ان مصنوعات کے اعلیٰ معیار کو دیکھتے تھے تو تعجب کا اظہار کرتے تھے۔ بہت کم مدت میں ظل الٰہی نے اس فن کے ہر ہر پہلو سے واقفیت حاصل کر لی تھی اور ان کی سرپرستی و توجہ ہی کا نتیجہ تھا کہ ہندستانی ماہر استادوں نے بھی یہ سب کچھ جلد ہی سیکھ لیا تھا۔(15)

اس تحریری تناظر سے واضح ہوتا ہے کہ اکبر کی توجہ اور ہدایات کے نتیجے میں کپڑا سازی میں بنت ایرانی، چینی اور یورپی نمونوں اور مقامی نمونوں کی تال میل سے اور پختہ ہوگئی تھی۔ ماہر گو کہ ایران سے ہی آئے ہوں گے تاہم تکلوں کے استعمال کا رواج ایران، یورپ اور چین میں تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ابوالفضل اس طریقہ کار کے متعارف کرنے کا ذکر کر رہا ہے کیوں کہ اس کے بیان میں گنجلک پن ہے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی بات نہیں کر رہا ہے۔

عارف قندھاری کے یہاں لفظ طراحی اور ابوالفضل کے اقتباس میں لفظ طرح پر خصوصی توجہ درکار ہے۔ اس کا زیادہ امکان ہے کہ وہ دونوں ہی چھپی ہوئی چھینٹ کے لئے استعمال میں لائے جانے والے چھاپوں کی ڈیزائن کو موضوع بنا رہے ہیں۔ غنی بیگ اسد آبادی جنہوں نے 1592ء میں عبدالرحیم خانِ خاناں کی ملازمت چھوڑی تھی ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے ڈیزائن سازی کو بہت ترقی دی تھی (یعنی طراحی کو) اور بہت سی چھینٹ کی قسمیں (اختراع چیٹ) ایجاد کی تھیں۔ ان کی اختراعات کا بیشتر ماہرین نے اعتراف بھی کیا اور ان کو استعمال میں بھی لائے تھے یا یوں کہئے کہ ان کی نقل بھی کی تھی۔(16) سرونج میں ان کے قیام کے دوران جو کہ چھاپوں کی چھینٹ کا مرکز تھا یہ کچھ کہا گیا تھا۔ ان کے معاصر آقا محمد شیرازی نے بھی حیرت انگیز اور عجب قسم کی ایجادات کی تھیں اور چھینٹ کی ڈیزائن سازی میں بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ جو کہ پورے ہندستان میں صرف سرونج کے مقام پر بنائی جاتی

تھی۔(17) چھاپے کی ٹیکنیک گوکہ ایران سے نہیں آئی تھی مگر یہ حقیقت کہ عبدالرحیم کی ملازمت سے وابستہ دونوں ہی چھینٹ پر دھاگوں سے بنت کی ڈیزائن ایران سے مستعار لی جانے کا رجحان تھا۔طرح اور طرّاح اگر کپڑ سازی کی صنعت میں اکبر کے کارناموں سے منسوب ہے تاہم اس میں چھاپے کے بلاکوں سے چھاپی جانے والی ڈیزائن بھی شامل تھیں۔اس میں ہم فوری طور پر جان لیتے ہیں کہ کیوں اکبر کی بنائی ہوئی ڈیزائنوں کا اتنا وسیع تعریفی حلقہ تھا۔

بلاک چھپائی کے ڈیزائن کا بہت گہرا تعلق رنگوں کے استعمال سے بھی تھا۔اکبر نے دونوں پر مہارت حاصل کی تھی اور اوپر اقتباس میں عارف قندھاری نے اس کی تعریف کی ہے۔ابوالفضل ہمیں اونی شال کی رنگائی میں اکبر کے تجربے سے جانکاری فراہم کرتا ہے۔اس وقت تک صرف بغیر رنگ کا طوس اون ہی استعمال کیا جاتا تھا مگر اکبر نے خود اس کو رنگنے کا کامیاب تجربہ کیا تھا اور یہ بھی دریافت کیا تھا کہ طوس اون سرخ رنگ کو قبول نہیں کرتا ہے۔مزید کہ سفید الجا جسے طرح دار بھی کہا جاتا ہے قدرتی رنگ رکھتا ہے۔اس کا اون یا تو سفید یا سیاہ ہی ہوتا ہے اور اسے تین طریقوں سے بنا جاتا ہے یعنی مکمل سفید، مکمل سیاہ یا سیاہ وسفید کا تال میل۔ اول سفید پرانے زمانے میں تین یا چار رنگوں سے زیادہ رنگ نہیں پکڑتا تھا۔مگر ظل الٰہی اس کو کئی رنگوں میں رنگنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔(18) ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے اون کون کون سے رنگ جذب کرسکتا ہے کے تجربے میں بڑی محنت کی تھی۔

ہوا کو ٹھنڈا کرنا اور ٹھنڈک سے چیزوں کو منجمد کرنا۔ریفریجریشن۔

ابوالفضل کے بقول ہندستان میں ٹھنڈے پانی سے کوئی واقف نہیں تھا اور فضا بہت زیادہ تاپ کار یا گرم رہتی تھی۔اکبر نے فضا کی تاپکاری کو ہٹانے اور لوگوں کی شکایت کا سدباب کرنے کے لئے خس کے ڈھانچوں یا ٹیٹوں کو مقبول بنادیا تھا۔"ایک خوشبودار جڑ ہوتی ہے جو بہت ٹھنڈی ہوتی ہے اور اسے خس کہتے ہیں۔" عالم پناہ سلطان کے حکم سے بانسوں کے ڈھانچوں کے ذریعہ خس کی ٹٹیاں بنانے کا عام رواج ہوگیا تھا۔ان پر جب پانی ڈالا جاتا تھا تو محسوس ہوتا تھا کہ جیسے گرمی کے بجائے سردی کا موسم آگیا ہے۔(19)

اس تحقیق کا ہونا باقی ہے کہ کیا اکبر کے زمانے سے پہلے خس ٹیٹوں پر پانی ڈال کر گھروں

یا کمروں کو ٹھنڈا کرنے کا کوئی رواج تھا؟ ہندستان کے بارے میں بابر کا بیانیہ بھی اس بارے میں ہمیں کوئی جانکاری فراہم نہیں کرتا ہے۔ 1739ء میں بہار نے خس خانہ کی تعریف (20) کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خس خانہ خصوصیت کے ساتھ ہندستان کی دریافت ہے شعراء نے اسے اپنی نظموں کے ذریعہ واضح کیا ہے لیکن دو یا تین شعراء جن کا حوالہ دیا گیا ہے ان کا تعلق سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں سے ہے۔ اکبر کی ایجاد کے بارے میں ابوالفضل کا بیان اس لئے بالکل صحیح مانا جاسکتا ہے۔

اکبر نے پانی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے جو طریقہ دریافت کیا وہ بہت دلچسپ تھا۔ اس کے لئے بادشاہ نے قلمی شورے (پوٹاشیم نائیٹریٹ) کا استعمال کیا تھا۔ ابوالفضل نے اکبر ہی کا ایک اقتباس دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے یہ دریافت کی تھی۔ (21) وہ ایک بار نہیں بلکہ کئی بار اس ایجاد کو اکبر سے ہی منسوب کرتا ہے۔ (22) جس کا بیان زیر نظر اقتباس میں ہے۔ "عالم پناہ نے اپنی دور رس دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قلمی شورہ حاصل کیا جو بارود کی صورت میں دھماکہ پیدا کرتا ہے۔ اس کو بادشاہ نے پانی ٹھنڈا کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جس کے نتیجے میں غریبوں اور امیروں کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ شورہ اصل میں نمکین مٹی کا ہوتا ہے۔ شورے کو ایک چھلنی جیسے برتن میں رکھ کر اس پر پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا برتن سے چھن کر جو پانی آتا ہے، اسے ابال لیتے تھے شورے کو پہلے زمین سے الگ کر لیا جاتا تھا اور پھر اس کی قلمیں (باربندنہ) تیار کر لی جاتی تھیں۔ چاندی یعنی پیوتر کی بنی ہوئی ایک بوتل میں ایک سیر پانی بھر دیا جاتا تھا اور اس کے منہ کو بند کر دیا جاتا تھا۔ ایک دوسرے چوڑے برتن میں ڈھائی سیر قلمی شورے کو پانچ سیر پانی میں ملایا جاتا تھا۔ بند بوتل کو اس آمیزے میں آدھی گھڑی یعنی بارہ منٹ تک مسلسل چاروں طرف گھمایا جاتا تھا۔ اس کے بعد بوتل کا پانی بہت ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ کوئی شخص اگر چاہتا تھا تو ایک روپیہ میں چار من (چالیس سیر) قلمی شورہ خرید سکتا تھا۔ (23) ابوالفضل نے اس ایجاد کی کوئی تاریخ نہیں بتائی ہے۔ وہ اس اقتباس کے فوراً بھی لکھتا ہے کہ 1582ء میں جب اکبر لاہور منتقل ہو گیا تھا تو وہاں اسے برف حاصل کرنے کا موقع ملا تھا جس کے ذریعہ پانی ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ پانی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے شورے کی دریافت اس زمانے کی ہے یعنی 1585ء سے کافی پہلے کی جب اکبر فتح پور سیکری اور

آگرہ میں رہا کرتا تھا۔اس طریقے کا کوئی حوالہ اس سے پہلے کا دستیاب نہیں ہے۔اس لئے ابوالفضل کا دعویٰ کہ اس کا بادشاہ ہی اس ایجاد کا بانی تھا صحیح ہوجاتا ہے۔اسی حوالے سے یورپین سیاحوں کے بہت سے بیانات بھی ملتے ہیں جنہوں نے زور دے کر لکھا ہے کہ یہ طریقہ صرف ہندستان میں مروج ہے۔(24) یورپ ٹھنڈک پیدا کرنے کا کیمیائی طریقہ اس کے بعد کا ہے۔جس میں ٹھنڈک کے عمل کی ابتدا کے لئے برف کی ضرورت ہوتی تھی۔(25)

گیر کے ذریعہ پانی کو کھینچنا

گیر اور زنجیر کے ذریعہ زمین کے نیچے سے پانی کھینچنے کے طریقے سے بابر بہت متاثر ہوا تھا۔اس طریقے کو بعد کے زمانے میں ایرانی چکر کا نام دیا گیا تھا۔اس نے وسطی ایشیا اور افغانستان میں یہ طریقہ نہیں دیکھا تھا مگر جب وہ 1519ء (26) میں پوربی پنجاب آیا تھا تو بھیرا کے مقام پر اس نے پہلی بار پانی کھینچنے کا یہ طریقہ دیکھا تھا۔اپنے بیانئے میں اس نے اس طریقہ کا ابتدائی سائنسی بیان مہیا کیا ہے۔(27) اکبر کا ان پہیوں یا چکروں میں دلچسپی لینا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔اس کے مصور نے جس کو بادشاہ نے دربار میں مقرر کیا تھا اپنی تصویروں میں اکثر اس کا بھی اظہار کیا ہے۔(28)

ابوالفضل نے بھی اس حوالے سے بادشاہ کی ایجاد کا ذکر کیا ہے۔

عالم پناہ نے پانی کا ایک ایسا چکرا (دولاب ہا) اور گیر (Gear) بنایا جس پر چکرا جوڑا گیا تھا (گردوں ہا)۔اس کے ذریعہ اول دور کے نچلے حصوں سے پانی کو اونچائی تک اٹھایا جا سکتا تھا دوم دو بیل ایک ہی وقت میں چار چکروں کو گھما سکتے تھے اور سوئم مزید ایک بیل دو چکروں کو گھماتا تھا۔پانی دو کنوؤں سے باہر نکالا جا سکتا تھا اور اس کے ذریعہ پانی کی ایک مِل چلائی جا سکتی تھی۔(29)

ایجاد نمبر 1 نظامی کی جلد خمسہ کی دو تصویروں میں واضح کر کے دکھائی گئی ہیں۔یہ جلد اکبر کی لائبریری کے لکھی گئی تھی جس میں تصویریں شامل ہیں۔(30) اس تصویر میں بیل زمین کی سطح پر ایک اونچا عمودی ڈنڈا چاروں طرف چکر لگا کر چلا رہا ہے۔اس ڈنڈے میں پانی اوپر کو لانے کے لئے ایک برتن لگا ہوا ہے۔ڈنڈے یا دھرے کی نوک پر یا اس کے قریب ایک پن

ڈرم ہے جن کی پنیں عمودی چکرے میں لگے ہوئے دھاتوں کے ٹکروں کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں (ایک تصویر میں پن ڈرم ایک اور ڈنڈے کے ساتھ جڑا ہوا ہے)۔ چکرا اپنے حساب سے گھومتا ہے اور اپنے ساتھ ہی لگے ہوئے برتنوں کو بھی گھماتا ہے جو چکرے کے دھرے ہی کی حرکت سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس طرح پانی بہت زیادہ اونچی سطح تک اٹھایا جاتا ہے۔ یہی وہ ایجاد تھی جس کے ذریعہ فتح پور سیکری میں تسلسل کے ساتھ چکرے کے گھومنے پر پانی بہت اونچائی تک اٹھایا جاتا تھا۔ اس کے مشاہدے کا بیان 1826ء میں ہیبر نے قلمبند کیا ہے۔ ''پوری ہی پہاڑی جس پر محل بنا ہوا ہے ان میں ہر راستوں اور باغات کے آثار صاف دکھائی دیتے ہیں۔ باغوں کی سینچائی کے لئے تسلسل کے ساتھ کنوؤں کی ایک قطار تھی۔ بڑی مسجد کے ساتھ چکرے اور لوٹے تھے جو کم سے کم مسجد کی چھت کی اونچائی تک پانی اوپر اٹھاتے تھے۔ لوٹے یا ڈبے اب تک برسات کے پانی کو جمع کرنے کے لئے مفید سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کا مشینی ڈھانچہ عرصہ ہوا زنگ آلود ہو کر ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ (31) بڑے کنوؤں جن کے ذریعہ یکے بعد دیگرے مراحل میں پانی اٹھایا جاتا تھا اور ان کی نکاسی کے لئے نالیوں کے جال کا بیان بہت تفصیل سے ای۔ ڈبلو۔ اسمتھ نے فتح پور سیکری کے اپنے جائزے میں قلمبند کیا ہے لیکن اس کے مشینی ڈھانچے اور ذرائع جن سے پانی کو اٹھایا جا سکتا ہے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ (32) اس نے ان کو خمسہ نظامی کی وضاحتی تصویروں میں دیکھا ہوگا۔ ہر صورت میں فتح پور سیکری میں فراہمی آب کا عظیم الشان نظام اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ ایجاد نمبر 1، 1570ء تک مکمل طور پر استعمال میں آ رہا تھا۔

ایجادات نمبر 2 اور 3 کا جہاں تک معاملہ ہے تو ان کا استعمال اسی صورت میں ممکن ہو سکتا تھا جب کہ گیر کاری کے طریقے مزید تیز تر بنایا جاتا۔ اس کی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہے جیسا کہ ہم آگے دیئے گئے دوسرے حصے میں بھی دیکھیں گے کہ اکبر اور اس کے انجینئروں کو ن ڈرم گیر کاری کا کوئی متبادل معلوم تھا۔ ان حدود کے ہوتے ہوئے صرف بہتر بڑھئی کے کام سے ہی اصلاح کی جا سکتی تھی (پنوں کے ذریعہ لکڑی یا دھات کے ٹکڑوں کا جال تیار کرنا جو زیادہ گتھا ہوا اور صحیح ہو)۔ رابطوں کے مقامات پر لوہے کا استعمال نظام کو بہت زیادہ ساختیاتی استحکام دیتا تھا لیکن بدقسمتی سے ابوالفضل ہمیں یہ نہیں بتاتا ہے کہ آیا ان میں سے

تمام یا کوئی استعمال تھے یا نہیں۔

گیرکاری کے دوسرے روپ۔گاڑی مِل اور نالی دار بندوق کی کھدائی

1582ء میں میر فتح اللہ شیرازیؔ نے جو ایک مشہور و معتبر ایرانی دانشور عالم دینیات اور معالج تھے اکبر کے دربار سے وابستہ ہوئے تھے اور جلد ہی اکبر کے اعلیٰ سطح کے صلاح کاروں انہوں نے اعلیٰ مقام پالیا تھا۔ بدایونیؔ کے مطابق جب 20 مارچ 1583ء کو نوروز کا جشن برپا ہوا تھا تو بادشاہ نے ایک بازار لگوانے کا اہتمام کیا تھا جہاں ''سابق رسم و رواج کے مطابق مختلف دکانیں مختلف امراء کے نام پر دی گئی تھیں۔ شاہ فتح اللہؔ نے اپنی دکان میں مختلف ہنرکاروں کی مصنوعات رکھی تھیں جن میں وزن کو اٹھا کر لے جانے والی مشین 'جرِ انتقال'' اور دوسری خوبصورت چیزیں شامل تھیں۔(33) اس کے بارے میں مزید زیادہ جامع معلومات شیخ نظام الدینؔ احمد نے مہیا کی ہیں۔ 1593ء میں لکھتے ہوئے فتح اللہ کے لئے کہتا ہے۔ ''خوبصورت چیزوں کو بنانے کی سائنس پر اسے عبور حاصل تھا۔ (علوم غرائبیہ) جیسے کہ حیرت میں ڈالنے والی اور جادوئی چیزیں۔ اس نے ایک مِل ایجاد کی تھی جو گاڑی پر رکھی جاتی تھی (یعنی بیل گاڑی) اور اپنی قوت سے چلتی تھی۔ اس سے پسا ہوا آٹا حاصل ہوتا تھا۔ اس نے ایک ایسا آئینہ بھی بنایا تھا جس میں عجوبہ چیزیں دور سے بھی اور قریب سے بھی نظر آتی تھیں (کالی ڈا اسکوپ جیسی چیز) اور ایک پہیئے بنایا تھا جس کے ذریعہ دس ہاتھ کی بندوقوں کا اوپری سرا جڑ جاتا تھا۔ (سری شد) (34)

ایم۔اے۔علویؔ اور اے۔رحمٰن نے جیسا کہ نشاندہی کی ہے ان میں سے دو ایجادوں کو ابوالفضلؔ اکبر سے منسوب کرتا ہے۔(35) اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ نہ صرف یہ دو بلکہ عملاً دوسری تمام مشینی ایجادات کا محرک بھی اکبر تھا۔ جیسا کہ آئین میں لکھا گیا ہے اصل میں فتح اللہ شیرازی کا کام تھا گو کہ وہ اکبری دربار میں صرف سات برس (1889-1882ء) تک ہی رہا تھا۔(36) ایرانی دانشور (یعنی فتح اللہ) نے کتنا کام کیا تھا اس بحث میں الجھنے کے بجائے ابوالفضلؔ کے بیانات کی مدد سے بہتر ہوگا کہ ہم ان مشینوں کے بارے میں سمجھنے کو ترجیح دیں۔ آیئے پہلے دیکھیں گاڑی۔مِل کو'' عالم پناہ نے اپنی ذہانت سے ایک گاڑی ایجاد کی تھی (ارابہ)

جو ساری دنیا کے لوگوں کے لئے آرام وسہولت کا ذریعہ ہو گئی تھی۔ سفر اور سامان ڈھونے کے دوران بھی اس میں مختلف قسم کا اناج پیسا جاتا تھا۔(37)

بیان کہ یہ گاڑی مِل مختلف قسم کے اناج پیستی تھی اس امکان کو بھی واضح کرتا ہے کہ گاڑی میں ایک سے زیادہ ملیں ہوتی تھیں۔ ہم اگر یہ فرض کرلیں کہ یہ دو پہیوں کی گاڑی ہوگی تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ برابر تعداد میں ملیں (جیسے کہ دو) دھرے کے دونوں طرف اس لئے رکھی جاتی ہوں گی کہ توازن برابر رہے۔ چونکہ پن ڈرم کے علاوہ گیر سازی کا کوئی دوسرا طریقہ معلوم نہیں ہوسکا ہے۔ جو اکبر کو دستیاب رہا ہو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دھرے پر ایک لمبا پن ڈرم رکھا جاتا ہوگا جس کی پنیں ارضی پہیوں کے رموں پر عمودی دھاتوں کے ٹکڑوں سے بندھی ہوئی رکھی ہوں گی۔ ہر پہلو پر ایک جوڑا ہوگا اور ہر پہیہ ایک مِل چکی کو گھماتا ہوگا۔ اس طرح مختلف قسم کے اناجوں بہ یک وقت پیسا جاتا ہوگا۔(38) یہ ایجادات 1580ء میں کی گئی ہوں گی کیوں کہ اس دوران فتح اللہ شیرازی اکبر کے دربار میں موجود تھا۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یورپ میں ویگن ملیں اکبر اور اس کے ہنرمندوں کی ایجادات کے بعد کا قصہ ہیں جن کا پہلا ذکر ان 1580ء میں ہوا تھا اور ان کا بیان 1607ء میں زونکا نے کیا تھا مگر یہ ملیں اس وقت کام نہیں کرتی تھیں جب گاڑی چل رہی ہو بلکہ اس وقت کام کرتی تھیں جب گاڑی ٹھہری ہوئی ہو۔ گاڑیوں کے ساتھ گیر کے ساتھ لگائی گئی ملیں جو چلتی ہوئی گاڑی میں بھی کام کرتی تھیں ان کا یورپ میں رواج سترہویں صدی میں ہوا تھا۔(39)

ابوالفضل اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''مزید یہ کہ عالم پناہ نے ایک بڑی گاڑی ایجاد کی (سترگ گردوں) جس کو ایک ہاتھی چلاتا تھا۔ یہ اتنی بڑی ہے کہ گرم پانی سے اشنان کرنے کے لئے پانی کے برتنوں کو کئی بنائی گئی کوٹھریوں میں رکھا جاتا تھا۔ جس میں آشنان کرنے کا وہی لطف آتا تھا جو حمام میں آتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس گاڑی کو ایک بیل بھی آسانی کے ساتھ چلا سکتا تھا۔ ان گاڑیوں کو (گردوں۔ہا) اونٹوں اور گھوڑوں کے ذریعہ بھی چلایا جاتا تھا اور لوگ ان میں آرام کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ زیادہ اعلیٰ و نازک گاڑی کو بہل کہا جاتا تھا۔ اس گاڑی کے فرش پر کافی لوگ بیٹھ سکتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے تھے۔(40)

یہ بیان کچھ مشکوک ہے کیوں کہ اس قسم کی گاڑیوں کے لئے جس مشینی ترقی کی ضرورت تھی ان دنوں اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا امکان بھی کم ہی ہے کہ چلتی ہوئی گاڑیوں میں پانی کو گرم کرنے کے لئے آگ کا انتظام کیا جاسکتا ہو۔ دوسری طرف اکبر نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا ہوگا کہ گاڑیوں میں پہیوں کی تعداد بڑھا دی ہوگی تا کہ ہاتھی کے ذریعہ چلائی جانے والی گاڑیوں کی لمبائی بڑھ جائے۔ اس قسم کی گاڑیوں کے بنانے میں فتح اللہ کی حصہ داری تھی یا نہیں اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی ہے۔

آخر میں بندوقوں کی نالیوں کو چکنانے کی مشین جو ہی ہوسکتی تھیں یا اسی اصول پر عمل کرتی تھیں جن پر مشین عمل کرتی ہے کہا گیا ہے کہ ان کے موجد فتح اللہ شیرازی تھے۔

ابوالفضل کا بیان اس طرح ہے۔

برغو بنانے کا آئین

پہلے ایک ایسا طاقتور آدمی بھی لوہے کے آلات پر کام کرنے میں سخت مشکل سے دوچار ہوتا تھا جب کہ کچھ چکناہٹ (صفا) ہاتھ سے استعمال کی جانے والی بندوق میں نہ ہو۔ عالم پناہ نے اپنی دانش کی مدد سے ایک پہیہ ایجاد کیا تھا جس کو جب ایک بیل گھماتا تھا تو سولہ ہاتھ سے استعمال کی جانے والی بندوقوں کی نالیاں چکنا جاتی تھیں اور اس میں بہت کم وقت لگتا تھا۔ پڑھنے والوں کی اطلاع کے لئے ایک تصویر دی جارہی ہے۔(41) اصل تصویر بہت سے ایم۔ایس۔ایس میں محفوظ ہے جن کو بعض خامیوں کے ساتھ بلوخ مان نے اپنے ترجمے میں نقل کیا ہے۔(42)

اس طریقے نے جو کام کیا تھا وہ صفائی نہیں تھا جیسا کہ بلوخ مان نے سمجھا ہے۔(43) لفظ صفا بندوق کی صفائی اور اس کے چکنانے دونوں معنوں میں مستعمل تھا لفظ برغو یا برغور کی بھی یہی صورت ہے (جس کو ایم۔ایس۔ایس۔ میں مختلف انداز سے پڑھا گیا ہے)۔(44) میں نے جن ڈکشنریوں سے استفادہ کیا ہے ان میں یہ لفظ موجود نہیں ہے۔ لیکن آئین اکبری کے اگلے باب میں اس کا مفہوم صاف ہے۔ بندوق کی نالی (درازی تفنگ) بنائے جانے کے بعد جس میں پچھلا حصہ (تہہ) نہیں تھا اسے شاہی حرم خانے میں بھیج دیا گیا تھا۔ یہاں ہمیں بتایا

گیا ہے۔'' بادشاہ نرم گولیوں کے وزن کا تعین کرتا تھا۔ جس کی مناسبت سے نالی کے سوراخ کا سائز بنایا جاتا تھا۔ لمبی ہاتھ کی بندوق کی گولی کا وزن پچیس تانکس سے زیادہ نہیں ہوتا تھا (اوسطاً تین اعشاریہ ستر پونڈ)۔ چھوٹی بندوق کی گولی کا وزن پندرہ تنکس (اوسطاً دو اعشاریہ بیس پونڈ)۔ ان اوزان کی گولیوں کو داغنے کا حوصلہ صرف عالم پناہ میں ہی تھا۔ برغوں جب مکمل ہو جاتا تھا تب ہاتھ کی بندوق کو دوبارہ شاہی کمرے میں منظوری کے لئے بھجوا دیا جاتا تھا۔ (45)

اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ برغو سے مراد بندوق کی نالی ہے جو بورنگ کے بعد اپنی حتمی شکل اختیار کرتی ہے۔ (46) نالی کے اندر پیائی اور بورنگ کا یہ کام بہت سخت تھا جس کو جانوروں کی طاقت استعمال کر کے لوہے کے آلات کو گھما کر یا نالی کے اندر سوراخ کر کے آسان بنا دیا گیا تھا۔

ابوالفضل کی دی گئی تصویر (جو برٹش میوزیم، ایم۔ ایس۔ ایڈ 7652 میں موجود ہے اور اس کے ساتھ برغو پہیئے اور اس کے منسوب کچھ قصوں کی تصویر بھی ہے) سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بیل (جس کی شکل نہیں دی گئی ہے لیکن ڈرابار کے آخر میں اس کی پوزیشن قصہ تصوگاؤ سے واضح ہوتی ہے) ایک ڈرابار کو کھینچتا تھا جو بڑے ارضی پن ڈرم (بڑا پن ڈرم = چرخ عظیم) (اس کی تصویر میں رم پر پنیں نظر آتی ہیں)، اس کے دھرے (محور) کو گھماتا تھا صاف نظر آتا ہے۔ اس گھیرے پر اس کی پنیں آٹھ دھاتی ٹکڑوں کے عمودی گیر پہیوں کے ساتھ بندھی ہوئی ہیں جن کو گول دائرے میں دکھایا گیا ہے جس کے گھیرے پر تکون نما دھاتی ٹکڑے ہیں۔ سوراخ کرنے والے یا ڈرل ان پہیوں کے دھروں سے بنائے جاتے تھے جو دونوں طرف باہر تک ہوتے تھے اس طرح ہر ایک پہیہ دو بندوقوں کی نالیوں میں (نال) جب انہیں دھرے کے ساتھ سختی سے دبایا جاتا تھا سوراخ ہو جاتے تھے۔ دھرے کا ڈرل بندوقوں کے پہلے سرے یا منہ (دہانۂ بندوق) کے اندر گھستا تھا اور پھر سوراخ کے اندر بورنگ کرنے کے بعد اس میں چکناہٹ پیدا کرتا تھا۔ تصویر میں بیرونی سوراخوں کے بیرونی سروں کی طرف کھنچی ہوئی سیدھی سطریں جن کو قائمہ کمان کہا گیا ہے غالباً نوک دار لکڑی اور چھڑیوں (Bars) کی طرف اشارہ کرتی ہیں جن کو مضبوطی کے لئے نالیوں کے ساتھ فٹ کیا جاتا تھا۔

ہاتھ کی بندوقیں اور توپیں

اکبر کو ہاتھ کی بندوقوں اور توپوں سے جو لگاؤ تھا آئین اکبری میں اس کا بھی بیان ملتا ہے۔ ایک طویل پیراگراف میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ شاہی بندوق ساز بار بار بندوقیں تیار کر کے بادشاہ کو پیش کیا کرتے تھے تاکہ بادشاہ ان کا جائزہ لے اور ضروری ہدایات دے۔ (48)

ابوالفضل ایک اور ٹیکنیک کی ایجاد کا سہرا اکبر کے سر پر باندھتا ہے جس کے ذریعہ بندوقوں کی نالیوں کو مضبوط بنایا جاتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "ہاتھ کی بندوقوں سے عالم پناہ کو بہت لگاؤ تھا۔ بندوق سازی اور بندوق سے گولی چلانے پر بھی اسے مہارت حاصل تھی۔ بندوق سازوں نے اس کی سرپرستی میں ایک ایسی بندوق بنائی جس میں بارود بھر دیا جاتا تھا اور پھر اسے داغا جاتا تھا مگر اس کے باوجود یہ بندوق ٹوٹتی نہیں تھی۔ ابتدا میں اس بندوق کی نالی میں نالی کا ایک چوتھائی حصہ ہی بارود سے بھرا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ہتھوڑے اور لوہے کے بلاک کے ذریعہ لوہے کو چپٹا کرتے ہیں اور چپٹے لوہے کے دونوں سروں کو ملاتے ہیں اور اس طرح بندوق کی نالی تیار ہو جاتی ہے۔ بعض ماہر ہنرمند لوہے کی چپٹی چادر کا ایک سرا ایک طرف کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اس قسم کی نالیوں کی وجہ سے کافی زخم آ جاتے تھے۔ عالم پناہ نے اس خرابی پر قابو پانے کے لئے ایک شاندار طریقہ استعمال کیا۔ لوہے کو چپٹا کرنے کے بعد لوہار اسے ایک رول کی طرح مڑے ہوئے کاغذ جیسے اس طرح موڑ دیتے تھے (تومار) کہ ہر ایک موڑ یا تہہ کے ساتھ رول لمبا ہوتا جاتا تھا۔ وہ اسے کنارے کنارے سے نہیں جوڑتے تھے بلکہ ایک کنارے کو دوسرے کنارے کی طرف بڑھا دیتے تھے اور پھر مرحلہ وار آگ پر رکھ کر اسے مضبوط بناتے تھے (پختہ)۔ لوہے کی چادر جو کہ وہ تیار کرتے تھے اور ان کو ایک لوہے کی سلاخ (یا روڈ) کے اطراف موڑتے تھے اور اس طرح ایک سوراخ دار نالی تیار ہو جاتی تھی۔ ایک بندوق کی نالی بنانے کے لئے لوہے کے تین سے چار ٹکڑے استعمال میں لائے جاتے تھے۔ چھوٹی بندوقوں کے لئے دو لوہے کے ٹکڑے کافی ہوتے تھے۔ لمبی نالی تقریباً دو گز ہوتی تھی جبکہ چھوٹی نالی سوا گز کی۔ اس حالت میں اسے کودمانک کہتے تھے۔ (49)

اکبر کے اسلحہ خانے کا دعویٰ ہے کہ اس نے (i) چپٹی لوہے کی چادر کو موڑ کر جسے بار بار

نہوں کی صورت میں گھما کر اور (ii) پھر ان گرم ٹکڑوں کو ایک لوہے کی چھڑی پر چڑھا کر نالی بنانے کا نیا طریقہ دریافت کیا تھا۔ اس طرح نالی میں کمزور جوڑ نہیں باقی رہتے تھے نالی بہت پختہ ہو جاتی تھی اور بہت زیادہ دھماکہ خیز دباؤ کو برداشت کر لیتی تھی۔ اول اقتباس جس پر ہم نے بات کی ہے اس کے فوراً بعد میں آنے والے اقتباس کی بہت زیادہ ٹیکنالوجیکل اہمیت ہے۔ ''مزید عالم پناہ کی مہارت سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ایسی ہاتھ کی بندوقیں بنائی تھیں جو بغیر (فتیلہ آتش) کے یعنی آگ کے ذریعہ بندوق داغنا صرف لبلبی کی ہلکی سی حرکت سے دھماکہ ہوتا تھا اور گولیاں باہر نکل جاتی تھیں۔ (50)

ہاتھ کی بندوقوں کی مرحلہ وار پیداواریت کے بیان میں ہمیں معلوم ہوا کہ ایک بار جب نالی اور اسٹاک فٹ ہو جاتے تھے تب ان کو تہہ میں لایا جاتا تھا وہ لبلبی دبانے کے قابل ہو جاتی تھیں اور گز و پر گز؟ (51) یہ واضح نہیں کیا گیا ہے کہ لبلبی کس طرح کام کرتی تھی اس لئے ہمیں معلوم نہیں ہوتا ہے کہ ماچس کے بغیر بارودی حصے میں بارود کو کس طرح آگ لگائی جاتی ہوگی۔

میں نے شروع میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ایک قفل پہیے سے لازماً کام لیا گیا ہوگا اور پھر اس میں کوئی قفل ماچس جیسی چیز بھی ہوگی گوکہ قفل ماچس کو بھی فتیلہ یا ماچس درکار ہوتی ہوگی۔ (52) اس کا بہت صحیح مطالعہ اقتدار عالم خان نے کیا ہے جس کا عنوان ہندستان میں ہاتھ کی بندوقوں کی تاریخ ہے۔ (53)

توپوں کے عنوان پر ایک مختصر باب (آئین توپ) میں ابوالفضل کی دو ایجادات کو اکبر سے منسوب کرتا ہے۔ اس پر سرسری گزرنے کے بجائے ہمیں زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اول کہ بادشاہ نے ایک ایسی توپ بنائی تھی جس کو کسی فوجی مہم پر جاتے ہوئے لاد کر لے جانے میں سہولت کے لئے اس کے حصوں کو الگ الگ کیا جا سکتا تھا۔ توپ کو داغنے کی ضرورت کے وقت اس کے حصوں کو دوبارہ آسانی کے ساتھ جوڑا جا سکتا تھا۔ (54) اکبر کے دربار میں چونکہ بند کرنے والے اسکریو کے استعمال کی کوئی شہادت ہمیں نہیں ملتی ہے چنانچہ توپوں کے حصوں کو الگ الگ کرنے اور ضرورت کے وقت ان کو دوبارہ جوڑنے ایک ہی طریقہ ہوگا کہ نالی کے حصوں کو کاریز نالیوں کے اصول پر بنایا گیا ہوگا جو ایک طرف موٹی اور دوسری طرف پتلی ہوں گی اس طرح حصوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑا جاتا ہوگا لیکن جوڑوں کو مضبوط

کرنے کے لئے اب بھی ضرورت ہوتی ہوگی کہ ان پر چھلے رکھ کر ان کو ہتھوڑے سے فٹ کیا جائے۔ تاکہ نالی کے حصوں کو توپ کے داغنے پر اڑنے سے محفوظ رکھا جا سکے۔ ہم نے توپ سازی کے طریقے کا جو خاکہ دیا ہے وہ شاہی خیموں کے لکڑی سے بنائے گئے ڈھانچوں کو الگ الگ کرنے اور ضرورت کے وقت ان کو جوڑ کر خیمہ تیار کرنے کی ٹیکنیک سے مطابقت رکھتا ہے۔

دوسری ایجاد تھی سترہ توپوں کو باہم اس طرح مربوط کرنا کہ صرف ایک ماچس کی تیلی (یا فتیلے) سے تمام توپیں فوراً آگ پکڑ لیتی تھیں۔(55) بدقسمتی سے ابوالفضل نے اس بیان کو اتنا مختصر لکھا ہے کہ ہم صرف اندازوں ہی پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ توپوں کو کس طرح مربوط کیا گیا ہو گا۔ یقیناً ایسا نہیں ہوگا کہ سترہ توپوں جیسی تعداد میں سے کسی کی نالی میں ایک بھی آگ دینے والا پلڑا (Priming Pan) جوڑا گیا ہوگا۔ ایک ہی امکان ہے کہ نالیاں اپنے پلڑوں سمیت ایک دوسرے سے اتنی قریب رکھی جاتی ہوں کہ جب پہلے پلڑے میں آگ کا شعلہ لپکے تو ترتیب وار دوسرے پلڑوں میں بھی آگ کے شعلے بھڑک اٹھیں۔ غالباً پلڑے مستطیل صورت میں بنائے گئے تھے تاکہ گرمی کی ترسیل کی شرح کو موثر بنایا جا سکے۔ توپوں کی داغ ایک ہی وقت میں نہیں ہوتی ہوگی بلکہ تیز تر ترتیب سے یکے بعد دیگرے ہوتی ہوگی۔ تمام توپوں کو فوراً داغنے کا طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ بیچ کی توپ کی نالی میں لگے پلڑے میں پہلے آگ لگائی جائے۔(56)

جہاز سازی

اکبر کی ایجادات کا ایک اور شعبہ سمندر میں چلنے والے جہازوں کی تیاری سے اس کی دلچسپی تھی جس پر توقع سے کم توجہ دی گئی ہے۔ اس میں حیرت کا پہلو بھی ہے کہ وہ بادشاہ جس کی راجدھانیاں، فتح پور سیکری، آگرہ اور دہلی سمندر سے بہت دور تھیں اور جس نے دسمبر 1572ء میں صرف ایک مرتبہ کھمبات کے مقام پر ایک کشتی میں بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کیا تھا اسے سمندری جہازوں کی تیاری کی افادیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ آئین اکبری میں ایک مرتبہ تفصیلی بیان سمندر میں چلنے والے جہازوں کے کپتان اور عملے کے فرائض اور مختلف بندرگاہوں کے حوالے سے ان کے معاوضوں پر ہے۔ اس سے بھی سمندری جہاز رانی سے بادشاہ کے لگاؤ کی نشاندہی ہوتی

ہے۔(57) بندرگاہوں پر بڑے بڑے شاہی جہاز بنائے جاتے تھے جو سمندر کے ذریعہ سفر کرنے والوں کو سہولت اور آرام مہیا کرتے تھے لیکن اس سے بھی زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ سمندری جہاز الہ آباد (الاہاباس) اور لاہور میں بھی بنائے جاتے تھے جن کو دریاؤں کے ذریعہ سمندر کو بھیجا جاتا تھا۔(58)

سمندری جہاز جو الہ آباد میں بنتے تھے ان کے بارے میں ہمیں معلومات نہیں ہیں البتہ لاہور میں بنائے جانے والے سمندری جہازوں کے بارے میں ہماری معلومات زیادہ ہیں۔ یہاں یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ 1591ء میں سندھ کا اکبری سلطنت سے الحاق ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ٹھٹھہ کی بندرگاہ (جس میں بندرگاہ لاہری بھی شامل تھا) بادشاہ کی تحویل میں آ گئی تھی۔ سندھ میں پکی لکڑی کا فقدان تھا چنانچہ اسی لئے اکبر نے سمندری جہاز سازی کا مرکز لاہور کو بنایا تھا جو ٹھٹھہ سے تقریباً چھ سو پچاس میل دور تھا تاہم دریائے سندھ کا نظام ٹھٹھہ کو لاہور سے ملائے ہوئے تھا۔ سندھ اور ٹھٹھہ کے برعکس لاہور میں ہمالیہ پہاڑوں سے پہنچنے والی خاص پکی لکڑی کے انبار موجود تھے۔ (لاہری=لاری بندر)

ابوالفضل کے مطابق(59) لاہور میں دریائے راوی کے کنارے پہلے بڑے سمندری جہاز کی تیاری جون 1594ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کے لکڑ دھنی کی لمبائی پینتیس گز الٰہی تھی (یعنی کچھ کم ترانوے فٹ)۔ جہاز کو دو ہزار نو سو چھتیس سال اور شاہ بلوط (Pine) کی لکڑی کے بڑے مضبوط تختے سے بنایا گیا تھا۔(60) چار سو اڑسٹھ من دو سیر یعنی گیارہ اعشاریہ چھپن ٹن یا دو ہزار دو سو چالیس پونڈ لوہا استعمال میں آیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکڑی کے بڑے تختے کو جوڑنے کے لئے وافر مقدار میں لوہے کی کیلیں، پٹیاں اور چھلے وغیرہ میں لائے گئے تھے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس جہاز کو دو سو چالیس بڑھیوں، لوہاروں اور دوسرے تنخواہ دار ملازموں نے تیار کیا تھا۔ جہاز جب بن کر تیار ہو گیا تو اس کا ادگھاٹن کرنے کے لئے بادشاہ خود وہاں گیا تھا۔ مختلف مروجہ مقامی طریقوں کے ذریعہ ایک ہزار لوگوں نے مل کر جہاز کو دھکیل کر دریا تک پہنچایا تھا اس کام میں پورے دس دن لگ گئے تھے۔ ان دنوں دریائے راوی میں اتنا پانی نہیں تھا کہ اتنا بڑا جہاز اس میں چل پائے بہر حال ایک وقت آیا جب یہ جہاز دریا راوی سے گزر کر لاہری بندر (ٹھٹھہ) پہنچ گیا تھا۔ ایک اور معاصر بیانیہ نگار لکھتا ہے کہ جہاز کو بنانے کے بعد

سندھ کی بندرگاہ بھیج دیا گیا تھا تا کہ لوگ مکہ کا سفر براستہ بحر احمر کر سکیں۔(61)

ابوالفضل کے مطابق اکبر نے اپنی قیادت میں دریائے راوی کے اندر پہلے جہاز کو چلائے جانے میں جن مشکلات کا تجربہ کیا تھا اس کے نتیجے میں اس کو یہ خیال ہوا کہ سمندر میں چلنے والا دوسرا جہاز ایک بڑے چپٹے تلے پر بنایا جائے اور جو پندرہ ہزار من (وزن میں تین سو سترٹن) یا اس سے زیادہ وزن لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔اس جہاز کی تیاری کا کام وسط جولائی میں شروع ہوا تھا اور لگ بھگ دسمبر 1596ء کے وسط میں مکمل ہو گیا تھا۔اس کی لمبائی سینتیس گز یا ننانوے فٹ تھی۔اسے اکڑ دھنی پر یا بالائی تختے پر بنوایا گیا تھا اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔اس کی تیاری پر سولہ ہزار تین سو اڑتیس روپیہ خرچ ہوا تھا۔ چپٹے تلے کی وجہ سے جہاز آسانی کے ساتھ لہری بندر (ٹھٹھہ) پہنچا دیا گیا تھا۔(62) ظاہری طور پر چپٹا تلا جس پر جہاز بنایا اور لے جایا گیا تھا اس میں سوراخ کر دیئے گئے تھے تا کہ جہاز کو سمندر میں اتارا جا سکے۔اس طریقے نے ڈچوں کو ''کیمل'' جہاز بنانے کی تحریک دی تھی (جس کو 1688ء میں ڈچ بندرگاہ پر بنایا گیا تھا۔)۔اس کا تلا چپٹا تھا جس کو پانی میں اتارا گیا تو وہ پانی پر جہاز کو تیرانے لگا۔(63)

سمندری جہاز سازی میں اکبر کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اس نے سمندر میں جانے والی چھوٹی کشتیوں (غوراب) کے نمونے کی ایک نئی کشتی بنوائی تھی تا کہ اسے جہلم ندی میں چلایا جائے جس کے ذریعہ جہلم سے جڑی ہوئی کشمیر کی جھیلوں تک لوگ پہنچ سکیں۔اس واقعہ نے دیکھنے والوں کو عموماً حیرت زدہ کر دیا تھا۔اکبر نے خود بھی اس کشتی کے ذریعہ جولائی 1597ء میں سفر کیا تھا۔(64)

خوبصورت مصنوعات

بیشتر عربی اور فارسی کی نظری (Theoritical) ٹیکنالوجی پانی کے بہاؤ، گیرکاری، لیورس اور ترازوؤں کے مختلف اور متضاد حرکات کے تصور پر مشتمل تھی۔اس روایت کی بہترین وضاحت الجزاری نے کی ہے۔ان نظری طریقوں کو عمل میں لانا کسی حد تک مشکل تھا لیکن ہمیں علم ہے کہ پھر بھی آبی گھڑیوں جیسی کچھ چیزیں بنالی گئی تھیں۔

نورالحق نے اپنی کتاب زبدۃ التواریخ میں ایک جادو کی مشین کا ذکر کیا ہے جس کو لاہور کے مقام پر اکبر نے 95-1594ء میں دیکھا تھا اور اس سے خوب لطف اندوز بھی ہوا تھا۔ ایلیٹ نے اس حصے کو منتخب کر کے اس کا ترجمہ کیا ہے اور میں یہاں اس ترجمے کا ایک حصہ نقل کرتا ہوں جس میں متن کا موازنہ کرنے کے بعد کچھ ترمیم کی گئی ہے۔ "فن ایک حیرت میں ڈالنے والا مظاہرہ 1003ھ ہوا تھا جو کہ سعید حسین شیرازی کا کارنامہ تھا۔ وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے ایک بکس پر کھڑا ہوتا تھا، جب کوئی اسے ایک روپیہ دیتا تھا وہ اسے بکس کے اندر ڈال دیتا تھا اور پھر بکس کو اس طرح ہلاتا رہتا تھا کہ روپیہ بکس کے تلے تک پہنچ جائے۔ اس کے اوپر ایک طوطا جو بکس کے اوپر بٹھال دیا جاتا تھا چاروں طرف گھومنا شروع کر دیتا تھا۔ اس کے بند دو چڑ اس کے بعد ایک چھوٹی سی کھڑکی کھول دی جاتی تھی جس کے باہر ایک شیر سر نکال کر جھانکتا تھا۔ اس کے منہ سے ایک گولا باہر آتا تھا جو اس برتن میں جا کر گرتا تھا جو شیر کے سر پر رکھا ہوتا تھا۔ اس کے بعد پھر ایک گولا اسی طرح شیر کے منہ سے باہر آتا تھا۔ ایک اور کھڑکی کھلتی تھی اور ایک اس سے باہر نکلتا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دیوان حافظ کی کوئی غزل ہوتی تھی۔ جب یہ غزل لے لی جاتی تھی تو چلا جاتا تھا اور کھڑکی بند ہو جاتی تھی۔ مختصراً جب روپیہ سعید شیرازی کے ہاتھ میں دیا جاتا تھا تو اول الذکر تمام ہی واقعات اسی ترتیب کے ساتھ ہوتے تھے۔ بادشاہ نے بھی خود یہ نظارہ دیکھنے کے لئے بکس میں ایک اشرفی ڈالی تھی۔ اس کے بعد بادشاہ نے جتنے لوگ وہاں تھے کہا تھے کہ سب ایک ایک روپیہ ڈالیں۔ جو غزلیں ملتی تھیں اسے نقیب خاں کو دے دیا جاتا تھا جو ان کو پڑھ کر سناتا تھا۔ یہ دلچسپ تفریح رات گئے تک جاری رہی تھی۔ (65)

اس جادوئی مشین پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب سکہ ڈالنے کے بعد حرکت شروع ہوتی تھی تو اس کے بعد جو مراحل آتے تھے ان کو بھاری وزنی اشیاء کنٹرول کرتی تھیں یعنی سکے کے ان پر گرتے ہی وہ اپنی جگہ سے ہٹ جاتی تھیں۔ پوری مشین کو عمل کرنے کے لئے صرف لیوروں، ترازوؤں اور غالباً چرخیوں کی ہی ضرورت تھی۔ اس میں کسی قسم کے گیروں یا لچھے دار لوہے کے لچکیلے حصوں (Springs) کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس عجیب مشین میں یورپ کی گھڑیوں جیسے پرزوں یا میکانکی طریقوں کا استعمال نہیں کیا

گیا تھا۔

اکبر کو پانی کی فراہمی اور ترسیل سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ وہ عمارت سازی میں جدت پیدا کرنے والے تجربوں کا بھی شوق رکھتا تھا۔ بدایونی کا بیان ہے کہ ''اس برس کے دوران (986ھ/79-1578ء) ایک حکیم یعنی عالم فتح پور سیکری آیا تھا اور کہا تھا کہ ایک ایسا گھر بنایا جا سکتا ہے جس کے چاروں طرف پانی ہو اور اس مکان تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ نہ ہو سوائے اس کہ جانے والا پانی کے اندر چلتا ہوا جائے۔ اس کی خوبی یہ ہوگی کہ چاروں طرف بھرا ہوا پانی کسی بھی صورت میں گھر کے اندر داخل نہیں ہوگا۔ اس کے مشورے پر عالم پناہ نے دربار محل کے صحن میں ایک ٹینک بنوایا تھا۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی ترتیب وار بیس گز اور گہرائی تین گز تھی۔ اس کے اندر پتھر کی ایک کوٹھری بنوائی گئی تھی جس میں ایک عمودی مینار بنایا گیا تھا۔ کوٹھری کے اطراف پل بنوائے گئے تھے مگر جب کام مکمل ہو گیا تو حکیم کا دعویٰ غلط نکلا اور وہ کسی اور طرف بھاگ گیا تھا۔(66) اس ڈھانچے کی پہچان کا اگر کوئی معروض تھا تو انوپ تلاؤ تھا لیکن اس تلاؤ یعنی تالاب کے بیچ کے پلیٹ فارم یا مرکز پر کسی کوٹھری اور مینار ہونے کے کوئی آثار نہیں ملتے ہیں۔

بدایونی بتاتا ہے کہ اس واقعہ کے سترہ برس بعد حکیم علی گیلانی نے لاہور میں ایک تلاؤ یعنی تالاب یا (Tank) بنایا تھا جو مختصراً اسی طرح کا تھا۔ اس میں گیلانی نے وہی سب کچھ کامیابی کے ساتھ بنا دیا تھا جو حکیم شیرازی اپنے دعوے کے باوجود نہیں بنا سکا تھا۔ بدایونی نے اس تعمیر کی تاریخی ترتیب کا بھی ذکر کیا ہے جو سال 1002ھ/94-1593ء کی تعمیر تھی۔ اس کی تعمیر کے بارے میں ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس عجیب تالاب کی تعمیر اردی بہشت 39 الٰہی اپریل مئی 1594ء میں ہوئی تھی۔ اس کا ایک راستہ ایک کوٹھری کو جاتا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے مرکز سے پھوٹنے والے پانی کے چشمے کا پانی محل کے اندر نہیں جاتا تھا۔(67)

نورالحق اس کی تعمیر کے بارے میں ہمیں زیادہ تفصیلات مہیا کرتے ہیں۔ اس کا سال تعمیر 1003ھ/95-1594ء بتاتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ حکیم علی نے موزوں لمبائی و چوڑائی پر مشتمل ایک زیرزمین کمرہ یا تہہ خانہ بنایا تھا جس میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اس دروازے سے گزر کر کمرہ کے اندر پہنچا جا سکتا تھا۔ کمرے کی چھت کے اوپر اس نے ایک بڑا اور گہرا ٹینک

بنایا تھا جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔ جب کوئی اس گھر میں داخل ہونے کا ارادہ کرتا تھا تو اسے پانی سے گزر کر چھوٹے دروازہ تک پہنچنا ہوتا تھا۔ کمرے کے اندر ضرورت کی ہر چیز جو ایک ہال یا جمع ہونے کی جگہ یعنی اسمبلی میں ہونا چاہئے موجود تھی جیسے کہ قالین اور کتابیں وغیرہ۔ پانی اس کمرے کے اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ بتایا گیا ہے کہ ایک روز بادشاہ خود اپنے صلاح کاروں کے ساتھ یہاں آیا تھا اور ایک اجلاس میں بھی منعقد کیا تھا۔ یہاں ٹھہرنے کے بعد وہ اسی چھوٹے دروازے سے اسی طرح باہر بھی نکلا تھا۔(68) (لفظ Ceiling کو یہاں کوٹھے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔)

یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ کس طرح زیرزمین کمرے میں پانی کے اندر آنے کو روکا گیا تھا۔ اگر فرض کرلیں کیونکہ ہم مفروضات قائم کر کے ہی آگے بڑھتے ہیں کہ چھوٹا دروازہ ٹینک میں بھرے ہوئے پانی کی سطح سے اوپر نہیں تھا تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ معتمد خاں نے بھی ہمیں عملاً وہی تفصیلات بتائی ہیں جو نورالحق نے بتائی ہیں۔ وہ وثوق کے ساتھ بتاتا ہے کہ پانی کے کمرے کے اندر داخلے کو ہوا روکتی تھی۔(69) لیکن جو طریقہ کہ زیادہ صحیح ہوسکتا ہے وہ کوئی ایسا انتظام ہوگا جس کے ذریعہ کمرے سے باہر جمع ہونے والا پانی کا بہاؤ کسی کنوئیں کی طرف موڑ دیا گیا ہوگا اور اسی کنوئیں سے پانی اوپر کے ٹینک کو دوبارہ چلا جاتا ہوگا۔ اس کے بارے میں ہم کوئی حتمی فیصلہ نہیں دے سکتے ہیں کہ ایسا ہی ہوتا ہوگا۔

ٹیکنالوجی کے مختلف شعبوں سے اکبر کا لگاؤ کپڑا سازی کی صنعت سے لے کر جہاز سازی کی صنعت تک اور ٹھنڈک پیدا کرنے سے لے کر گیئر کاری کے طریقوں تک بلاشبہ قابل تعریف ہے۔ وہ اگر تمام ایجادات کا موجد نہ بھی رہا ہو جو اس کے دربار میں ایجاد ہوئی تھیں تو بھی وہ مختلف شعبوں کے ماہر انجینئروں کا پُرجوش سرپرست ضرور رہا تھا۔ ٹیکنالوجی کے مختلف عوامل اس قدر بامعنی و بامقصد توجہ ہماری معلوم تاریخ میں کسی اور بادشاہ کے حوالے کم کم ہی رہی تھی۔ اس کے بعد وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جب یورپ نے ترقی کا سفر شروع کیا تھا اور گلوبل ٹیکنالوجیکل طاقت کا اجارہ دار بن گیا تھا۔

حوالہ جات

1- لیٹرز فرام دی مغل کورٹ، دی فرسٹ جیسوئٹس مشن ٹو اکبر 83-1580ء ایڈیشن ترجمہ مع تعارف جوجان کوریا افونسو نے کا لکھا ہوا ہے۔ ممبئی/آنند 1980ء ص 22

2- ایضاً۔ص 56

3- ایضاً۔ص 81

4- مونسریٹ۔ کامنٹری آن ہز جرنی ٹو دی کورٹ آف اکبر ترجمہ ہوائے لینڈ اور بنرجی۔ کٹک 1922ء ص 201 اور پیرے ڈوجیرک کا بیانیہ جو اکبر اینڈ جیسوئٹس میں شامل اکبر اور جیسوئٹس کے خطوں کی نقل ہے ترجمہ پائین۔ لندن 1926ء ص 206۔ (کچھ دیر بعد اکبر اونٹوں سے اون نکالتے، پتھروں کو کاٹتے، لکڑی کاٹتے اور لوہے پر ہتھوڑا مارتے ہوئے دکھائی دیتا تھا۔)

5- عارف قندھاری۔ تاریخ اکبری۔ ایڈیشن معین الدین ندوی، اظہر علی دہلوی اور امتیاز علی عرشی، رام پور 1962ء ص 43

6- آئین اکبری (1) ترجمہ بلوخ مان۔ ایوڈی۔سی۔فلوٹ۔کولکتا۔ 1927ء ص 49

7- بارگاہ کے علیحدہ بیان کے لئے دیکھئے آئین اکبری میں آئین فراش خانہ ایچ۔ بلوچ۔ مان ایڈیشن۔ کولکتا 67-1866ء (1) ص 49۔ ایک ہال تھا جس کی چھت خیمے کی تھی۔ اس میں دس ہزار یا اس سے زیادہ لوگ سما سکتے تھے۔

8- آئین اکبری۔ بلوخ مان ایڈیشن (1) ص 41

9- ابوالفضل نے لفظ کے حرف بہ حرف ہجے لکھے ہیں جو جان۔ ٹی۔ پلاٹ کی ڈکشنری آف اردو، کلاسیکل ہندی اینڈ انگلش میں ملتے ہیں۔ طبع ثانی۔ دہلی 1977ء ص 584۔ اس کے وہی ہجے ہیں مگر تلفظ راووتی (Raoti) دیا گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں ایک چھوٹا

مستطیل خیمہ۔ مزید دیکھئے ہنری یول اینڈ اے۔ سی۔ برنیل۔ نظر ثانی ولیم کروک نے کی ہے۔ ہوبسن۔ جوبسن۔ طبع ثانی دہلی 1968ء ص772 (راوتی) Raoti کینوس یا کپڑے کا بنا ہوا خیمہ تھا لیکن ابوالفضل نے لکڑی کی راوتی کا ذکر کیا ہے۔

10- بلوخ مان کے ایڈیشن میں مگر دو پر بی آر، ایم یو ایس۔ ایڈ 7652 ایف 125 اے۔ مگر دزہ دزہ کے معنی ہیں عدد۔ دزی دزہ یعنی گیلری، بالکونی۔ نولکشور ایڈیشن 1893ء، I، ص 32 میں ہے نہ گردد جس کی بنا پر ابوالفضل نے کہا کہ تمام ستون اونچائی میں برابر نہیں ہیں۔

11- آئین اکبری۔ بلوخ مان ایڈیشن (1) ص49

12- آئین اکبری۔ بلوخ مان ایڈیشن ریو۔ فلوٹ 1927ء (1) ص56 سطر 11 اور 17

13- آر۔ ڈبلو۔ سائمنڈس ان سنگر ای ٹی اے ایل ایڈیشن۔ ہسٹری آف ٹیکنالوجی (II) ص242 این۔ بہار عجم ٹیک چند بہار کی ڈکشنری 1739ء (II) دہلی 1283ھ ص682۔ نرمادگی۔

14- تاریخ اکبری ص45

15- آئین اکبری۔ بلوخ مان ایڈیشن (1) ص 101

16- عبدالباقی نہوندی۔ معاصر رحیمی۔ ایم۔ ہدایت حسین ایڈیشن۔ کولکتا 1931-1910ء (III) ص980 اور 986

17- ایضاً (III) ص1659

18- آئین اکبری۔ بلوخ مان ایڈیشن (1) ص 104-103۔ بلوخ مان کے بیان میں کہ بادشاہ نے مختلف طریقوں سے رنگنے کا حکم دیا تھا کوئی معنی نہیں ہیں ترجمہ (1) ص 97۔ فعل پرساخت کے معنی حکم نہیں بلکہ بنانے کے ہیں۔

19- آئین اکبری۔ بلوخ مان ایڈیشن (II) ص6

20- بہار عجم (1) دہلی 1282ھ ص569۔ خس خانہ یعنی جس سے بنایا جانے والا ڈھانچہ جس گرمیوں کے دوران لوگ لیٹتے بیٹھتے تھے۔ یہ خوشبودار گھاس یا خس اور اس کے ڈھانچے ہندستان میں عام ہیں جن شعراء کا حوالہ دیا گیا ہے وہ ہیں قبول، حکیم صادق اور ملا

عبدالبرکات نیر۔ میں نے حکیم صادق کا پتہ لگایا ہے جب کہ قبول (مرزا عبدالغنی کشمیری) کا 27-1726ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ عبدالبرکات منیر کا انتقال 45-1644ء میں ہوا تھا۔ (آزاد بلگرامی، سرو آزاد مرتبہ عبداللہ خان اور عبدالحق۔ لاہور/حیدرآباد دکن 1913ء ص 60 اور 1999-1989ء

21- عالم پناہ کے دل پذیر اقوال میں جو آئین اکبری (II) کے خاتمے پر قلمبند کئے گئے ہیں۔ بلوخ مان ایڈیشن ص 241۔ ہم نے جب قلمی شورے کا تجربہ کیا تو نمک کے ساتھ اس کی وابستگی ختم ہو گئی تھی۔

22- آئین اکبری، بلوخ مان ایڈیشن (II) ص 31 اور (II) ص 6

23- ایضاً (1) ص 51۔ اس پیراگراف کا جو ترجمہ بلوخ مان نے کیا ہے بالکل صحیح ہے۔ (1) ص 58۔ اکبر کے زمانے کا ایک من پچپن اعشاریہ بتیس پونڈ کے برابر تھا۔

24- سب سے پہلا میں نے پیٹر منڈے 1632ء کی کتاب، دی ٹریولز آف پیٹر منڈے ان یورپ اینڈ ایشیا (II) مرتبہ آر۔ سی۔ ٹیمپل۔ لندن 1914ء ص 77 پر نوٹ کیا ہے۔ دیکھئے فرانس سو برنیئر 1664ء ٹریولز ان مغل ایمپائر 68-1656ء ترجمہ اے۔ کانسٹیبل ریو۔ وی۔ اے۔ سمتھ لندن 1916ء ص 57-356 اور جان مارشل 1671ء جان مارشل ان انڈیا 72-1668ء ایس اے خان ایڈیشن 1927ء ص 29-428

25- ان کے لئے دیکھئے آر۔ جے۔ فوربس۔ اسٹڈیز ان انسینٹ ٹیکنالوجی VI لیڈن، 1966ء ص 105۔ عرفان حبیب، اسٹڈیز ان ہسٹری دہلی II(i)1980ء ص 38

26- بابرنامہ عبدالرحیم کا فارسی ترجمہ بی آر۔ ایم۔ یو۔ ایس او آر 3174 ایف 314 بی ترجمہ اے۔ ایس۔ بیوریج لندن 1921ء (1) ص 388

27- ایضاً۔ (II) ص 487-486

28- سی۔ ایف۔ ایس۔ پی ورما، آرٹ اینڈ میٹریل کلچر ان پینٹنگز آف اکبرس کورٹ دہلی 1978ء ص 109 پلیٹ XLVII نمبر 14 و 15 کی تصویر میں سمت بنانے والے تیر کو الٹا کر کے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

29- آئین اکبری۔ بلوخ مان ایڈیشن (I) ص 199

30- بی آر۔ایم یوایس۔اوآر 12208 ایف ایف 165 اے اور 99 بی۔

31- ریگنالڈے ہیبر شیر یٹیو آف اے جرنی تھرو دی اپر پرونسیسز آف انڈیا (II) لندن، 1873ء ص15

32- ایڈمنڈ، ڈبلو۔اسمتھ۔مغل آرکیٹکچر ایٹ فتح پور سیکری۔الٰہ آباد 1896ء حصہ (II) ص19، 32اور 40-38

33- عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ۔علی احمد اور لیز کا ایڈیشن۔کولکتا۔69-1864ء (II) ص321

34- طبقات اکبری۔بی۔ڈے۔ایڈیشن۔کولکتا 15-1913ء ص457۔فقرہ ''سری شد۔'' عمومی طور پر داغنے کے معنی میں لیا جانا چاہئے۔اس میں ایک پہیہ تالا ہوتا ہوگا۔ ایم۔اے۔علوی اور اے رحمٰن۔فتح اللہ شیرازی: اے 16 سنچری انڈین سائنٹسٹ۔ دہلی 1968ء ص 31-30۔ایک پہیہ تالا ایک ہی وقت میں دس بندوقوں کو نہیں داغ سکتا ہے۔اگر ایسا نہیں تھا اور بندوقیں ایک بڑے پہیے کے اطراف رکھ کر داغی جاتی ہوں گی تو ان کے نشانے مختلف سمتوں کو جاتے ہوں گے جس کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے ہیں۔

35- آئین اکبری۔بلوخ مان ایڈیشن (1) ص126 اور 199

36- علوی اور رحمٰن ص4 اور 32-30

37- آئین اکبری۔بلوخ مان ایڈیشن (1) ص199

38- علوی اور رحمٰن کی دی موڈرن ڈرائنگ تصویر III ص8 ایک مل اور یورپین قسم دندانے دار پہیئے دکھاتا ہے۔

39- جے۔نیدہم۔سائنس اینڈ سویلائزیشن ان چائنا (IV) 2 کیمبرج 1965ء ص 57-255۔جس میں یہ شہادت پیش کی گئی ہے کہ اسی طرح کی ایک چینی ایجاد بھی تھی جو 1300 برس پہلے کی تھی لیکن بعد میں اسے بھلا دیا گیا تھا۔

40- آئین اکبری۔بلوخ مان ایڈیشن (1) ص199

41- ایضاً۔(1) ص126

42- بلوخ مان کے یہاں بالائی تصویر پلیٹ XV جو ص18 کی طرف ہے۔نیچے کی تصویر

جدید ہے جس کونظر کر دیا جانا چاہئے ۔اس مضمون میں تصویر پر مزید اظہار خیال ہوگا۔

43- آئین اکبری ترجمہ بلوخ مان ۔ ریو۔فلوٹ (1) ص 122، ایم۔اے۔علوی اور اے۔رحمٰن ص 7-4۔ بلوخ مان کی رائے کو پوری طرح مانتے ہیں کہ وہ لوگ برش روڈس کے بارے میں بھی بتاتے ہیں۔ یہ جے۔نیدھم کی بصیرت کے مطابق ہے کہ جبکہ اس کے زیر نظر صرف بلوخ مان ہی کا ترجمہ تھا پھر بھی اس نے دیکھا کہ مشین کا مقصد یقیناً بورنگ اور صفائی بھی تھا۔سائنس اینڈ سویلائزیشن ان چائنا (IV)2 کیمبرج 1965ء ص 88 این۔

44- بی آر۔ایم یوایس۔7652 جو کہ آئین میں سب سے زیادہ صحیح ایم۔ایس۔ایس ہے اور اس میں بار بار برغو ہی آیا ہے۔

45- آئین اکبری۔بلوخ مان ایڈیشن (1) ص 125۔تنک (ایضاً ص 60) وزن کے اعتبار سے ایک بڑے پانچ دام ہوتا تھا اور ایک دام کے سکے کا وزن 322 اعشاریہ 7 گرین ہوتا تھا۔

46- اس سے واضح نہیں ہوتا کہ نالیوں کو چکنانے کے لئے گیر نما کوئی مشین ہوتی تھی جیسا کہ علوی اور رحمٰن نے ص 7-4 پر لکھا ہے۔

47- ڈرابار سے مراد پہیوں کے ساتھ لگے ہوئے پٹے۔(غالباً) مترجم

استیک۔لکڑی یا دھات سے بنی نوکدار چھڑیاں (غالباً) مترجم

48- آئین اکبری۔بلوخ مان ایڈیشن (1) ص 126-125

49- ایضاً۔

50- ایضاً۔ص 125

51- ایضاً۔ص 126۔جہانگیر۔تزک جہانگیری سیو داحمد ایڈیشن ص 199 میں لفظ آتش خانہ برمنگ پان کے لئے استعمال ہوا ہے۔

52- آئی۔ای۔ایس۔ایچ۔آر۔XVII (1) ص 17۔اور اسٹڈیز ان ہسٹری II (1) ص 36

53- دی نیچر آف ہینڈ گن ان مغل انڈیا۔ پروسیڈنگز آف دی انڈین ہسٹری کانگریس اجلاس

52دہلی1992-1991ءص89-378۔ای ایس پی ص84-383اور386این 21

54- آئین اکبری۔بلوخ مان ایڈیشن (I) ص124

55- ایضاً۔

56- تیرہ توپوں کی مربوط ساخت میں درمیانی توپ کے دونوں طرف آٹھ آٹھ توپیں ہوں گی۔درمیانی پلڑے میں آگ دیتے ہی ترتیب کے ساتھ دونوں طرف کے پلڑوں میں بھی آگ لگتی ہوگی اور توپیں دونوں طرف ترتیب کے ساتھ یکے بعد دوسرے دغتی ہوں گی۔

57- آئین اکبری۔بلوخ مان ایڈیشن (1) ص203-202

58- ایضاً۔ص202

59- اکبرنامہIII ص652-651

60- ناخود جو کہ چھپے ہوئے متن میں ہے غلط لفظ ہوگا یہ لفظ ناجو ہونا چاہئے تھا جیسا کہ مرتب نے نوٹ کیا ہے بعض ایم۔ایس۔ایس میں لکڑی کے بڑے تختوں کی تعداد نو ہزار پانچ سو چھتیس بتائی گئی ہے۔

61- طاہر محمد سبزواری۔روضتہ الاطاہرین۔بی آر۔ایم یو ایس او آر168 ایف 155اے بی

62- اکبرنامہIII ص716-715۔اپنے مقالے ''شپ بلڈنگ اِن مغل انڈیا، آئی ای ایس ایچ آر V(2) جون 1928ء ص160 پر اے جے قیصر ایسا لگتا ہے کہ یہ نہ سمجھ پائے کہ اکبر نے کیا کیا تھا اور مسئلے کو اس نے کس طرح حل کیا تھا اس کے بارے میں لکھا کہ اس نے جہاز کو ایک بڑی کشتی پر ٹکایا تھا۔جہازوں کو اس طرح اٹھانا عملاً ناممکن ہے ہرصورت ابوالفضل کا بیان بالکل واضح ہے کہ جہاز کو ڈیک پر بنایا گیا تھا۔(بنانا= برسازند اور ڈیک=برفراز)۔

63- دیکھئے ای ایل ایس، ایم۔جیکوبس۔اِن پرسوٹ آف پیپر اینڈ ٹی: دی اسٹوری آف دی ڈچ ایسٹ انڈیا۔کمپنی۔ایمسٹرڈم/زٹ فین 1991ء ص34۔ایجاد کی تاریخ اور موجود کا نام (میوس مینڈرز بیکر) مجھے ڈاکٹر جیکوبس نے خود یکم جولائی 1993ء کو مہیا کیا تھا۔جہاز کے کیمل کو پھر بڑے شپ یارڈ پیٹر میں استعمال کیا گیا تھا۔(او۔ای۔ڈی۔

ایس وی۔کیمل 2اے۔1716اقتباس)

64- اکبر نامہ III ص 728-727۔آئین اکبری۔بلوخ مان ایڈیشن (1) ص 203-202 غوراب کے لئے دیکھئے یول اینڈ برنل۔ریو۔کروک،ہوبسن۔جوبسن ص 93-392

65- ایچ۔ایم۔ایلیٹ اور جے ڈوسن۔ دی ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اِٹس اون ہسٹوریز۔لندن 70-1867 (VI) ص 92۔ میں نے انڈیا آفس میں ایم۔ایس دیکھا تھا۔ای ٹی ایچ ای 290 ایف 189 اے۔پی۔

66- بدایونی۔منتخب التواریخ (II) ص 65-264 (67) ایضاً ص 265

67- اکبر نامہ III ص-65

68- زبدۃ التواریخ۔آئی او۔ایم ایس۔ای ٹی ایچ ای 290 ایف 190 بی

69- اقبال نامہ جہانگیری۔نولکشور لکھنو 1870 (II)۔ص 441۔نورالحق کا کام معتمد خان کے کام سے پہلے کا ہے جس میں (II) ص 479 تازہ تاریخ جہانگیر کی 15 آر۔وائی شہریار دی گئی ہے (اگست۔ستمبر 1620ء)

❁❁❁❁❁

اکبر کی سرپرستی میں
مصوری بطور بیانیہ فن

سوم پرکاش ورما

اکبر کی زیر سرپرستی مصوری زیادہ تر کتابوں کے حوالوں اور بیان کیے منظروں سے جڑت رکھتی تھی۔ اسے ہم زیادہ جامع انداز میں بیانیہ فن بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس حیثیت سے اس کی جڑیں ایرانی اور ہندستانی دونوں آرٹ میں ملتی ہیں۔ (مجسمہ سازی اور مصوری دونوں)۔

اپنے نمایاں اسلوب کے ساتھ مغل اسکول (مکتبہ فکر) 1580ء سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس پر صفوی اور تیموری دونوں روایات کی چھاپ تھی اس کے ساتھ کچھ اثرات کلاسیکی ہندستانی اسکولوں کے بھی مرتب ہوئے تھے جیسے کہ اجنتا اور پوربی ہندستانی اسکول۔ مسودوں کی مصوری کے معاملے خصوصاً آخرالذکر کے اثرات واضح تھے۔ اس کی بہترین ابتدائی پکی شہادت کا حوالہ طوطی نامہ (توتی نامہ) کی وضاحتی تصویریں ہیں جس کا حوالہ ایم۔ ایس۔ کلوے اینڈ میوزیم آف آرٹس کلیوے لینڈ (70-1565ء) میں محفوظ ہے، انوار سہیلی ایم۔ ایس۔ سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن 1570ء میں محفوظ ہے اور حمزہ نامہ 80-1565ء کے اجزاء۔ احتیاط کے ساتھ مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بصری بیان کاری کے مختلف روپ جو یہاں دستیاب ہیں بعد میں مغل اسکول تک پہنچے اور جاری رہے تھے۔ گو کہ ان کی پے چیدگی میں بڑھت ہو گئی تھی۔ مغل تصویر کاری کی روایت کتابوں کی وضاحت کے روپ میں مختلف قسموں کی ہے۔

فن کار کے اظہار کا سادہ ترین روپ جو مغل بیانیوں کے نمائندے ہیں طوطی نامہ کی مصوری میں نظر آتا ہے۔اس میں ہمیں واقعاتی سلسلوں سے کلیدی مناظر کے انتخاب ملتے ہیں اور ایک ہی سطح پر مختصر روپ کاری ملتی ہے۔اس قسم کے مناظر اس طرح تصویر کئے گئے ہیں کہ دیکھنے والا (ناظر) واقعاتی سلسلے کو پہچان لے۔اس ایم۔ایس میں جب کہ ایک واقعاتی سلسلے کے لئے ایک ہی منظر دکھایا جاتا ہے تو وہ دیکھنے والے کو بہ زبان خود کہانی بیان کرنے میں بہت کم مددگار ثابت ہوتا ہے کیونکہ واقعہ کے ابتدائی اور بعد والے حصے تصویر کار کے بیان کا حصہ نہیں بنتے ہیں (یا تصویر ان حصوں کی نشاندہی نہیں کرتی ہے) اس طرح ایک پھٹکر منظر کی نمائندگی تنہا ہی رہ جاتی ہے اور واقعہ کے اجراء کے تسلسل کی روپ کاری نہیں ہو پاتی ہے۔اس کا یہ نتیجہ ہے کہ اس طرح کے بیانیہ بصری فن زمان و مکان کے تصور سے محروم ہوتے ہیں۔ان میں صرف واقعے کی بنیادی شکلیں ہی منظر میں دکھائی دیتی ہیں اور ان ہی کے گرد پورا عمل چکر لگاتا ہے۔

طوطی نامہ کی مصوری اس طرح ایک پھٹکر منظر کی نمائندگی تک محدود رہتی ہے یعنی اکتیسویں رات کا ایک واقعاتی سلسلہ (ایم۔ایس۔فولیو 207 آر) میں واقعہ یا کہانی ہے کہ کس طرح شیر کی کھال پہنے ہوئے ایک گدھا بھوں بھوں کر کے اپنی پہچان کا انکشاف کرتا ہے۔ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے۔(1) اس کے پاس ایک گدھا تھا مگر گدھے کو کھلانے کے لئے کٹی سوکھی گھاس خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔گدھے کے لئے چارے کے فقدان کی وجہ سے بیوپاری کا کاروبار گرتا جارہا تھا۔بے چارہ گدھا بھک مری کی وجہ سے مرنے کے قریب پہنچ گیا تھا۔

بیوپاری نہ صرف اچھے کردار کا آدمی تھا بلکہ عقل مند بھی تھا۔اس نے ایک شیر کی کھال حاصل کی اور ہر رات وہ گدھے کو شیر کی کھال پہنا دیا کرتا تھا اور اسے قریب کے کھیتوں اور باغوں میں آزادی کے ساتھ گھومنے کے لئے چھوڑ دیتا تھا۔اس نے گدھے کو ہدایت کردی تھی کہ جب بھی کوئی چوکیدار قریب آئے تو اپنے بائیں گھٹنے کو فوراً موڑے اور خاموشی سے چوکیدار کے سامنے ڈٹ کر کھڑا رہے۔اتنا ہی چلے جتنا کہ پہنی ہوئی کھال کے ساتھ وہ چل سکتا ہے لیکن چوکیدار کو یہ موقع نہ دے کہ وہ اسے پہچان جائے۔اپنی بھوں بھوں کی آواز ہرگز نہ نکالے تا کہ

اس کی اصل صورت و سیرت چھپی رہے۔

گدھے نے ہدایات پر عمل کیا اور سب کو خوب بدھو بنایا۔

چند دن بیت جانے کے بعد گدھے کی صحت اپنی اصل پر واپس آ گئی اور کم وقت میں اس نے اپنا اصل وزن بھی حاصل کر لیا۔ پڑوسیوں کو چونکہ بھروسہ تھا کہ وہ واقعی شیر ہی ہے اس لئے انہوں نے اپنے کھیتوں اور باغوں میں جانا چھوڑ دیا۔

ایک رات گدھا ایک کھیت میں گیا۔ نگرانوں نے گدھے کے پنجے کو دیکھ لیا اور ایک درخت پر چڑھ گئے۔ اسی وقت قریب سے ایک گدھے کے بھوں بھوں بھوں کی آواز آئی۔ بیوپاری کے گدھے نے بھی جیسا کہ گدھوں کی فطرت ہے۔ بھوں بھوں بھوں کرنا شروع کر دیا اور اس طرح یہ چور پکڑ میں آ گیا۔

اس خاص آواز سے نگرانوں نے گدھے کو پہچان لیا تھا۔ وہ درخت سے اترے۔ گدھے کو پکڑ کر درخت سے باندھ دیا، اس کی خوب پٹائی کی اور جو خوف اور پریشانی اس نے پیدا کی تھی اس کی سزا دی۔

چھوٹی وضاحتی تصویر جب کہ وہ ایک گدھے کو ایک کھیت کے بیچ شیر کی کھال پہنے ہوئے بھوں بھوں کرتے اور نگرانوں کو درختوں کے پتوں کے بیچ چھپا ہوا دکھایا گیا ہے جو گدھے کی آواز سن کر چونکتے ہیں صرف کہانی کے ایک حصے ہی کی وضاحت کرتی ہے جس کو اوپر کے آخری اقتباس میں بیان کیا گیا ہے۔ (پلیٹ نمبر 1)

ایک ہی پھٹکر منظر میں دکھائی دینے والے منظر کو ڈگلس بیرٹ اور باسل گرے نے بیان کرتے ہوئے ان کا ماخذ ہندستانی روایت قرار دیا ہے۔ (2) طوطی نامہ کے بیانیوں کی خصوصیت جب سے کہ بصری بیانیہ کا آرٹ سادہ سے گزر کر پیچیدہ ہو گیا تھا۔ مغل اسکول میں غائب ہوتی جا رہی تھی۔ ایک ہی پھٹکر منظر میں متن کی بیانیہ حرکات کی نمائندگی بڑی حد تک متروک ہیں اور یوں ان میں تصویری عمل کے اظہار کے امکانات ہمیشہ ہی محدود رہتے ہیں۔ ایسی مثالوں میں تصویری خاکے کا ڈرامائی پہلو ہی وہ قوت ہے جو دیکھنے والے کو کہانی سے اسے مربوط کرنے کی تحریک فراہم کرتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض صورتوں میں جیسے کہ فولیوز 37 وی، 43 آر، 51 وی، 102 وی، 223 وی، 282 وی اور 316 آر پر تصویری خاکے نہ ہی کہانی کو کھولتے

ہیں اور نہ ہی اس کے کسی ایک حصے کونشان زد کرتے ہیں۔(3) ان کا مقصد ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی تدریس اور خالصتاً سجانا اور سنوارنا ہے۔ یقیناً ان صورتوں میں ایک منظر کا بصری شمار مکرر ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ فنکار کا مقصد نہیں ہے۔(پلیٹ۔II)۔

ایک واقعہ کے مسلسل بیان بیانیہ تحریر میں اکثر انوار سہیلی میں نظر آتی ہیں۔ جو کہ طوطی نامہ کی معاصر ہے۔ ورنہ عموماً یہ اس مسودے میں بھی ایک پھٹکر منظر ہی کی نمائندگی شامل ہے۔ اس میں ایک تصویر کی سطح کے اندر کہانی یا ایک واقعے کے ایک سے زیادہ مرحلے جو نمائندگی کے لئے چنے گئے ہیں۔ آخر یا نقطہ انتہا (کلائمکس) سے منتخب کئے گئے ہیں لیکن چتر کار دو مرحلوں کے درمیان فقط تفریق متعین نہیں کرتا ہے (یعنی سرحد) اور ان کو ایک ہی پھٹکر بصری سطح یا میدان میں دکھاتا ہے۔ ان مرحلوں کی پہچان کرنے کا صرف اشارہ مختلف جگہوں میں اصل صورت کا دہرانا ہے جس کو فنکار بیانیہ مختلف جگہوں میں دکھاتا ہے۔ ایک واقعہ کے یہ تمام مراحل کہانی کی یکے بعد دیگرے حرکات تعلق کی وضاحت کرتے ہیں اور تصویر میں زمان و مکان دونوں کو مجوز کرتے ہیں۔ انوار سہیلی میں فولیو 232 آر ایک بوڑھے کسان کی غدار جواں بیوی کی کہانی کی وضاحت کرتا ہے جو ایک شہزادے کے ساتھ چھپ کر بھاگ گئی تھی۔ راستے میں جب وہ ٹھنڈے پانی کے ایک چشمے کے کنارے آرام کر رہے تھے ایک شیر نے اچانک عورت پر حملہ کر دیا اور شہزادہ خوف کے مارے گھوڑے پر بیٹھ کر اڑن چھو ہو گیا۔ تصویری خاکے میں اصل کرداروں یعنی شہزادے اور عورت کی صورتوں کو دہرایا گیا ہے۔(4) کتاب کے متن میں نیچے سیدھے ہاتھ کے کونے پر شہزادے اور عورت کو ایک چشمے کے کنارے بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ جبکہ الٹے ہاتھ کے کونے میں عورت کو شیر کے پنجے میں اور شہزادے کو سرپٹ گھوڑے پر بھاگتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔(پلیٹ نمبر III) اس طرح ایک واقعہ کے یکے بعد دیگرے دو مراحل ایک ہی پھٹکر بصری میدان میں پیش کئے گئے ہیں تاکہ واقعہ جو مختلف وقتوں میں واقع ہوتا ہے تسلسل کو بیان کیا جائے۔ مغل بیانیہ مصوری میں اصل کرداروں کی صورتوں کو دہرانا بہر حال اچنبھے کی بات ہے۔ فارسی کتاب کے تصویری خاکوں میں بھی دہرانے کا یہ عمل نہیں ملتا ہے۔ ہندستانی فن میں اس کا پہلا مظاہرہ گندھارا اور متھرا کے مجسموں میں ہوا ہے۔(پلیٹ IV اور V)۔(5) اس بیانیہ طریقہ کی ایک مثال سانچی کے اسٹوپاؤں (پہلی صدی قبل مسیح کے

آخری نصف میں) اور اجنٹا کی تصویر شکلوں میں نظر آتی ہے۔(6) مغل اسکول میں مسلسل بیان حمزہ نامہ کے تصویری خاکوں میں ظاہر ہوا ہے۔ جس میں ایک واقعہ کے کئی مراحل ایک ہی ہٹھکر بصری میدان میں دکھائے گئے ہیں۔ یہ کئی مراحل (ایک واقعہ کی اکائیاں) مرکزی خیال کے اطراف گھومتے ہیں اور واقعہ کی نمائندگی کو مزید واضح اور بیانیہ کر دیتے ہیں۔ ان میں اصل کرداروں کی صورتوں کو دہرایا نہیں گیا ہے بلکہ تصویر کی سطح کو چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو اصل خیال سے متعلق عمل پر مشتمل ہیں۔ بصری میدان کی تقسیم میں خلاؤں یا جگہوں کا آزادانہ استعمال ہوا ہے جو چھوٹی پہاڑیوں، زمینی ٹیلوں، چشموں، نباتات اور عمارتی ستونوں وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ یہ وہ ٹیکنیک ہے جس سے اجنٹا کے مصور خوب واقف تھے۔(7) لیکن ان کا اسی طرح استعمال ایرانی ایم۔ ایس تصویروں میں سکہ رائج تھا۔ (پلیٹ VII)۔

عموماً پندرہویں وسولہویں صدیوں کے فارسی بیانیہ فن میں بصری میدان کو دو یا دو سے زیادہ اکائیوں میں توڑنے کا رجحان سکہ رائج تھا لیکن یہ اکائیاں فنکار کی کوششوں کی ناموجودگی میں اپنے مابین کسی قسم کا تعلق ظاہر کرنے کا پتہ نہیں دیتی ہیں بلکہ علیحدہ سی نظر آتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیانیہ کے موزونیت کے اثر میں نقص پیدا ہو گیا۔ مغل فنکاروں نے اس کمی کو دور کیا اور اکائیوں کو آہنگ کی حرکات اور چہرے کے تاثرات کے ذریعہ جوڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے کاموں میں کچھ اجزا آزاد، جلی اور زیادہ پرزور تاثر کا اظہار کرتے ہیں جن کا فارسی مصوروں نے شاید ہی کبھی اظہار کیا ہو۔(8) آہنگ کی حرکت نے نہ صرف صورتوں کے مابین تعلق قائم کیا بلکہ فطرت نگاری کو بھی بڑھاوا دیا۔ بیرٹ اور گرے نے اس تعلق کی بطور نفسیاتی صورت کے درمیان تعریف متعین کی ہے اس کے برعکس ایرانی تصویروں میں یہ تعلق بالکل ہی رسمی سا ملتا ہے۔(9) طوطی نامہ کے بیانیوں میں بھی صورتوں کے مابین نفسیاتی تعلق کو قائم رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ پرمود چندرا اور ڈینیل جے ایہوم کہتے ہیں کہ حمزہ نامہ کے تصویری خاکوں میں جوش، داخلی موزونیت اور اکائی نظر آتی ہے یقیناً مقامی عناصر کی کارکردگی ہے جو مغل فن کی تشکیل کرتی ہے۔(10)

اس قسم کے تحریری متون اپنی سب سے زیادہ پختہ صورت میں تاریخ خاندان تیموریہ 87-1584ء کے تصویری خاکوں میں ملتی ہیں۔ (خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ) اس

کے علاوہ جامع التواریخ 98-1597ء (امپیریل لائبریری تہران) اور اکبر نامہ 5-1602ء (وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم لندن) میں بھی ملتی ہیں۔ یہاں ہم ایک ہی پھٹکر تصویری خاکے میں بصری میدان دیکھتے ہیں جو تین سے لے کر چار اکائیوں کو جن میں ایک واقعہ کی یکے بعد دیگرے تفصیلات شامل ہیں جگہ فراہم کرتا ہے۔ اس قسم کے بندوبست کی ایک نمایاں مثال سلطان محمود کی لڑکیوں تاریخ خاندانِ تیموری میں بیاہ کے تصویری خاکے ہیں۔ (11) ان میں بصری میدان چار اکائیوں کو جگہ دیتا ہے۔ بالائی آدھے کو ترچھے خط میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بادشاہ اور امراء (امراء کسی موقع پر بادشاہ کو مبارک باد دیتے نظر آتے ہیں) اور شہزادوں کو جن کے سامنے کنیزیں حاضر ہیں دکھاتا ہے۔ دوسرے زیریں آدھے میں دو الگ الگ گروہوں میں سنگیت کاروں کو دکھایا گیا ہے۔ سب سے پہلے خواتین سنگیت کاروں اور رقاصاؤں کا ایک گروہ آتا ہے، اس کے بعد محل کے باہر کے نقار خانے کے سنگیت کار آتے ہیں اور اپنا کام دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں جبکہ مصاحبین تحفے تحائف لئے دکھائی دیتے ہیں۔ (پلیٹ VIII)۔ یہاں اکائیوں کو عمارتی انداز سے خصوصاً دیواروں کے ذریعہ الگ کیا گیا ہے۔ ان میں اوپر کی طرف جاتی ہوئی ترچھی لکیروں کا سلسلہ بے ترتیب انداز میں نظر آتا ہے۔ ایک اور مثال میں فتح پور سیکری میں اکبر کے دوسرے بیٹے کے جنم پر منعقدہ تقریب مسرت کا منظر ہے۔ بصری میدان پانچ اکائیوں پر مشتمل ہے۔ سب سے اوپر کی اکائی ملکہ کو بہت سی کنیزوں کی موجودگی اپنا نیا جنم لینے والے بیٹے کو لئے دکھایا گیا ہے۔ اس سے متصل اوپر دائیں طرف خواتین مصاحب کسی کام میں مصروف نظر آتی ہیں۔ اوپر کے ٹھیک نیچے کے یونٹ میں دو اکائیاں خواتین سنگیت کاروں اور رقاصاؤں کو پیش کرتے ہیں جبکہ جوتشیوں کا گروہ زائچہ بنانے میں مصروف نظر آتا ہے۔ آخری نیچے کی اکائی میں نقار خانے کے سنگیت کار مرد رقص کرنے والوں کے ساتھ محل کے باہر دکھائی دیتے ہیں۔ (پلیٹ IX)۔ (12)

اوپر بتائے گئے بیانیہ طریقے تسلسل کے ساتھ اکبر پر عمل میں رہے تھے۔ سوائے بیانیوں کی دوسری قسم کے جن میں اصل کردار کو بار بار دکھایا جاتا تھا۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانہ اقتدار کی بیانیہ مصوری کے بارے میں بھی یہ بیان اتنا ہی درست ہے۔

مغل مصوروں میں دوسمتی میدان پر تین سمتی حقیقت کو پیش کرنے کی صلاحیت کم تھی۔

اس لئے مسلسل بیان پیش کرنے کی کوشش والے تحریری متون میں وہ اکثر عمودی صورت میں ایک واقعہ کے مختلف مراحل کو مرتب کرتے تھے۔عمودی صورت سے اوپر جاتے ہوئے اس قسم کے بیانیوں میں ایک واقعاتی سلسلے کی اکائیاں ایک دوسرے پر پیش کی گئی ہیں جن کے درمیان تفریق کا کوئی مستحکم خط یا لکیر نہیں ہے گو کہ بصری میدان میں رکھی گئی جگہیں دیکھنے والے ان میں پہچان کرنے میں مدد کرتی ہیں۔

عمودی ترتیب میں معروضات بہ یک وقت آنکھ کی سطحوں پر (براہِ راست نظارہ) اور اوپر سے (طائرانہ نظارہ) دکھائے گئے ہیں۔ہاجک کا مشاہدہ ہے کہ اجنٹا میں دیکھا جانے والا بیانیہ کے اس طریقے کو تناظر کے استعمال سے بودھ فنکاروں نے بہتر بنایا تھا جس میں براہ راست نظارہ اور طائیرانہ نظارہ شامل تھے۔(13) نظاروں کی اس پے چیدگی کو کرم رش نے تناظری کثرت کا نام دیا ہے۔(14) وِدیا دیہجیا نے اجنٹا کے غار نمبر 17 ایک عمودی ساخت کا مسلسل بیانیہ دیکھا ہے۔اس کا عنوان ہے''آسمانوں سے بدھا کا زمین کی طرف سفر۔''(15) بیانیہ کا یہ طریقہ سکہ بند فارسی ریت سے یقینی انحراف کی نشاندہی کرتا ہے۔اس انحراف کی پہلی مثال اکبر کے تصویر خانے میں حمزہ نامہ کے چھوٹے تصویری خاکوں کی ہے جس میں تصویری مکان کے ساتھ ایک منفرد برتاؤ کیا گیا ہے اور جس میں میدان کے پیچھے میدان کا اہتمام کیا گیا ہے یعنی ذیلی منظروں کو پس منظر میں تصویر کیا گیا ہے۔اظہار کا یہ اسلوب ہندستانی بنیاد سے مربوط ہے نہ کہ ایرانی بنیاد سے۔(16) اس تناظر میں ابو حمد کی چھوٹی تصویر پر اینگھاسن کا مشاہدہ کہ اکبر ایک ننھی سی تصویر اپنے باپ ہمایوں کو پیش کر رہا ہے (1559ء سے پہلے کی) اہم ہے۔موضوع کی سرگرمی، مصوری کا حقیقت پسندانہ انداز اور دیوار کے باہر اصل منظر کے پیچھے جس طریقے سے مصاحبوں اور ملازموں کو دکھایا گیا ہے ہندستانی اسلوب کی نفی کرتا ہے۔(17)

مغل مصوروں کی یہ معتبری کہ مسلسل بیانیوں میں وہ خلاؤں یا جگھوں کا آہنگ تخلیق کرنے کے لئے بھرپور استعمال کرتے تھے۔چھوٹی اکائیوں کو بے ترتیب لکیروں میں بنانا جو ایک پھنکر بصری میدان میں ہوں حرکت کا بھی تاثر دیتی ہیں اور تصویر کی گہرائی کو بھی بڑھاتی ہیں۔اسی طرح معروض کو ترچھی لکیروں کے ساتھ رکھنا (اصل کرداروں کو) عمل انگیز بیانیوں

کے لئے نہایت موزوں تھا۔ والٹر ایم اسپنک اور دے بورا لیوائین کا مشاہدہ ہے کہ بصری بیانئے جن کو دھماکہ خیز جسمانی عمل اور جوش کے ساتھ نشان زد کیا گیا ہے جو اکبر نامہ میں ملتے ہیں بتاتے ہیں کہ فنکاروں کا یہ موقف ہے کہ ترچھی لکیروں سے ابھرنے والی معنویت کی عمودی یا ارضی کے مقابلے میں زیادہ قوی ہوتی ہے۔ بیانیوں پر ان کی آراء جیسے کہ ملازمین کا کشتیوں کے پل پر ہاتھیوں کا پیچھا کرنے کا منظر دیکھنا اور رنتھمبور پر حملے کے دوران بیلوں کا توپوں کو کھینچنا، بہت ہی مفید اور قیمتی حوالے ہیں۔(18) جن کو پڑھنا چاہئے۔ ''کڑکتے گرجتے ہاتھیوں کا ترچھی لکیر کے ذریعہ کھنچاؤ تحریری متن کا ڈھیر ہوتے دکھائی دیتا ہے اس طرح دکھائی دیتا ہے جیسے وہ تحریری متن ہی کو توڑ پھوڑ دے گا کیوں کہ وہ کمزور تختے کے پل کو گرا دینے کے خطرے کا احساس دلاتا ہے۔ حتیٰ کہ تصویری ڈھانچے میں بھاگتا ہوا رن باغ ڈھانچے کو عبور کر جاتا ہے جس کے نتیجے میں کل مزید تناؤ کی صورت میں آجاتا ہے۔ ہم اس مضبوط ترچھے محور کو اکبر نامہ کے دوسرے تصویری خاکوں میں بھی دیکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ متنی تحریر کا مقبول طریقہ تھا۔ اس منظر میں دو تصویری خاکوں میں سے ایک جو وکٹوریا اور البرٹ مسودے کے سامنے کے صفحات میں ہے ملحق اٹھان کو ڈرامائی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ فنکار مسکین نے دو مضبوط ترچھے محوروں سے کام لیا ہے جن میں ایک دوسرے کو واضح زاویئے سے ابھارتا ہے۔۔۔ اور جو بڑی ذہانت سے ڈھلوان اور پتھریلے قطعہ زمین کے معنوں کی ترسیل کرتا ہے۔ لوگ اور بیل جب وہ تقریباً عمودی راستے پیدل چلتے ہیں تو ان کی تھکن اور ان کے تناؤ کا تاثر بھی دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے۔ یہ تصویر یقیناً ایک طاقتور تصویر ہے جو پورے اکبر نامہ کے مسودے میں اپنی مثال آپ ہے۔

اسی مسودے کی دوسری مثالوں میں، آگرہ قلعے کی عمارت میں اوپر کی طرف بڑھتی ترچھی لکیروں کا ایک سلسلہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں تربیت یافتہ ہاتھی خان زین کے چیلوں کو مارتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔(19)

صورتیں گو کہ بہت ہی عام انداز میں دکھائی گئی ہیں جو تصویری ڈھانچے سے تجاوز کرتی ہیں صفوی اور تیموری ننھی تصویروں کا ایک قابل توجہ خاصہ مسلسل بیانیہ کے طریقے کی تکمیل کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح بصری میدان کے انتہائی باہری کنارے پر

معروضات کا جزوی روپ دکھایا گیا ہے۔ ان کا کچھ حصہ نظروں سے اوجھل رہ جاتا ہے اور اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ منظر کا تسلسل تصویری ڈھانچے سے پرے جاری ہے۔ فنکاروں نے تصویری ڈھانچے کو منظر کاٹنے کے لئے استعمال کیا ہے اور وہ متوجہ کرتا ہے کہ دیکھنے والا صرف کل ایک حصے کو دیکھتا ہے۔ اس طریقے نے بلاشک بصری میدان کو چوڑائی فراہم کی ہے۔

اس وقت اگرچہ ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ مغل بیانیوں کی تاریخیت کا جائزہ لیں یا قدر و قیمت بتائیں لیکن اس کا مختصر ذکر ضروری ہے کیونکہ وہ ایک واقعہ کے بعض صفحات کے انتخاب سے تعلق رکھتا ہے۔ بیانیہ تفصیلات کے انتخاب سے بھی اس کا ایک تعلق ہے۔ بیانیہ اسلوب کی حد بندیوں کے باوجود فنکار کے طریقہ اظہار میں حتیٰ کہ اسی سے ملتے جلتے خیالات کی پیش کش میں بڑی قسمیں ہیں۔ بیانیہ تفصیلات کے انتخاب میں بھی جو بنیادی واقعات سے متعلق ہوں ایسا نظر آتا ہے کہ فنکار کو بہت آزادی حاصل تھی۔ برٹش میوزیم لندن، نیشنل میوزیم دہلی، میوزیم آف اورینٹل کلچر ماسکو اینڈ فوگ میوزیم شکاگو میں موجود بابر نامہ کی چار مختلف جلدوں کی چار ننھی تصویروں کا موازنہ جو ایک اور ایک ہی جیسے واقعہ (یعنی چڑیا یا پرندے کا شکار) پیش کرتی ہیں یہ طے ہو جاتا ہے کہ تصویروں میں فرق صرف معروضات کی تفصیل میں ہے۔(20) کوئی بھی دیکھ سکتا ہے کہ برٹش میوزیم کی ننھی تصویر جب وہ پرندے کے شکار کرنے والوں کو عمل کے دوران شکار کے مختلف طریقوں سے پیش کرتی ہے زیادہ وضاحتی ہو گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں نیشنل میوزیم دہلی اور ماسکو کے تصویری خاکے تفصیلات کے اعتبار سے نسبتاً سادہ اور ساتھ ساتھ تحریری متن کے اعتبار سے بھی سادہ ہیں۔ اس طرح بصری میدان میں متعارف کرائے جانے والے معروضات کی تعداد اور دوسری تفصیلات جو پس منظر میں ہیں ایک جیسے خیالات کے بیانیوں سے ہمیشہ بدلتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود ننھی تصویر کی پہچان جو متعلقہ کے ساتھ ہے ہمیشہ قائم رہی۔ مزید ایک واقعہ کے پیراگراف کے انتخاب میں بھی فنکار کو منتخاب کی اجازت تھی۔ ایک اور ایک ہی جیسے واقعہ اور متن کی معنوی مانگ کے حوالے کی روشنی میں مواد کی تفہیم کے خاکوں کی ننھی تصویروں کے موازنے کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس ایک مثال ''اکبر کا گدھوں کے شکار کے لئے پاک پٹن جاتے ہوئے راستے'' کی ہے جس کے تصویری خاکے ''تاریخ خاندان تیموریہ 87-1584ء اور اکبر نامہ 1605-1602ء

میں موجود ہیں۔"(21) اس خصوصی واقعہ کو ابوالفضل اس طرح بیان کرتا ہے۔"راستے میں جاتے ہوئے ستلج کے قریب رائے علاؤ الدین کی تلونڈی کی سرحد پر ایک عجیب واقعہ رونما ہوا جس کو وہاں پر اہری کہا گیا۔ اس کا مختصر یہ ہے کہ اسکاوٹوں نے بتایا کہ وہاں جنگلی گدھوں (گورخر) کا جتھا ہے۔ بادشاہ ان کو شکار کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ تین یا چار ماہر شکاری تھے۔ وہ جب میدان کے قریب آیا تو گھوڑے سے اتر کر پیدل آگے بڑھا۔ پہلے وار میں بادشاہ نے ایک گدھے کو زیر کر لیا جبکہ باقی تمام گدھوں کا غول بندوق کی گولی کی آواز سنتے دور بھاگ لئے۔ بادشاہ (جس کی شان و عزت بڑھانے کے لئے ابوالفضل نے دنیوی ہیر و ظل الٰہی جیسے الفاظ لکھے ہیں) نے بندوق اپنے ہاتھ میں پکڑی اور تیزی کے ساتھ تپتی ریت پر آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ وہی اول الذکر تین یا چار ماہر شکاری تھے۔ میدان سے گزر کر وہ جنگلی گدھوں کے غول کے قریب آیا اور اپنی بندوق سے ایک کے بعد دوسرے گدھے کو مارا۔ وہ ان کا پیچھا کرتا رہا اور اس روز بادشاہ نے تیرہ جنگلی گدھوں کو مارا۔ وہ جب بھی ایک کو مارتا تھا تو دوسرے گدھے فوراً بھاگ کر اور دور چلے جاتے تھے۔ اس مہم کے دوران وہ تھک گیا اور پیاس کی شدید خواہش ہوئی۔ اس علاقے میں پانی ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس نے چونکہ اپنے شکار کا پیچھا پیدل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جو لوگ شکار سے متعلق تھے سمجھے کہ بادشاہ ان کے قریب ہیں اس لئے انہوں نے اس جگہ پر نظر رکھی جہاں کھیل ہو رہا تھا اور اپنی جگہ جہاں وہ تھے نہیں چھوڑی۔ بادشاہ جب چند کوس چل چکے تو ان کے ملازم گو کہ انہوں نے تلاش بھی کیا پانی لانے والوں کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہ لگا سکے اور نہ پانی کے کسی چھوٹے سے ذریعہ کو ڈھونڈھ پائے۔ اس کی وجہ سے عجیب صورتِ حال رونما ہوئی۔ پیاس کی وجہ سے کمزوری اس شدت کے ساتھ بڑھی کہ بادشاہ کی قوت گویائی جاتی رہی۔(22)

پہلے ایم۔ ایس۔ کی ننھی تصویر جس میں اکبر کو پیدل اپنے پٹے کے ساتھ گدھوں کا شکار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے وہ واقعہ کے پہلے حصے کا بصری بیان ہے (پلیٹ X)۔ واقعہ کا دوسرا اور آخری مرحلہ اکبرنامہ کے مصور مہیش اور کیسو کا اپنا انتخاب ہے۔ انہوں نے اکبر کو بیٹھے ہوئے اور شکار کے بعد تھکے ہوئے تاثر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کا پٹہ اس کے کاندھے پر ہے اور ملازم و مصاحب بادشاہ کی عجیب حالت کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں۔ (پلیٹ XI)

اس طرح گو کہ واقعہ وہی ہے جو کہ تھا لیکن سلسلے کے حصے کے انتخاب کی جسے بصری میدان میں پیش کیا جانا تھا پسند میں بدلاؤ آیا تھا۔ یقیناً انتخاب ہمیشہ سلسلے کے اہم حصے سے ہی مربوط رہا جس نے دیکھنے والوں کو اسے کہانی سے مربوط کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔

اکثر ایک خاص واقعہ پر زور دینے کے لئے بصری میدان کو بڑھانے کے لئے تحریری متن تصویری خاکوں کے دو صفحات رکھے جاتے ہیں۔ تھانیسر میں سنیاسیوں کے حریف گروہوں کے درمیان لڑائی کا موضوع تاریخ خاندانِ تیموریہ 87-1584ء ایک صفحے کے تصویری خاکے پر مشتمل ہے۔ اور بصری میدان کے بیچ میں بنیادی کرداروں کو پیش کرتے ہیں جبکہ لڑائی کا منظر دائیں ہاتھ کے کونے پر دکھایا گیا ہے (پلیٹ XII)۔(23) اسی واقعہ کا دو صفحات میں تصویری خاکہ جو 1605-1602ء کے دوران کا ہے اور اکبر نامہ میں شامل ہے (وی اور اے) واضح طور پر بیانیہ تفصیلات کے حوالے سے بہت جامع ہے۔(24)

دونوں ہی بصری بیانیوں میں لڑائی کے مقام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں میں پتھر کے چبوترے کے بیچ میں ایک بڑے تالاب کے ساتھ ایک بڑا پیپل کا درخت دکھایا گیا ہے۔ جس کے کنارے لڑائی کا پورا عمل ہوتے ہوئے نظر آتا ہے۔ (پلیٹ XIII اور XIV)۔ اکبر نامہ کے تصویری خاکے واقعہ کے متن سے مطابقت کے ساتھ زیادہ تفصیلات کا احاطہ کرتے ہیں جس کو ابوالفضل نے بیان کیا ہے۔(25) جب وہ (بادشاہ) تھانیسر میں خیمہ زن تھا تو سنیاسوں کے مابین کوئی تنازعہ ابھرا جو خونریزی پر منتج ہوا...... ان کا لیڈر کسو پوری انبالہ آیا، بادشاہ کی قدمبوسی کی اور انصاف مانگا اس کے بعد پوریوں نے کوروں پر پتھروں سے حملہ کر دیا۔ وہ اپنے پیر اور سربراہ آنند کور کے ساتھ آئے تھے اور انہوں نے اذیت دینے والی چیز یعنی آنند کو قتل کر دیا تھا۔

اکبر نامہ کا تصویری خاکہ اکبر کے آدمیوں کو ایک دھڑے پوریوں کے ساتھ ملتے ہوئے دکھاتا ہے جو مخالف دھڑے کوروں پر حملہ کر رہے تھے اور آخر الذکر دھڑے کا سرغنہ آنند کور کو قتل کر دیا تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اوپر کے دو تاریخی تصویروں کے خاکے جو مختلف زمان و مکان میں بنے ہیں اپنے معنوں کے روح کے اعتبار سے متن کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتے ہیں۔ بصری بیانیہ خوبیاں بھی ان کی تاریخی حیثیت کی سند ہیں۔

دو صفحوں کے تصویری خاکے پہلے 87-1584ء میں سول مان سنگھ II، میوزیم جے پور کے ایم۔ایس رازم نامہ میں ملتے ہیں۔(26) عموماً متنی تحریر جو دو صفحوں پر محیط ہے اس بیانئے کے لئے ترجیح دی گئی ہے جو شکار کے مناظر، لڑائی، تقریبات اور طعام کا احاطہ کرتا ہے۔

بعض صورتوں میں ایک خاص واقعہ پر زور دینے کی وضاحت واقعہ کے مختلف مراحل الگ الگ بصری میدانوں کے موضوع کے طور پر کی گئی ہے۔(27) لیکن ان مثالوں میں مسلسل بیانئے کی خوبی اور روح کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

بیانیہ کے بصری اسالیب اور طریقے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے مغلوں کی اختراع نہیں تھے کیونکہ ان کا رواج پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ وہ ہندستان اور ایران کے مجسموں اور تصویروں میں پائے جاتے تھے ان کی عدم سند بصری میدان سے معاملہ کرنے میں کھلتی ہے حتیٰ کہ ان میں بھی جو کثرتِ نظارہ پیش کرتے ہیں جس کی بنا پر ایک واقعہ کی مربوط گتھی ہوئی تصویر بھرپور عمل کے ساتھ نظر آتی ہے۔ بصری میدان جن میں ایک سلسلے دو اور تین سے زیادہ اکائیوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور خلاؤں یا جگہوں میں واقع ہوتے ہیں تاہم باہم ایک ہی رہتے ہیں تاکہ وہ کہانی اور اس کے مختلف مرحلوں کو منکشف کریں۔

مغل بصری بیانئے اپنے قبل از مغل ہندستانی فن کے ہم جزوی سے اور تصویری خاکوں کے روایتی معلمانہ عمل میں واضح طور پر انحراف کرتے ہیں۔ جیسا کہ پوربی ہندستانی اسکول کے ایم۔ایس۔(اور طوطی نامہ کے ابتدائی مغل ایم۔ایس بھی) میں دکھائی دیتا ہے۔ جہاں تصویری خاکوں کا اشتراک سجا سنورا نظر آتا ہے اور محض متن کی اپیل کو بڑھانے کے ذریعہ کے طور پر کام کرتا ہے۔ مغل تصویر خانے میں واقعی بیانیہ تفصیلات کی پیش کش ایک کلاکار کے کام کی بنیاد ہو گئی تھی۔ وہ ہمیشہ معروضات کے جو ایک منظر یا واقعہ کو تصویر میں بیانیہ تفصیلات سے متعلق ہوتے ہیں مکمل صحت اور صداقت سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر اس کے بصری بیانئے مادی کلچر اور نیچرل ہسٹری کی خلوص کے ساتھ پیش کش کی حیثیت سے مانے جاتے ہیں۔ ان پر جب ہم آج نظر ڈالتے ہیں تو ہم خود کو ماضی میں گیا ہوا پاتے ہیں۔ یقیناً ماضی کے واقعات کے معاملے میں فنکار براہ راست متنی تفصیلات کے ساتھ بصری رابطہ پیدا کرنے کا کوئی موقع حاصل نہیں کرتا تھا جیسا کہ روزمرہ کی زندگی سے معاصر سلسلوں اور واقعات کو تصویر کرنا اس کے لئے

ممکن تھا۔اس قسم کے بیانیوں میں بصری میدان میں بیانیہ تفصیلات اپنے تجربے کو کام میں لا کے گو کہ تخیل بھی کردار ادا کرتا تھا فنکار پھیلاتا ہے۔مزید اس کے تصویری بیانئے فطرت میں ڈوبے ہوئی ہوتی ہیں جو ایک خوبی ہے اور جو منظر میں روح بھر ایک واقعہ کے اصل کردار کو ان کے موزوں گردو پیش میں رکھ کر مغل فنکار بصری میدان میں ڈرامہ پیدا کرتا ہے تاکہ متن کے تصویری خاکے کی معنوی مانگیں پوری ہو جائیں۔مغل بیانئے میں بیرٹ اور گرے نے حقیقت نگاری کو ابتدائی تاریخ 1570ء میں تلاش کر لیا تھا۔جب انہوں نے خصوصاً تصویری خاکوں کی تصویر اور عمارت سازی اس کا مشاہدہ کیا تھا جس میں سایہ سازی اور ماڈل سازی کا اطلاق ہوتا تھا۔(28) ایسٹر کہتا ہے کہ مغل اسکول میں ہندستانی تصورات کے ابھار کے بعد ایرانی روایات اور طریقے کمزور پڑ گئے تھے۔(29) مغل فنکار کی انفرادیت بہر حال فطرت کی صورت گری تھی جس کے ذریعہ مادی دنیا کے معروضی خواص تسخیر ہوتے ہیں۔موضوع میں اس گہری دلچسپی نے اس کے بیانئے میں روحانی اور جذباتی پہلوؤں کے اظہار کو بہت محدود کر دیا تھا۔اور یہ وہ رجحان تھا جو ہندستانی روایت کے ٹکراؤ کی نشاندہی کرتا ہے۔مغل مصور کے کام کے ذریعہ حقیقت کو جس طرح سمجھا اس کا بیان ہاجک نے بہت سلیقے سے کیا ہے کہ یہ غیر علامتی (فن) ہے اور صرف اسی حقیقت کا اظہار کرتا ہے جس کو وہ تصویر کے ذریعہ کر سکتا ہے۔(30)

حوالہ جات

1- محمد۔ اے۔ سمسار کا ایڈیشن اور ترجمہ۔ دی کلیوے لینڈ میوزیم آف آرٹس۔ طوطی نامہ۔ ٹیلز آف پیرٹ مصنفہ ضیاء الدین نقش بندی۔ آسٹریا 1978ء ص 199-198 رنگ کا حصہ ص 200 کی طرف۔

2- ڈگلس اور گرے پینٹنگ آف انڈیا۔ کلیوے لینڈ 1963ء ص 83-82 رنگین پلیٹ ص 85 پر۔

3- ان کی نقل کے لیئے۔ پرمود چندر اور ڈینیل جے۔ ایتبوم۔ دی کلیوے لینڈ طوطی نامہ مینوسکرپٹ اینڈ دی اوریجن آف مغل پینٹنگ۔ شکاگو 1976ء پلیٹس 12، ص 25-21۔

4- جان سیلر۔ دی اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز۔ انوار سہیلی۔ دی السٹریشن آف اے ڈیلکس مغل مینوسکرپٹ۔ آرکیوز آف ایشین آرٹس جلد 38 نیویارک 1985ء ص 124 تصویر 12

5- میڈیلین ہالیڈ۔ دی گندھارا اسٹائیل اینڈ دی ایولوشن آف بدھسٹ آرٹ۔ لندن 1968ء ص 133 پلیٹ 97۔ دی گندھارا۔ بس ریلیف (برٹش میوزیم لندن) میں دو واقعاتی سلسلے منظر کے ذریعہ دکھائے گئے ہیں۔ کنورشن آف نندا (200ء)۔ بیچ میں نندا ایک کھانے کا پیالہ بودھا کے پاس لے جانے کو ہے، بائیں طرف نندا پیالہ بودھا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس میں اصل کردار مسلسل بیان کی مانگ کو پورا کرتے ہوئے خود کو دہراتا ہے۔ دیکھیں مزید ایضاً ص 100۔ پلیٹ 72۔ متھرا سے باس ریلیف (سارناتھ اسکول، گپتا اسٹائل، 5 ویں صدی) جو نیشنل میوزیم دہلی میں ہے بدھیستوا کی روانگی کو دکھاتا ہے۔ بودھیستوا اپنا سر منڈواتا ہے اور رسم پوری کرنے کے لئے نیرنجن ندی میں اترتا ہے۔ اسے سجاتا کھانا پیش کرتی ہے جبکہ بدھا گیان دھیان کر رہے ہیں۔ ایضاً۔ ص 202-201 پلیٹ 162

6- ودلے دھیجیا۔ نیریکٹیو لوڈس ان اجنتا کیو۔ 17: اے پری لمنری اسٹڈی۔ ساوتھ ایشین اسٹڈیز جلد 7 لندن 1991ء ص 49-48۔ تصویر 4۔
7- لیو بار ہاجک، انڈین مینیچرز آف دی مغل اسکول۔ پراگ 1960ء ص 31
8- کارل کھنڈالا والا۔ دی مغل اسکول اینڈ اٹس ریمیفیکیشنز، جوڈویلپمنٹ آف اسٹائل اِن انڈین پینٹنگ، دہلی 1974ء ص 70 میں شامل ہے۔
9- بیرٹ اینڈ گرے ص 81
10- پرمود چندر اور اینیون، ص 11
11- سوم پرکاش ورما آرٹ اینڈ میٹریل کلچر اِن دی پینٹنگز آف اکبرس کورٹ۔ دہلی 1978ء ص 18 پلیٹ XIV
12- ایضاً۔ ص 18-17 پلیٹ XIII
13- ہاجک۔ ص 28
14- ایضاً۔
15- ودیا دہیجیا ص 49۔ سن کستا کے مقام پر آسمان سے بودھا کے اترنے کے منظر کو دکھانے کے لئے عمودی ساخت میں مسلسل بیانئے کا موثر انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔ اوپر کی سطح پر بدھا آسمان پر اپنی ماں اور دیوتاؤں کو تعلیم دے رہے ہیں، نیچے آنے کے منظر کو درمیانی حصے میں دکھایا گیا ہے۔ نچلی سطح پر ان کو زمین پر دکھایا گیا ہے جو بھکشوؤں کو تعلیم دے رہے ہیں۔
16- باسل گرے اور لے ایشٹن۔ ایڈیشن۔ دی آرٹ آف انڈیا اینڈ پاکستان۔ لندن 1940ء ص 93
17- رچرڈ ایٹنگھاسن۔ عبدالصمد۔ انسائیکلوپیڈیا آف ورلڈ آرٹس۔ نیویارک جلد 1 ص 19 پلیٹ 16
18- واٹر اسپنک اور ڈبورالیوائین۔ اکبرنامہ۔ کیٹلاگ نیویارک۔ تاریخ ندارد پلیٹیں اور متون نمبر 4-3 اور 16-15۔
19- ایضاً۔ پلیٹس اینڈ ٹیکسٹس نمبر 8-7 اور 21 دیکھیں نمبر 22 بھی۔
20- دیکھیں حامد سلیمان۔ مینیچرس آف بابر نامہ۔ تاشقند۔ 1970ء رنگین پلیٹ 27،

ایس۔آئی۔تلیو۔میںیچرس آف بابر نامہ۔ ماسکو 1960ء پلیٹ 15۔ ایم۔ایس۔ رندھاوا۔ پینٹنگ آف بابر نامہ، دہلی 1984ء رنگین پلیٹ VIII۔ایس۔سی۔ویلچ آرٹ آف مغل انڈیا: پینٹنگ پریس آو بجکیٹس۔ نیو یارک 1963ء پلیٹ 9۔اور دیکھیں سوم پرکاش ورما۔ٹریٹ مینٹ آف سملر تھیس، اے اسٹڈی بیسڈ آن دی السٹریشنز آف تزک بابری۔ پروسیڈنگز آف انڈین ہسٹری کانگریس چندی گڑھ 1973ء ص 94-293

21- تاریخ میں 331 الف فولیو پر مینیچر۔ایم۔ایس۔غیر مطبوعہ۔اکبر نامہ کی نقول کے لئے دیکھیں۔گیتی سین۔پینٹنگز فرام دی اکبر نامہ، دہلی 1944ء ص 137۔رنگین پلیٹ 60

22- ابوالفضل۔اکبر نامہ ایڈیشن۔متن جلد II ص 360-359 ترجمہ جلد II ص 522

23- تاریخ میں 322 اے کے فولیو پر مینیچر۔ایم۔ایس۔غیر مطبوعہ

24- سین۔ص 109-105 رنگین پلیٹس 44-43

25- اکبر نامہ ایڈیشن۔متن، جلد دوم ص 87-286 ترجمہ جلد دوم ص 24-422

26- ٹی۔ایچ۔ہنڈلے۔رزنامہ۔میموریل آف جے پور ایکزبیشن۔1883ء IV، جے پور پلیٹیں: lxxii-lxxiii-lxiv-lxv-lxi-lxii-xlvii-xlviii -cxxxix-cxl-cxxvi-xxxvii۔

27- ٹی۔ڈبلو۔آرنلڈ اینڈ جے۔وی۔ایس ولکنسن۔ لائبریری آف چیسٹر بیٹی۔ اے کیٹلاگ آف دی انڈین مینیچرس۔لندن 1936ء پلیٹیں 39 الف۔ب۔ 43 الف۔ب۔44 الف۔ب۔

28- بیرٹ اینڈ گرے ص 81

29- ایم۔آر۔ایسٹر۔ برڈس اینڈ اینیملس ان مغل پینٹنگ۔بلٹن آف دی کالج آف آرٹس۔جلد اول بغداد۔1959ء ص 16

30- ہاجک: ص 23۔

❁❁❁❁❁

فتح پور سیکری کا سفرِ مکرّر

چند عمارتوں کی تشریح

سید علی ندیم رضوی

چار جلدوں میں شائع ہونے والے ای۔ ڈبلو۔ اسمتھ کے شاندار کام کے بعد سے فتح پور سیکری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے جو کہ اکبر کا شاہی شہر تھا۔ بہت سے مضامین اور مقالات کے علاوہ جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے بہت سی کتابیں بھی اس موضوع پر ملتی ہیں۔(1) ایک مشکل مسئلہ عمارتوں کی نام کاری کا ہے کیونکہ مختلف لیکھکوں نے ایک ہی عمارت کے مختلف نام لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مقبول اوصاف کا ہے جو پچھلی صدی میں اکثر رائج رہا تھا اور ماہرین آثار قدیمہ اور مورخوں نے اسے مانا ہے۔ ایک حالیہ کام میں شان دار عمارتوں کو دو وسیع قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے اول وہ جن کا ذکر فارسی ماخذ میں ہوا ہے اور دوم جن کا ذکر فارسی ماخذ میں نہیں ہوا ہے۔(2) اس شہر سے متعلق ایک اور تنازعہ کا تعلق زمانہ موجود کی تاریخ سے ہے۔ کیا فتح پور ایک منصوبہ بند شہر ہے جیسے کہ بعد میں اکبر کے پڑپوتے شاہجہاں نے منصوبہ بندی کے تحت شاہ جہاں آباد بسایا تھا۔ اے۔ پیٹرو کیوٹی ہمیں اول الذکر نقطہ نظر کی طرف متوجہ کرتا ہے۔(3) حالانکہ دستیاب تمام ماخذ کا مطالعہ اس کے برعکس نتائج فراہم کرتا ہے۔ وقت کے تناظر میں اب بہت مفید معلومات آثار قدیمہ کے کاموں سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ 1970ء میں آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ماہرین آثار قدیمہ نے اور شعبہ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مشترک ٹیم نے محل کے علاقے کی کھدائی کی تھی اور کئی مقامات پر کھدائی کی تھی۔ ان

میں امراء کے محل، علاقے، بازار، اصطبل اور حرم وغیرہ ہیں۔ اس کی تفصیلی رپورٹ ابھی شائع ہونا ہے۔(4)

زیر نظر مقالہ بعض ساختوں کی پہچان کو جاننے کی کوشش جو کہ اس حقیقت کے باوجود کہ بعض نام نہاد پرانی ساختیں بہر حال یقیناً معاصر تذکرہ نویسوں کے بیان کی ہوں گی مگر اب تک دانشوروں کی نظروں سے اوجھل رہی ہیں۔ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ اختصار کی صورت میں فتح پور سیکری کے آثار قدیمہ کے نتائج کو پیش کیا جائے جس پر پہلے میں نے مئی 1989ء میں کام شروع کیا تھا اور اس کے بعد مختلف موقعوں پر کام کرتا رہا یہاں تک کہ اکتوبر 1992ء میں کام پورا ہو گیا تھا۔(5)

فتح پور سیکری کا سب سے زیادہ مفصّل معاصر بیان فادر مونسریٹ نے قلمبند کیا ہے جس نے 1580ء میں دربار دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ فادر ایکوی ویوا اور فادر ہینریق بھی تھے۔ وہ لکھتا ہے۔ ''دوسرے ہندستانی بادشاہوں کے بنوائے ہوئے محلوں کے برعکس وہ (فتح پور سیکری کے محل) بلند قامت ہیں۔ ہندستانی محل عموماً اتنے کم قد کے ہوتے تھے جتنے کہ بتوں کے مندر ہوتے ہیں مگر فتح پور کے محلوں کا مجموعی گھیراؤ اتنا بڑا ہے کہ اس میں آسانی کے ساتھ چار بڑے پھیلاؤ رکھنے والے شاہی افراد سما سکتے تھے۔ ان میں بادشاہ کا اپنا محل سب سے بڑا اور بے حد خوبصورت ہے۔ دوسرا محل ملکاؤں کے لئے ہے اور تیسرے میں شاہی شہزادے رہتے ہیں جبکہ چھوٹے محل کو بطور گودام اور اسلحہ خانے کے استعمال کیا جاتا ہے۔''(6)

بادشاہ کا اپنا محل دو حصوں میں تقسیم تھا اول دولت خانہ اور دوئم دیوان خانہ عام۔ دولت خانہ کا بیان کرتے ہوئے بدایونی نے اسے دولت خانہ عام لکھا ہے اور ہمیں جانکاری دیتا ہے کہ اس میں ایک سو چودہ محرابیں تھیں۔(7) یہاں سے بادشاہ اپنے عوام کے سامنے آتا تھا اور اس میں چار صدر دروازے تھے۔ اس کے علاوہ ایک صدر دروازہ بادشاہ کے اپنے داخل ہونے کے لئے الگ تھا۔ ان دروازوں کی حفاظت ایک محافظ یا چوکیدار کرتا تھا۔ مانسریٹ کا اقتباس ہے۔ ''محل کے صدر دروازوں میں ایک پر مختلف قسم کی زنجیریں، رنگس اور ہتھ کف؟ اور دوسری لوہے کی چیزیں لٹکتی تھیں جس کی حفاظت کے لئے عملہ مقرر تھا۔ دوسرے تین صدر دروازوں کی حفاظت کے لئے دربان بازی گروں کا خصوصی تربیت کار اور ہرکارہ ترتیب کے ساتھ مقرر

تھے۔(8)

غالباً دربان خاص اس صدر دروازے پر کھڑا ہوتا تھا جو ہال کے سامنے جس کے ساتھ کنول ستون دولت خانہ خاص میں کھلتا تھا۔خصوصی ڈاک ہرکارہ اس دروازے کے قریب موجود رہتا تھا جو آگرہ دروازے کی طرف جانے والی سڑک کو جوڑتا تھا جو چہار سوق بازار سے گزرتی تھی۔شہر جانے کے لئے یہ سب سے چھوٹا راستہ تھا۔حوض شیریں کی طرف کھلنے والا دروازہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص دروازہ تھا جس کے ذریعہ امراء اوران کے ساتھ مصاحبوں کو راستہ فراہم کرتا تھا۔اس گزرگاہ کے مقام پر غالباً جلاد خاص کھڑا رہتا تھا تاکہ گزرنے والوں کے ذہنوں میں خوف پیدا ہو۔ بازی گروں کا تربیت کار خاص دکن کی طرف کھلنے والے دروازے کی نگرانی کرتا تھا۔ایک چھوٹی تصویر کسی بازی گر کے داخل ہونے کا منظر دکھاتی ہے جس کے ساتھ اس کے جانور بھی دروازے سے گزرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔(9)

دولت خانہ خاص سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اول دولت خانہ اور دوم دولت خانہ انوپ تلاؤ۔(10) اس علاقے میں داخلے کی بہت کم لوگوں کو اجازت تھی یا وہ لوگ آسکتے تھے جن کو بادشاہ نے بلایا ہو۔دولت خانہ انوپ تلاؤ کا یہ علاقہ تھا جہاں اکبر کے خلوت خانۂ خاص اور خواب گاہ واقع تھے۔اس علاقے کا نام انوپ تلاؤ سے مستعار لیا گیا ہے۔جو کہ اس علاقے میں بنایا جانے والا ایک حوض تھا۔فادر مونسریٹ اور جہانگیر نے اس کا نام کپور تلاؤ لکھا ہے۔(11) بدایونی نے ایک اور تعمیر کئے گئے وجود کا ذکر کیا ہے جس کو وہ حجرہ انوپ تلاؤ کا نام لکھتا ہے جہاں بادشاہ کبھی کبھی مذہبی بحث کا اہتمام کرواتا تھا۔(12) صوبائی فادر ریوو ہیسینٹ کو اپنے ایک خط میں اس مقام کے بارے میں لکھتا ہے۔''ہفتہ کو ہم تینوں (فادر اکیوویوا، ہنریق اور مونسریٹ) ایک جگہ بیٹھ کر خدا کے بارے میں باتیں سن رہے تھے۔ اس جگہ کا نام ہے داری گیتیانا یعنی دولت خانہ جب مقررہ وقت ہوا تو بادشاہ خود اپنے چھ فاضل ملاؤں کے ساتھ آئے۔انہوں نے ہمیں بلاوا بھیجا اور ہم وراندے میں چلے گئے۔(13) وہ غور سے باتیں سنتا رہا تھا تاکہ کوئی بھی نکتہ اس کے ذہن میں محفوظ رہنے سے نہ رہ جائے۔ درمیان وہ جب ضروری ہو کچھ پوچھ لیا کرتا تھا تاکہ جو کچھ کہا یا پڑھا جارہا تھا اس کو واضح طور پر سمجھ سکے۔باتیں سننے کے دوران وہ سر ہلاتا رہتا ہے اور لوگ یہ تاثر لیتے تھے جیسے وہ آنکھیں

بند کئے سو رہا ہو جب کہ وہ جو کچھ وہاں ہوتا تھا اس سب سے پوری طرح باخبر رہتا تھا۔(14)

یہ شہادت واضح طور پر ترک سلطان کے حجرے اور اس کے اطراف وراندوں کی نشاندہی کرتی ہے جس کے لئے بدایونی نے حجرہ انوپ تلاؤ کا نام استعمال کیا ہے۔اس حصے میں وہ لوگ بھی بٹھائے جاتے تھے جن کو بادشاہ بات چیت (انٹرویو) کے لئے بلاتا تھا۔(15) اس کے علاوہ یہ علاقہ دولت خانہ خاص اور دولت خانہ انوپ تلاؤ کے لئے دفاعی سائبان کا بھی کام کرتا تھا حجرہ انوپ تلاؤ کے پورب میں اور اس سے جڑے ہوئی گزرگاہ کے دوہرے راستے پر ایک اور عمارت تھی جس کو کبھی کبھی غلطی سے لڑکیوں کا اسکول کہہ دیا جاتا ہے۔(16) اطہر عباس رضوی کا موقف صحیح محسوس ہوتا ہے کہ یہ آب دار خانہ اور پھل گودام تھا۔ جہاں بادشاہ کے لئے غذائی سامان اور مشروبات محفوظ کئے جاتے تھے۔(17) اسی علاقے میں خلوت خانہ خاص اور خوابگاہ واقع تھیں۔(18)

خلوت خانہ خاص اور خوابگاہ کے پچھم میں دو کمرے ہیں جو روائتی طور پر سامنے کے کمرے بھی کہے گئے ہیں ان کو سامان کا کمرہ اور لائبریری بتایا گیا ہے۔(پینٹری جہاں کھانا کھانے کے لئے استعمال ہونے والا سامان بھی ہوتا ہے۔) دوسری طرف رضوی (اطہر عباس رضوی) مختلف مقاصد کے لئے ان کے مختلف استعمال کا ذکر کرتے ہیں۔ان میں سے ایک پیچھے واقع ہے اور اس میں اونچے چبوترے یا پلیٹ فارم ہیں۔ اطہر عباس رضوی نے اسے دیوان خانہ خاص(19) لکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ عمارت یا کمرہ بطور اکبر کی ذاتی لائبریری استعمال میں آتا تھا۔اس میں نجی محفلیں بھی ہوا کرتی تھیں اور کھانے کا دستر خوان بھی لگا کرتا تھا۔(20) ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایک مقام خزانہ انوپ تلاؤ بھی تھا۔(21) امکان ہے کہ اس عمارت نے متعلقہ مقصد کو نہایت موزوں انداز سے پورا کیا ہوگا۔اس میں جو کھوکھلی دیواریں اور اُدھر سے اِدھر اور اِدھر سے اُدھر چلنے والے دروازے تھے دوسری عمارتوں کے مقابلے میں مال جمع رکھنے کے لئے بہت موزوں تھے۔آب دار خانے سے آگے دولت خانہ خاص کا صحن تھا۔جس کے ساتھ ہی پنچ محل کی مشہور عمارت تھی جو سونے اور چاندی کے ذخیرے کی نام نہاد عمارت تھی (آنکھ مچولی اور جواہرات گھر (کنول ستون حجرہ)۔عام طور پر یقین کیا گیا ہے کہ ان عمارتوں کے بارے میں فارسی تذکرے اور بیانئے خاموش ہیں لیکن جب ہم

عارف قندھاری کے بیان سے استفادہ کرتے ہیں تو اول الذکر موقف سے انکار کرنا پڑتا ہے۔ دولت خانہ کے صحن کا بیان لکھتے ہوئے عارف قندھاری کہتا ہے کہ "صحن اس عمارت کے جس کی چھت آسمان سمان (بیضوی) تھی۔ صحن کے ایک طرف ایک چہار خانہ، چہاصفا اور ایوان خانہ بنایا گیا تھا۔ یہ سب ہی لال پتھر کو تراش کر اس نقش و نگار کے ساتھ بنائے گئے تھے۔ ان کے ابواب (دروازے) اور صحیاک جالیاں اس طرح احتیاط کے ساتھ بنائے گئے تھے کہ آٹھ دروازوں والی جنت کا مالک بھی اس کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔(22)

چہار خانہ اصل میں ایک مربع نما کمرہ تھا جس کے چاروں طرف روشندان تھے۔ یہ کنول ستون ہال کا ایک واضح حوالہ ہے جو کہ صحن کے اتری طرف واقع تھا اور ایک مکمل مربع تھا۔ صحن کے اتر۔ پورب کی طرف پنچ محل ہے جس کی عمارت چار منزلہ ہے جس پر ایک گنبد ہے۔ چہار صفا کے معنی ہیں وہ عمارت ہے جس میں چار چبوترے ہوں۔ ان دونوں عمارتوں کے بیچ نام نہاد خزانہ کی عمارت کھڑی ہے جو تین بڑے ایوانوں پر مشتمل ہے اسی لئے اسے ایوان خانہ کہا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ تینوں عمارتوں میں سوراخ دار یا جالیاں فٹ تھیں۔

بدایونی لکھتا ہے کہ 985ھ/1577ء میں اکبر کے حکم پر ایک مربع نما حوض بنایا گیا تھا جس کا ہر سو ابیض گز لمبا تھا۔ حوض کی گہرائی تین گز تھی۔ اس کے بیچوں بیچ حجرہ بنایا گیا تھا جس کی چھت پر مینار بلند بنایا گیا تھا۔ حجرے کی ہر سمت کی طرف پل بنوائے گئے تھے۔(23) ابوالفضل نے بھی بالکل یہی نقشہ پیش کیا ہے۔(24) بدایونی کے بقول یہ حوض جو 1577ء میں بنا تھا زرسیاہ تانبے کے سکوں سے بھرا رہتا تھا جس کی مالیت بیس کروڑ تھی۔ قندھاری کے مطابق تلاؤ جو اس صحن میں واقع تھا۔ 986ھ/79-1578ء میں پانی سے خالی کر دیا گیا تھا اور اس میں تانبے، چاندی اور سونے کے تنکے بھر دیئے گئے تھے۔(25) ابوالفضل بھی اسی سال کے حوالے سے یہی اطلاع فراہم کرتا ہے۔(26)

دوسری طرف جہانگیر صحن میں ایک حوض کا ذکر کرتے ہوئے اسے کپورتلاؤ لکھتا ہے اور اس کی ناپ چھتیس گز مربع اور گہرائی ساڑھے چار گز بتاتا ہے۔ اس میں اوپر تک تانبے کے ٹکے بھرے ہوئے تھے۔ (27)

سوال یہ ابھرتا ہے کہ کیا یہ وہی تالاب تھا جس کو انوپ تلاؤ کہا گیا ہے اگر ہم اسے اس

ناپ سے دیکھیں جو ابوالفضل نے قلمبند کی ہے۔ انوپ تلاؤ کی طرح اس تالاب کے ساتھ بھی پل تھے۔ لیکن بدایونی نے انوپ تلاؤ کی تعمیر کا سال 76-1575ء/ 983ھ بتاتا ہے۔(28) یعنی دوسرے تالاب کی تعمیر سے دو برس پہلے۔ دوم بعد والا تالاب پر جیسا کہ بتایا گیا ہے ایک اونچا مینار چڑھایا گیا تھا جو کہ بد قسمتی سے اب دکھائی نہیں دیتا ہے۔ اس مینار کے بارے میں بدایونی کے بیان کو اکبر نامہ کی دو تصویریں سند فراہم کرتی ہیں۔ دونوں تصویروں میں دیوان عام کے پیچھے کہیں ایک مینار نظر آتا ہے۔(29) اس طرح ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ دولت خانہ میں کبھی دو تالاب ہوا کرتے تھے۔ اول انوپ تلاؤ اور دوم دوسرا والا۔ کیا جہانگیر نے جس تالاب کو کپور تلاؤ کہا ہے وہ یہی دوسرا والا تو نہیں تھا؟

ایک اور مسئلہ جو اکبر کے پہلے محل سے متعلق ہے جیسا کہ مونسریٹ نے لکھا ہے۔ بادشاہ کے کھانے کے کمرے کے وقوع سے متعلق ہے۔ وہ دیوان خاص اور خلوت کدہ کے نزدیک نہیں واقع تھا۔ پھر وہ تھا کہاں؟ اس کا ایک جواب تو خود مونسریٹ نے دیا ہے۔ ذاتی کھانے کے کمرے کا بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے۔ ''اپنے کھانے کے کمرے میں اس نے حضرت مسیح، حضرت موسیٰ، حضرت مریم اور پیغمبر محمدؐ کی تصویریں لگا رکھی تھیں۔ ان پر نام لکھتے ہوئے اس نے (اکبر نے) محمدؐ کو آخر میں رکھ کر اپنے سچے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ اس کی ترتیب یوں ہے۔ یہ تصویر عیسیٰ کی ہے، یہ مریم کی ہے، یہ موسیٰ کی ہے اور وہ محمدؐ کی ہے۔''(30) وہ مزید لکھتا ہے۔ ''اس کی (اکبر کی) میز بہت شان دار اور قیمتی ہے جس پر عموماً اعلیٰ قسم کے چالیس مختلف اقسام کی غذائیں سجی رہتی تھیں۔ ان کو شاہی کھانے کے کمرے میں باریک لینن کے چادروں سے ڈھانپا جاتا تھا۔ کھانے کے کمرے کے دروازے تک ان کو نوجوان لے کر آتے تھے، دوسرے ملازم آگے ہوتے تھے اور بعد میں دراوغہ مطبخ داخل ہوتا تھا۔ اندر آتے ہی کھانے کی سینیوں کو خواجہ سرا لے لیتے تھے جو انہیں شاہی میز کے ساتھ منتظر کھانے کھلانے والی کنیزوں کو دے دیتے تھے۔ وہ (اکبر) نجی ماحول میں کھانا کھانے کا عادی تھا سوائے سرکاری دعوت کے موقع کے۔''(31)

دوسرا اقتباس کھانے کے کمرے کے وقوع کی نشاندہی کرتا ہے جو کہ ایک ایسی جگہ پر ہوگا جہاں مردوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ دولت خانہ انوپ تلاؤ کی دو چھتی کے پورب میں جو

آب دار خانہ سے زیادہ دور نہیں تھا، جہاں خیال ہے کہ کھانا سجایا جاتا تھا ایک ذاتی دروازہ ہے کہ جیسا کہ اب ظاہر ہوتا ہے حرم سرا کی طرف کھلتا تھا۔ یہ دروازہ ہمیں دولت خانہ سے ایک عمارت تک لے جاتا ہے جو سنہرا مکان یا مریم کے گھروں کے نام سے مقبول ہے۔ جسے اصل میں باقی حرم سرا سے دیواروں کی آڑ بنا کر الگ کر دیا گیا تھا جو حرم سرا کے دفاتر اور حرم سرائے خاص (جودھا بائی کا محل) کی طرف تھیں۔ ایک دیوار اس علاقے کو حرم سرا کے باغ سے الگ کرتی تھی۔ اس طرح دوسرے لفظوں میں مریم کا محل اگر دولت خانہ کے باہر تھا مگر حرم سرا کا حصہ نہیں تھا۔ دونوں محلوں کے مکین آسانی کے ساتھ اس عمارت میں جا سکتے تھے۔ اس کے بیچ والے کمرے میں طاق بنے ہوئے تھے جن پر موجود آثار بتاتے ہیں کہ تصویروں کے فریم رکھے گئے تھے۔ بیچ والے کمرے کے دکنی پچھمی طرف کے ایک طاق میں ایک ایسی عورت کی تصویر کا فریم تھا جو یورپین انداز کی تھی۔ (32) اس عمارت کے پچھمی اور پوربی سامنے ایسے مجسموں سے سجے ہیں جن کے پر تھے۔ اسمتھ نے ان کو فرشتے لکھا ہے۔ (33) اس عمارت میں دیواروں پر مصوری کے نمونے تھے جن میں ایک دربار کا منظر نظر آتا تھا، کہیں ہاتھیوں کی لڑائی کا منظر دکھائی دیتا تھا اور پھولوں کی ترتیب کی قسموں کے خاکے تھے۔ (34)

ان تصویروں نے یقیناً مونسریٹ کی غلط رہنمائی ہوگی جیسے کہ اسمتھ بھی غلط رہنمائی کا شکار ہوا تھا۔ اس نے یہ سمجھا تھا کہ یہ عیسائی خیال کی عکاسی کرتے ہیں۔ طاق میں رکھا ہوا عورت کا مجسمہ کے بارے میں یہ خیال ہوا کہ وہ مریم کا ہے۔

اگر یہ عورت کے رہنے کا تھا خواہ اس کا کتنا ہی بلند مرتبہ ہو تو اتنی زیادہ شکار کی، لڑائیوں کی اور محاصرے کے مناظر کی تصویروں کے وہاں ہونے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عمارت اکبر کے کھانے کا کمرہ ہوگا جس کا بیان مونسریٹ نے قلم بند کیا ہے۔

ماخذ میں ایک اور عمارت جس کا حوالہ ملتا ہے مگر اب اسے صحیح طور پر پہچانا نہیں جا سکا ہے شہزادوں کے لئے اسکول کی ہے۔ مونسریٹ یہ بات واضح کرتا ہے کہ یہ اسکول خود محل کے اندر تھا۔ ''جمعہ کی صبح کو میں محل گیا اور جب میں پہنچا تو بادشاہ محل میں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے جب ان کو خوش آمدید کہا تو انہوں نے یہ اشارہ دیا کہ میں اندر آ جاؤں۔'' (35)

نام نہاد حرم سرا مہمان خانے پر غور سے نظر ڈالئے تو منکشف ہوتا ہے کہ وہ ایوان خانہ کے

ذریعہ جس عمارت کی پہلے ہم بطور ایوان خانہ تعریف لکھ چکے ہیں دولت خانہ سے جڑی ہوئی تھی۔ یہ یقیناً ایک بڑے صدر دروازے کی مدد سے حرم سرا سے علیحدہ کیا گیا ہے جو حرم سرا کے باغات کی طرف کھلتا ہے۔ اس نام نہاد مہمان خانے کا مرکزی کمرہ ایک شہزادے کے مطالعہ کے لئے بے حد موزوں ہے جہاں سے وہ دونوں یعنی محل خاص اور حرم سرا کے مکینوں کی نظر کے سامنے رہتا تھا۔ کیا یہ اسکول یا نرسری تھا جہاں کم عمر شاہی شاہزادے جیسوٹ سے تعلیم حاصل کرتے تھے؟

جہاں تک دوسرے محل کا معاملہ ہے جس سے مونسریٹ کو بہت دلچسپی تھی اس کے بارے میں رضوی (ایس۔ایس۔اے رضوی) اور پٹرو کیولی جیسے مستند قلمکاروں نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔(36) لیکن تیسرے محل کے بارے میں کیا کہیں؟ جو شہزادوں کے مکانات تھے۔ رضوی کہتے ہیں کہ نام نہاد تان سین کی بارہ دری کے قریب کا علاقہ جو کرازن کے ڈاک بنگلے کے سامنے ہے شہزادہ سلیم کے مکان کا علاقہ ہے۔(37) مگر اس علاقے میں ایک کے بعد دوسری اور اسی طرح جو کھدائی ہوئی ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بعض امراء کے مکانات ہیں۔ وہ جگہ جہاں سلیم کے جاہ و مرتبے کا کوئی رہ سکتا تھا نام نہاد حکیم کا مکان ہو سکتا ہے جو کہ اگرچہ شاہی مکانات سے علیحدہ تھا پھر بھی ان سے نزدیک اور بہت شان دار تھا۔ ایسے علاقے میں جو خوابگاہ اور فراہمی آب کے نظام سے اتنا قریب ہوئی کوئی امیر کس طرح قیام کر سکتا تھا۔ فراہمی آب کا یہ نظام مطلوبہ مقدار میں پانی شاہی حماموں اور انوپ تلاؤ کو مہیا کرتا تھا۔

جہاں تک کارخانوں کا مسئلہ ہے تو وہ بھی محل کے اندر یا اس سے بہت قریب تھے۔ اپنے ایک خط میں مونسریٹ کہتا ہے کہ بادشاہ خود ایک میکانک ہے اور اپنے محل کے مخصوص حصوں میں اس نے ہر قسم کے دستکار جمع کر رکھے ہیں۔(38) وہ مزید لکھتا ہے کہ اکبر عموماً دیوان عام سے چلتا ہوا بندوق بنانے والوں کے ورکشاپ میں آ جاتا تھا جو قریب ہی واقع تھا۔(39) اپنے تبصروں میں اس نے وضاحت کی ہے۔ ''اس نے محل کے قریب ایک ورکشاپ بنوایا تھا جہاں کمروں کے ساتھ ساتھ بہترین ہنر اور فن کے کام کے لئے بھی کمرے تھے جیسے کہ مصوری کا کام، لوہاری کا کام، کڑھائی بنائی کا کام، قالین سازی کا کام، پردے بنانے کا کام اور ہتھیار بنانے کا کام۔''(40)

ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ شاہی ورکشاپ (ٹکسال/ٹنٹ) سے ہاتھی پول تک کا علاقہ یطش خانوں (مختلف حکام کے دفاتر مع مکان) کو دے دی گئی تھی۔ دیوان عام کی پچھمی دیوار سے ملحق باورچی خانے کا انتظامی مرکز واقع تھا جس کے ساتھ ہی داروغہ مطبخ محمد باقر کا یطش خانہ تھا۔ مزید حوض شیریں کے نچلے علاقے میں داروغہ جانوران کا مکان تھا۔ اس مکان سے ملحق چیتا خانہ اور فیل خانہ وغیرہ تھے جن کی حال ہی میں کھدائی کی گئی تھی۔ دفتروں اور دفتروں کے حکام کے ان سلسلوں کے مکانات ہاتھی پول کے پیچھے تک چلے گئے تھے جن کے پیچھے پٹی پر ایک عمارت ہے جو کہ نام نہاد فراش خانہ یا سرائے کے زمینوں سے براہ راست جڑی ہوئی ہے اور جو ہرن مینار کے قریب تھی۔ عمارتی فن کے حوالے سے اس سرائے کی تعمیر اسی طرح کی ہے جس طرح کی کہ دوسری اکبری عمارتیں تھیں۔ قندھاری نے صیغہ جمع میں جب اکبر نے فتح پور سیکری میں سرائیں بنوائی تھیں سرائے ہا لکھتا ہے۔(41) اس کے بعد وارث ہمیں بتاتا ہے کہ 1064ھ/1655ء میں شاہ جہاں نے ایک محل دولت خانہ بنوانے کا حکم دیا تھا۔(42) جہاں سے جھیل نظر آئے۔

آر۔سی۔گاور نے اپنے صدارتی خطبے میں ذکر کیا۔(43) سموسہ محل، چشتی مکانات، جامع مسجد اور ہرن مینار کی سرائے کے دراوغہ کے مکان کے درمیان ایک بڑی ٹھوس عمارت تھی۔ انہوں نے اس کی پہچان کرتے ہوئے اسے مینار حرم سرا بتایا ہے۔ عام سے مقام پر اس کا وقوع حکمراں بادشاہ کی کسی خاتون کے گھر ہونے کے امکان کو خارج کر دیتا ہے کیونکہ شاہی خواتین کو کبھی ایسی جگہ رہنے کی اجازت نہیں ہوسکتی تھی جہاں حکام بندوبست کے دفاتر واقع ہوں۔ تاہم عمارت اتنی بڑی ہے کہ اسے کسی صاحب حیثیت شخص کا گھر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں دو حمام ہیں، ایک چہار باغ ہے، ایک زیرزمیں پانی کا ذخیرہ گاہ ہے اور ایک کھلا ہوا تالاب ہے اس کے علاوہ بڑی تعداد میں کمرے ہیں۔ اس عمارت اور حمام کے دروازے رنگوں سے مصور کئے گئے ہیں جن پر چمکتے ہوئے بھورے رنگ میں پھولوں کی تصویریں ہیں۔ دروازہ ہاتھی پول سے چشتی مکانات اور رنگ محل کی طرف جانے والے راستے کی سمت کھلتا ہے۔ اس کے اتر میں جھیل کا روح پرور منظر ہے۔ اس طرح مینار حرم سرا ہونے کے بجائے یہ شان دار عمارت وہ محل دکھائی پڑتا ہے جس کو شاہ جہاں نے بنوایا تھا اور اس وقت بنوایا تھا جب اکبری

محلوں اور حکام کی بستی کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔(44)

فتح پور سیکری اکبر کے زمانہ اقتدار سے متعلق تفتیش کے بارے میں معلومات کا ایک وسیلہ ہے۔ ہرن مینار سے اجمیر دروازہ تک کی دکانیں، اپنے چبوتروں سمیت اندرونی کا علاقہ عمارتیں، کنوئیں، تالاب اور باولیاں اور بیوپال کے اطراف کا علاقہ، گوالیار دروازہ اور پیٹوں پر بنی عمارتیں سب ہی مفصل مطالعے کی متقاضی ہیں تا کہ ایک ایسے نابغہ روزگار کے بنائے ہوئے شہر کی پراسرار سمتیں منکشف ہوسکیں۔

حوالہ جات

1- ای۔جی۔ایس۔کے۔ بنرجی۔ فتح پور سیکری کا بلند دروازہ۔لندن ہسٹاریکل کوارٹرلی XIII،1937ء۔آئی ڈم۔اے ہسٹاریکل آوٹ لائن آف اکبرس دارالخلافت۔فتح پور سیکری۔ جرنل آف انڈین ہسٹری XXI۔1942ء۔ ایف آر۔ہیراس۔ دی پیلیس آف اکبر ایٹ فتح پور سیکری۔ جرنل آف انڈین ہسٹری۔ 1925ء۔ اشرف حسین اے۔گائیڈ ٹو فتح پور سیکری۔دہلی 1947ء اے۔بی۔ایم۔حسین۔فتح پور سیکری اینڈ اٹس آرکیٹکچر۔ڈاکا 1970ء۔محمد سعید مار ہروی۔تاریخ فتح پور (اردو) 1905ء۔ ایس۔اے۔اے۔رضوی۔فتح پور سیکری۔دہلی 1972ء۔ایس اے اے رضوی اور وی۔جے۔اے۔فلائن۔فتح پور سیکری۔ممبئ 1975ء۔میکائیل برانڈ اور گلن ڈی لوری ایڈیشن۔فتح پور سیکری اے سورس بک۔میسچوسیٹس 1985ء

2- میکائیل گرانڈ اور گلن۔ڈی لوری۔ایضاً۔

3- ایٹیلیو پیٹرو کیولی،لاسٹا ڈیل سول اینڈ ڈیلے اکیو فتح پور سیکری۔روم 1988ء

4- علی گڑھ کی ٹیم نے پروفیسر سی۔آر۔گاورکی ڈائرکٹری کے ماتحت کام کیا تھا۔جس نے اپنے صدارتی خطبہ میں جو انڈین آرکیالوجیکل سوسائٹی میں دیا گیا تھا۔ایک ابتدائی رپورٹ ''دی آرکیالوجی آف اربن مغل انڈیا: فتح پور سیکری میں کھدائی۔شانتی نکیتن، دسمبر 1988ء

5- دیکھیں نقشہ جو اس مقالے کے آخر میں ہے اور جس میں عمارتوں کی پہچانوں کو شامل کیا گیا ہے یعنی وہ محلات اور آبادیاں جو وہاں بنائی گئی تھیں۔مصنف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں آرکیالوجی کے ضمیر احمد، ان کے ساتھیوں، آنجہانی راجیو شرما اور ڈاکٹر جابر رضا کا ممنون ہے کہ وہ اس کے ساتھ رہے تھے۔

6- مونسریٹ فادر، اینٹونی، دی کامنٹری آف فادر مونسریٹ۔ایس۔جے۔ترجمہ کار

جے۔ایس ہوائے لینڈ،لندن۔1992ء ص199

7- بدایونی۔منتخب التواریخ ایم۔اے۔علوی ایڈیشن۔کولکتا جلد(II)1869ء ص365

8- مونسریٹ ص211

9- دیکھیں پلیٹ نمبر1

10- بدایونی۔(III) ص 215 ایک اور جگہ بدایونی اسے انوپ تلاؤ کی عمارت لکھتا ہے۔
ایضاً(II) ص21-20

11- مونسریٹ ص 28۔تزک جہانگیری۔غازی پور اور علی گڑھ 64-1863ء ص260۔
بدایونی کی طرح قندھاری بھی انوپ تلاؤ کا حوالہ دیتا ہے۔تاریخ اکبری رام پور۔
1962ء ص 151۔گلیڈ یٹرز: پرانے زمانے کے بازی گر جو جانوروں اور اسلحہ دونوں
کے ذریعہ اپنے ہنر اور کمالات دکھاتے تھے۔

12- بدایونی(II) ص208

13- لیٹرز فرام دی مغل کورٹ۔دی فرسٹ جیسوٹ مشن ٹو اکبر(1583-1580ء) جان
کوریا افونسو ایڈیشن۔ممبئی1980ء ص72

14- ایضاً۔ص74

15- ایضاً۔ص83

16- ایس۔کے۔بینرجی۔اکبرس دارالخلافت۔فتح پور سیکری۔جرنل آف انڈین ہسٹری،
1942ء ص211

17- ایس۔ایس۔اے۔رضوی اور وی۔جے۔اے۔فلائین۔فتح پور سیکری۔ممبئی1975ء
ص35

18- اس موضوع کی تفصیلات کے لئے دیکھیں۔ایضاً۔ص29-28

19- ایس۔ایس۔اے۔رضوی۔ایضاً۔ص26

20- ایضاً۔ص26

21- ابوالفضل اکبرنامہ III ص246

22- قندھاری ص151

23- بدایونی۔(II) ص142-141

24- ابوالفضل اکبرنامہ کولکتا1887(III) ص42-141

25- قندھاری ص152

26- اکبرنامہ III ص246

27- تزک۔ص260

28- بدایونی(II) ص201-200

29- دیکھیں پلیٹیں (خاکے) 1اور2

30- مونسریٹ۔ص29

31- ایضاً۔ص199

32- دیکھیں پلیٹ3

33- دیکھیں پلیٹ4اور5

34- تفصیلی بیان کے لئے رضوی۔ص55-53

35- جیسوٹ لیٹرز۔ص85

36- رضوی۔اے پیٹروکیولی۔فتح پورسیکری پر پرتگالی میں کتاب۔دوم1988ء

37- رضوی۔ص24

38- جیسوٹ لیٹرز۔ص37اور81

39- ایضاً۔ص36-35

40- مونسریٹ۔ص201

41- قندھاری۔ص150

42- وارث بادشاہ نامہ۔رام پور ایم ایس میں شعبہ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا مسودہ(II)
ص284-244

43- آر۔سی۔گاور۔

44- دیکھیں میرا میموگرانڈ مقالہ ''پوسٹ اکبر فتح پورسیکری۔ یہ مقالہ اتر پردیش کے 8ویں اجلاس منعقدہ ورناسی فروری1994ء میں پیش کیا گیا تھا۔

❁❁❁❁❁

اکبراور موسیقی

فرانسوئے نالینی ڈیل وو

سُر سنگیت سے اکبر کا لگاؤ، اس کی سرپرستی اور تان سین سے اس کے تعلق کی تصدیق لاتعداد تحریری اور بت تراشی کے ماخذ اور بہت سی زبانی روایات سے ہوتی ہے۔تان سین دربارِ اکبری کے سنگیت کاروں کا سرتاج اعظم تھا۔تحریری ماخذ کو ہم دو حصوں میں پہچان سکتے ہیں اول ہند ایرانی تحریری سرمایہ اور دوم مقامی زبانوں میں دستیاب تحریری سرمایہ۔

الف: دربار اکبری میں سُر سنگیت پر ہند ایرانی تحریروں کا سرمایہ

اکبر نے جس سُر سنگیت کی سرپرستی کی تھی ان کو دستاویزی سند دینے والے ہند ایرانی متون (1) کو مزید دو ذیلی حلقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اول وہ دستاویزی بیانئے جو زمانہ اکبری میں قلمبند کئے گئے تھے اور دوم اس کے بعد قلمبند کئے جانے والے بیانئے۔زیادہ موسیقیت کے کردار سے آراستہ ہند ایرانی متون عموماً نظری (Theoritical) اور ٹیکنیکی جانکاری فراہم کرتے ہیں۔ان میں سنگیت کاروں اوران کے سرپرستوں کی سوانحی تفصیلات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ابتدائی زمانے کے متون بعد کے تحریری ماخذ کے مقابلے میں زیادہ حد تک مستند ہیں۔

بنیادی معاصر ماخذ ہیں ابوالفضل کا اکبر نامہ (2) اور ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ۔(3) بعد کے ماخذ میں کچھ مختصر حوالے توزک جہانگیری (4)، عبدالحمید لاہوری کے پادشاہ نامہ (5)، صمام الدولہ شاہ نواز خاں کے معاصر الامراء (6) ہزار دھرپد کے فارسی

دیباچے کے جس میں دیباچہ نویس کا نام نہیں ہے اور جونا تک بخشو سے منسوب ایک ہزار گیتوں کا مجموعہ ہے جن کو دربار شاہ جہانی میں مرتب کیا گیا تھا(7) اور سُر سنگیت ہی کے موضوع پر ستر ہویں صدی کے آخری نصف کے متون جیسے سیف خان فقیر اللہ کا راگ درپن وغیرہ میں ملتے ہیں۔(8) آخری قسم کے متون جن کا تعلق آ واخر ستر ہویں اور اٹھار ہویں صدیوں سے ہے معمولی فرق کے ساتھ وہی معلومات دہراتے ہیں جو ان سے پہلے کے تحریری ذخیرے میں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے لئے ان کی اہمیت معمولی سی ہے البتہ اپنے زمانے کی موسیقی کی تاریخ کو محفوظ کرنے کے حوالے سے ان کی قدر و قیمت اپنی جگہ ہے۔

سنگیت کار اکبر اور سنگیت کا سامع اکبر

ہند ایرانی ماخذ کے ذریعہ جتنے بھی کہ دستیاب ہیں ہم سنگیت سے اکبر کے تعلق کے مختلف پہلوؤں کو یکجا کر سکتے ہیں، بطور ایک سنگیت کار، دھنوں کے مرتب کرنے والے اور سُر سنگیت کے سامع کے ہی نہیں بلکہ سُر سنگیت کے نظریہ سازوں اور سنگیت کاروں کے سرپرست کے بھی اس کا کردار سامنے آتا ہے جس کی قابل حوالہ مثال دربار سرتاج سنگیت کار تان سین 1562-89ء تھا۔

یونانی اور ہندستانی نظام ہائے جوتش کے ذریعہ اکبر کے جوزائچے Horoscope بنائے گئے تھے ان میں سے چار کو ابوالفضل نے اکبر نامہ میں شامل کیا ہے۔ یہ سب ہی زائچے خصوصی کردار اور اہمیت کے حامل ہیں۔(9) ہندستان کے درباری و سرکاری جوتشی جوتک رائے کے مطابق جس نے اکبر کی ولادت کے کئی برس بعد اس کا زائچہ بنایا تھا اکبر سُر سنگیت کا ماہر اور راگ راگنیوں کے بھید بھاؤ کا جان کار تھا۔(10) ابوالفضل کی تحریروں کے مطابق اکبر کے جنم کے جشن میں ایرانی گائیکی اور دھنوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس کی تصدیق اکبر نامہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ اس کی بعض تصویروں میں یہ منظر دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ خاندانِ تیموریہ 1584ء اسی موضوع پر قابل تعریف تصویر بھی ملتی ہے۔(11)

ب: اکبر بطور سنگیت کار اور دھنوں کے مرتب کے

ابوالفضل کی تحریروں میں بطور سنگیت کار اور دھنوں کے مرتب کے اکبر کا ذکر ہوا ہے۔ وہ

خود بھی سنگیت کار تھا اور نقارہ بجانے پر مہارت رکھتا تھا۔ آئین اکبری میں ''شکوہ سلطنت'' کے عنوان سے ابوالفضل نے فوجی بینڈ کا بھی بیان کیا ہے۔(12) نقار خانہ میں جو دھنیں بجتی تھیں اور جو آلات استعمال ہوتے تھے اس بیان میں ان کا ذکر ہوا ہے جو متعین اوقات کے مطابق ہوا کرتی تھیں۔(13) وہ لکھتا ہے کہ عالم پناہ کو سنگیت کی سائنس (علم موسیقی) پر ایسی مہارت تھی کہ جتنی کہ تربیت پانے والے سنگیت کاروں (صاحبانِ فن) کو نہیں ہوتی تھی۔(14) پرانی خوارزمی دھنوں کا اہتمام نقار خانہ کے مشاغل کا حصہ تھا۔ ان دھنوں میں سے دوسو سے زیادہ دھنیں خود عالم پناہ نے مرتب کی تھیں جن سے کیا بوڑھے اور کیا جوان سب ہی لطف اندوز ہوتے تھے خصوصاً جلال شاہی، مہامیر کرکت اور نوروزی دھنوں سے۔(15)

نقار خانہ اور شاہی دربار کی سماعت گاہ میں جو آلات استعمال ہوتے تھے ان کے بارے میں کچھ کنفیوژن تھا۔(16) موقع کی مناسبت سے جس قسم کا سنگیت ہوتا تھا اس کے بارے میں ایک سوال موجود تھا۔ دربار کا روزمرہ کا معمول کیا تھا، بادشاہ کس وقت پہنچتا تھا اور کس وقت واپس چلا جاتا تھا، امراء اور معزز مہمان کب آتے اور جاتے تھے۔ اسی طرح خوشی کے مواقع پر کیا اہتمام ہوتا تھا جیسے کہ شہزادوں کا جنم اور تہوار۔ فوج جب میدان کو روانہ ہوتی تھی کو کس قسم کی دھنیں بجتی تھیں۔

ج: موسیقی کو سمجھنے اور سننے والا اکبر

سنگیت اور اس سے متعلق علم کی دوسری کتابوں میں سنگیت کے بارے میں جو ٹیکنیکی معلومات تھیں اور سُر سنگیت کے جو فنی اصول بتائے گئے تھے اکبر ان سے خوب واقف تھا۔ دوسروں کی طرح سُر سنگیت اسے خوابناک حالت کی طرف نہیں لے جاتی تھی بلکہ اس میں ایک تحریک پیدا کر کے اسے اور چاق و چوبند کر دیتی تھی۔(17) اپنے اس خوشامدانہ بیان میں ابوالفضل نے سُر سنگیت کے حوالے سے اکبر کی معلومات کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ ایک اور جگہ ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے جن میں تان سین اکبری دربار میں پہنچا تھا وہ بتاتا ہے کہ ہندستان اور ایران کے سُر سنگیت کی سائنس کے نظری اور عملی پہلوؤں سے اکبر خوب واقف تھا۔(18)

سر سنگیت سے اکبر کی دلچسپی ایک اور ماخذ اسد بیگ قزوانی کی وہ تحریریں ہیں جو 1603-1604ء سے متعلق ہیں جب وہ پہلی بار بیجاپور گیا تھا۔ ان کو وقائع اسد بیگ (1602-1605ء) میں محفوظ کیا گیا ہے۔(19) مغل سفیر سے اپنی الوداعی تقریب میں سلطان بیجاپور ابراہیم عادل شاہ ثانی سے (1580-1627ء) نے سُر سنگیت میں اکبر کی دلچسپی اور یہ کہ شاہی اجتماع میں تان سین بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر دھن بجاتا تھا کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اسد بیگ نے جواباً کہا کہ اکبر اکثر سنگیت سنا کرتا تھا۔ جب وہ سُر اور راگ سنتے ہوئے کھڑا ہو جاتا تھا تو گائیک بھی کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ جب وہ بیٹھ جاتا تھا تو گائیکوں کو بھی بیٹھ جانے کی اجازت ہوتی تھی۔ یہ صورت خصوصاً تہواروں کی بڑی تقاریب اور گائیکی کے بڑے جلسوں میں ہوا کرتی تھی۔ جہاں بادشاہ اپنے درباریوں سے باتیں بھی کرتا تھا اور دعوت کے عنوان سے ان کی تواضع بھی کرتا تھا۔(20)

اکبر کا ذوق تجسس صرف ہندستانی اور ایرانی سر سنگیت ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ مغربی سر سنگیت سے بھی اس کو اتنی ہی دلچسپی تھی جس کی تصدیق بدایونی نے بھی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اکبر نے ایک یورپی موسیقی کے آلے کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس آلے (ارغنم) کا 1581ء میں فتح پور سیکری استعمال کیا گیا تھا۔(21) (ارغنم ارگن باجا بھی ہو سکتا ہے۔)

2: سُر سنگیت کی نظریہ سازی کا سرپرست اکبر

سُر سنگیت کا ہندستانی نظام مرتب صورت میں آئین اکبری کے اس باب کا موضوع ہے جس کو ہندستان کی ثقافتی اور فکری زندگی کے لئے وقف کیا گیا ہے۔(22) ایک مضمون کا عنوان ''سنگیت'' یعنی گائیکی کا فن جس کے ساتھ سنگیت اور رقص بھی شامل ہوتا ہے۔(23) ایک اور عنوان ہے ''گائیکوں کی قسمیں'' (شمارِ نغمہ سرایان)(24) اور تیسرا عنوان ''کھارا'' کے موضوع سے متعلق ہے جو ایک تفریحی مجلس ہوتی ہے۔ جس کا اہتمام رات کو ملک کے امراء کرتے ہیں۔ ان کی بعض گھریلو ملازمائیں یہاں گانا اور بجانا بھی سیکھتی ہیں۔(25) ہندستانی سنگیت کی سات درجوں (ادھیائے) میں تقسیم ہیں سُر سنگیت کے موضوع پر پائے جانے والی

سنسکرت پوتھیوں کی یاد دلاتی ہے۔ جیسے کہ ''سم گیت رتنا کار''۔ جس کو تیرہویں صدی کے نصف اول میں سارنگا دیو نے مرتب کیا تھا۔ اس کے لئے اکثر سپتادھیائے یعنی (سات ابواب والا) بھی استعمال ہوتا ہے۔ ان کے فارسی ترجموں اور تبصروں کے لئے بھی یہی اصطلاح مستعمل ہے۔ جیسے کہ یحیٰی الکابلی کا ''لہجات سکندر شاہی''۔(26) پہلے باب ''سوار ادھیائے'' میں ابوالفضل نے بہت سی ٹیکنیکی تعریفات قلمبند کی ہیں۔ دوسرے باب ''راگ ویوے کادھیائے'' میں وہ راگوں کی درجہ بندی کا ذکر کرتا ہے۔ اس کی ایک فہرست میں اس نے ترک کئے گئے اور رائج سنگیت کی قسموں کا اندراج کیا ہے اور ان کے خواص کے بارے میں دلچسپ تفصیلات قلمبند کی ہیں۔ ان علاقوں کا نام جن میں ان کا رواج تھا اور ان کے ماخذ کا تاریخی جائزہ اس نے لکھا ہے، ان کی نشوونما اور اپنے زمانے میں رائج طریقوں کو بھی وہ موضوع بناتا ہے۔ تیسرے باب ''پراکرنا دھیائے'' میں راگوں کے بنائے جانے والے اور مرتب حصوں کا مختصر بیان ہے۔ چوتھے باب ''پرابندھ ادھیائے'' میں ابوالفضل نے سنگیت کی دھنوں کی ساخت بیان کی ہے۔ آہنگ کے نظام کا ذکر پانچویں باب ''تالا ادھیائے'' میں ہوا ہے مگر ماضی میں یا اس کے زمانے میں اب تک آہنگ کے جو گھماؤ مستعمل تھے ان کی وضاحت نہیں کی ہے۔ اس طرح کی کمزوری موسیقی کے موضوع پر دوسرے ہندی و ایرانی متون میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ آلات موسیقی پر چھٹا باب ''وادیا ادھیائے'' میں ایرانی اور ہندستانی آلات کا دلچسپ تفصیلی مطالعہ ہوا ہے، ان کو کلاسیکی ہندستانی درجہ بندی کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے اور غالباً ان کا استعمال دربار میں ہوتا تھا۔ ساتویں باب ''نرتیہ ادھیائے'' کا موضوع رقص ہے اور مختصر حوالوں تک ہی محدود ہے۔ دوسرا حصہ جو سنگیت کاروں کی قسموں سے متعلق ہے۔ مرد اور خواتین سنگیت کاروں اور تماشہ دکھانے والے نٹوں، بہروپیوں اور جادوگروں کے جغرافیائی اور سماجی ماخذ کے بارے میں تازہ جانکاری فراہم کرتا ہے۔ قرون وسطیٰ کے سنگیت کی سماجی وثقافتی تاریخ کے حوالے سے یہ حصہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ ہندستانی سنگیت پر آخری حصہ اکھارا سے متعلق ہے جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ اپنی کلاسیکی اور لوک ہندستانی سر سنگیت میں وضاحت کا یہ انداز اس کے مصنف کی درسی قوت کو منکشف کرتی ہے اور اسی لئے غالباً مصنف کے اپنے ممدوح سرپرست اکبر کے کردار کو سامنے لاتی ہے۔

ایرانی سُر سنگیت کے دومتون کا بھی ذکر آتا ہے جن کو اکبر سے منسوب کیا گیا ہے اور اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ان کے مصنفین سُر سنگیت کے نظریات سے اکبر کی خاص دلچسپی کا علم رکھتے تھے۔ سی۔ اے۔ اسٹوری کے بیان کے مطابق (27) قاسم بن دوست علی البخاری کی کشف الاوتار ایک مختصر پوتھی ہے جو اکبر سے منسوب کی گئی ہے۔ اس کا موضوع آلہ موسیقی میں تاروں کی تقسیم ہے جو کہ کتاب "دوازدہ مقام" کے چھٹے مقام کی وضاحت ہے۔ اس کتاب کو مصنف درویش حیدر تونیانی نے ہمایوں کے نام منسوب کیا ہے۔ (28) عنایت اللہ بن میرج الہراوی کی "تحفتہ الادوار" ایک مختصر عبارت ہے جو جزوانثر اور جزوا نظم میں لکھی گئی ہے۔ اسے بھی اکبر کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد اکبر کے مطالعے کے لئے مزید سہولت فراہم کرنا تھا۔ (29)

3: اکبر بطور سنگیت کاروں کے سر پرست کے، تان سین کا معاملہ

عالم پناہ سُر سنگیت پر خاص توجہ دیتے تھے اور ان تمام کلا کاروں کی سر پرستی بھی کرتے تھے جو سُر سنگیت کی کلا کا مظاہرہ کرتے تھے۔ (30)

ہندایرانی ذرائع و ماخذ بھی سُر سنگیت کے کلا کاروں کے سر پرست اکبر کے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں اور خصوصاً آئین اکبری کے ذیلی باب جو شاہی سنگیت کاروں کے (خوں یا گراں) اتار چڑھاؤ کے ذکر پر مشتمل ہے۔ (31) سُر سنگیت کی جادوئی طاقت کے صوتی بیان کے بعد ابوالفضل بتاتا ہے کہ بہت سے مرد اور خواتین درباری سنگیت کاروں (جن میں ہندو، ایرانی، طورانی اور کشمیری شامل تھے) کو سات درجوں میں ترتیب دیا گیا ہے جن میں ایک ہفتہ کے ایک دن اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا۔ (32) اس طبقے کے لوگوں کا جانچنا بہت مشکل ہے اسی لئے ابوالفضل نے صرف چھتیس اہم سنگیت کاروں کی فہرست دی ہے، ان کے نام دیئے ہیں اور جن مقامات سے وہ آئے تھے ان کے بھی نام ہیں۔ ان سنگیت کی قسم پر مہارت کا بھی حوالہ دیا گیا ہے خواہ وہ گائیک (گوئندہ) ہو یا پڑھنے والے (خوانندہ) ہوں یا آلہ موسیقی بجانے والے (سازندہ) ہوں۔ (33) تان سین اور باز بہادر جیسے چند سنگیت کاروں پر مختصر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ بعضوں کے خاندانی روابط کا بھی ذکر ہے۔ شاہی سنگیت کاروں کے لئے دستیاب کچھ

تفصیلات کا بھی گو کہ یہ ذکر غیر مرتب ہے ذکر ہوا ہے۔ ان کی فہرست اہم ہے۔ ان سے منکشف ہوتا ہے کہ مغل حکمراں ایران، خراسان اور وسطی ایشیا کے سُر سنگیت سے بھی لگاؤ رکھتے تھے۔ ہندستان کے سُر سنگیت سے بھی ان کو اسی قدر لگاؤ تھا۔ اول قسم کا سُر سنگیت اپنے کردار کے اعتبار سے زیادہ آلاتِ موسیقی سے مشروط تھا جبکہ آخرالذکر زیادہ سے زیادہ زبانی یا صوتی تھا جس کے بہت سے گائیک گوالیار کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے بلکہ عموماً مدھیہ دیش سے جس کو سودیش بھی کہتے ہیں۔ سودیش یا مدھیہ دیش ایک جانا مانا ادبی اور فنی علاقہ تھا اور اب بھی سیف خاں فقیر اللہ 1666ء جیسے ہند ایرانی لکھاری کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔(34)

ابوالفضل کی دی گئی فہرست میں اول جس کو اکبر کی سرپرستی کی وجہ سے شہرت کا تاج ملا تھا میاں تان سین گوالیاری تھے۔ جن کے برابر کا کوئی کلاکار ہزار برس بعد بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔(35)

اکبر نے جب تان سین کو 1562ء میں رام چندر بگھیلا سے حاصل کیا تھا اس کی اپنی عمر بیس برس کی تھی۔ تان سین جس کی ابتدائی زندگی کے حالات نامعلوم ہیں ریوائے بگھیلا دربار میں پہلے ہی سے نام پیدا کر چکا تھا۔ اس کی سند بگھیلا بادشاہوں کے ایک شاہی شاعر و اسکالر مادھو کی مرتب کی گئی سنسکرت کتاب (1555) ''ویرا بھانو دے کاویا'' سے ملتی ہے۔ یہ کتاب بگھیلا بادشاہوں کی تعریف کے ساتھ ان ہی کے نام سے منسوب ہے۔(36) ''ویرا بھانو دے کاویا'' کا دسواں کینٹو شاہ رام چندر کے زبانے سے متعلق ہے۔ ایک بیت میں شاعر بتاتا ہے کہ بادشاہ نے تان سین نامی کلاکار کو جو سُر سنگیت کا واقعی اوتار تھا ہر ایک راگ، ہر قسم کی تان اور ہر ایک دھرپد کے عوض جس کا وہ مظاہرہ کرتا تھا ایک کروڑ چاندی کے سکے (ساوسان کاؤ اور تنکا) پیش کرتا تھا۔(37) اس کے بعد تان سین کی فنکارانہ صلاحیت کا ذکر کیا گیا ہے جس میں دھرپد کے شاعر مرتب کی حیثیت سے اس کی ادبی مہارت پر زور دیا گیا ہے۔(38)

ابوالفضل اور بدایونی دونوں ہی تفصیلات پیش کرتے ہیں گو کہ ان کے بیانات میں تضاد ہے۔ تان سین مغل دربار تک 1562ء میں کس طرح پہنچا اس پر دونوں کا مختلف موقف ہے۔ بدایونی کے بیان سے موازنے کو آسان بنانے کے لئے مکمل بیان زیر نظر ہے جیسے کہ ود ایچ۔ بیورج کے اکبر نامہ کے انگریزی ترجمے میں ہے۔(39)

''اہم واقعات میں ایک تان سین کا مغل دربار میں آنا تھا۔ (آگے مبالغہ کے ساتھ بادشاہ کی تعریف، اس کی روحانی قوت کا ذکر اور علوم پر مہارت کا ذکر ہوا ہے)۔ گوالیار کے کلاونتوں میں سے اپنے زمانے کے سب سے مشہور تان سین کی شہرت جب بادشاہ کے کانوں تک پہنچی اور اسے بتایا گیا کہ تان سین تنہائی میں ریاض کرتا ہے اور وہ اپنا وقت راجا پنّاہ رام چندر کے حضور گزارتا تھا تو عالم پناہ نے حکم دیا کہ اسے درباری سُر سنگیت کاروں کی فہرست میں داخل کر لیا جائے۔ پسندیدہ ملازم جلال خان کورشی کو ایک شایانِ شان حکم کے ساتھ راجا کی طرف بھیجا گیا تھا تا کہ تان سین کو دربار میں لایا جائے۔ راجا نے شاہی پیغام وصول کیا اور ایک سفیر کو بھیجے جانے کو اپنے لئے اعزاز سمجھا۔ سفیر کو مشہور ہاتھیوں کے تحفے اور قیمتی ہیرے جواہرات دے کر واپس بھیجا۔ تان سین کو بھی اہم اور موزوں آلات پیش کئے۔ تان سین کا بادشاہ نے سواگت کیا اور انعامات و اکرامات سے نوازا۔ اسے ایسی پگڑی عطا کی گئی جو سب سے اعلیٰ تھی۔ تان سین کا مزاج بھی بادشاہ کے مزاج سے مطابقت رکھتا تھا اس لئے وہ بہت طویل عرصے تک دربار اور بادشاہ کے ساتھ رہا۔ اس نے سُر سنگیت اور دھنوں کو مرتب کرنے کے فن کو خوب ترقی دی تھی۔''

بدایونی نے منتخب التواریخ میں جگہ جگہ تان سین کے حوالے دیئے ہیں اور مختلف حوالوں اور راگ رنگ کی محفلوں کے حوالوں سے اس کا ذکر کیا ہے لیکن کٹر پنتھی ملا نے اس کی زیادہ پذیرائی نہیں کی ہے البتہ اس کی مذمت بھی نہیں کی ہے۔ مغل طاقت کے سامنے راجا رام چندر کی اطاعت کا اور اس کے اکبر کو دیئے جانے والے پرتعیش تحائف کا حوالہ دیتے ہوئے بدایونی راجا کی فیاضی کا ذکر کرتا ہے۔ ''رام چندر مزاجاً فیاض تھا اس کے مقابلے میں ایک شخص کی کوئی دوسری مثال ہمارے زمانے میں نہیں ملتی ہے اس نے ایک ہی دن میں سنگیت کار میاں تان سین کو ایک کروڑ روپیہ پیش کئے تھے۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ (40) اس نے کس طرح براہیم سور کو نشانِ بادشاہی دیا تھا۔ میاں تان سنگھ ان کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا مگر آخر میں جب جلال الدین کروشی آیا اور اسے اس کے فرض سے آگاہ کیا۔ (40)

راجا رام چندر کا تان سین کو رخصت کرنے کے حوالے سے بچنے کی کوشش جو فطری طور پر صحیح تھی جیسا کہ بدایونی لکھتا ہے کہ راجا رام چندر تان سین کو چھوڑنے پر راضی نہیں تھا اور اس کا

یہ رویہ بالکل حق بہ جانب بھی تھا مگر اسے اپنی مجبوری کا بھی احساس تھا۔ یہ رائے حقیقی صورتِ حال کو سمجھنے میں مصنف کی کامیابی کی نشاندہی کرتی ہے اور جس کا ذکر سرکاری مورخوں کے یہاں نہیں ملتا ہے۔

شاہ جہاں کے زمانے سے متعلق دوسرے ماخذ نے بھی رائے زنی کے لئے اس واقعہ کو موضوع بنایا ہے جیسے کہ عبدالحمید لاہوری کا پادشاہ نامہ (41) بعد کے متون میں بھی اکثر یہ حوالہ آیا ہے کہ تان سین راجا رام چندر کے دربار کا سنگیت کار تھا۔ شاہی دربار سے وابستہ ہونے سے پہلے جیسا کہ ہمیں عنایت خان راسخ کے "رسالہ ذکر مغنیانِ ہندستان سے بھی معلوم ہوتا ہے۔" (جنم برس 1701ء)۔(42)

مختصر سوانح معاصر الامراء (1780ء) میں راجا رام چندر بگھیلا کو ملنے والے حکم پر مصنف شاہ نواز خاں اکبر کے دربار میں تان سین کی آمد کا منظر دکھاتا ہے جو ابوالفضل کے بیان سے مطابقت رکھتا ہے۔ وہ اس رقم کا بھی ذکر کرتا ہے جو اکبر نے تان سین کو دی تھی۔ تان سین جب آیا تو پہلے ہی روز بادشاہ نے اسے دو کروڑ دام پیش کئے تھے جو موجود زمانے کے دولاکھ روپیہ کے برابر تھے۔ تان سین نے اپنے فن کا جب مظاہرہ کیا اس وقت بادشاہ بے قابو ہو گیا تھا۔ اس کی تصانیف جن میں کئی پر اکبر کا نام دیا ہوا ہے آج بھی رائج ہیں۔(43) اس آخری رائے کو اس حقیقت سے مزید تقویت پہنچتی ہے کہ گانوں کے بہت سے متون جن پر تان سین کے دستخط (چھاپ) تھے اور جنہیں اکبر کے نام سے منسوب کیا گیا تھا سترہویں صدی کے درباری سنگیت کاروں اور گانوں کے مجموعوں میں بطور حوالہ ملتے ہیں جن پر آگے گفتگو ہو گی۔(44) زبانی روایت جس کے محرک غالباً بعد کے زمانے کی مقامی زبانوں میں لکھی گئی سوانح تھیں بہت سی کہانیوں کا حوالہ دیتی ہیں جن سے راجا رام چندر کی بے بسی اور اپنے درباری سنگیت کار تان سین سے اس کے گہرے دلی تعلق کو منعکس کرتی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب تان سین آگرہ کے لئے روانہ ہوا تو راجا رام چندر بھیس بدل کر اس کے گدی بردار بن کر ساتھ ہو لئے تھے۔ ایک جگہ سفر کے دوران جب وہ پانی پینے کے لئے رکا تو اس نے راجا کو پہچان لیا تھا۔ ایک اور کہانی میں کہا گیا ہے کہ تان سین نے رخصت ہوتے ہوئے وعدہ کیا کہ وہ شاہی انعام واکرام کو وصول کرنے کے لئے اپنا دایاں ہاتھ کبھی استعمال نہیں کرے گا جو اس

بات کی علامت ہوگا کہ اس نے راجہ بگھیلا کو اپنی مرضی سے نہیں چھوڑا ہے اور یوں اس کا یہ عمل مغل دربار کے سخت آداب کی خلاف ورزی کے مترادف تھا۔(45)

(ب) درباری سنگیت کاروں کے مابین مقابلے کی دوڑ

تان سین کے بارے میں ابوالفضل کے پُرزور بیانات کے باوجود ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں دربار میں اور بہت سے اچھے کلاکار، شعرا، گائیک اور سازندے وغیرہ بھی تھے جو اکبر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا کرتے تھے۔ اس قسم کے ایک واقعہ کا حوالہ بدایونی بھی دیتا ہے۔ جب وہ فتح پور سیکری کے 1577ء میں بنائے جانے والے حوض مربع کا بیان کرتا ہے جس کا مرکزی فرش (پلیٹ فارم) دربار سے چار پلوں کے ذریعہ جڑا ہوا تھا اور یہ پل اکبر کے رہائشی جگہ کے سامنے تھے۔ اس کو اب انوپ تلاؤ (تالاب) کہا جاتا ہے۔ اکبر نے ایک ایسا خانہ بھی بنوا رکھا تھا (مرتب کے مطابق ٹینک) جو اوپر تک بیس کروڑ کے تانبے کے سکوں سے بھرا رہتا تھا۔

''ایک روز اکبر نے شیخ بنجھو نامی کسی شخص کا انٹرویو لیا تھا۔ وہ ایک گائیک (قوال) تھا جس کی آواز بڑی نغمہ بار (خوش خوان) تھی۔ وہ صوفی قسم کا آدمی تھا اور شیخ ادھن جس کا تعلق جونپور سے تھا (اس کے نام سے اس وفات کی تاریخ 970ھ نکلتی ہے) کا چیلا تھا۔ مقابلے کے لئے میاں تان سین اور کمتر سطح کے دوسرے ہندستانی گائیک بھی وہاں موجود تھے مگر اکبر نے بنجھو کو ترجیح دی اور حکم دیا کہ وہی ٹینک میں بھری ہوئی رقم لے جائے۔ تاہم اتنی بڑی رقم لے جانے کی اس کی حیثیت نہیں تھی چنانچہ اس تمام رقم کے بجائے تھوڑی سی مقدار میں سونے کی مانگ کی تھی۔ بادشاہ نے اس کے مطابق تبادلے میں تقریباً ایک ہزار روپیہ اسے پیش کئے تھے جبکہ جمع رقم کے باقی حصے کو بادشاہ نے کم یا زیادہ تین برسوں کے دوران دوسرے اخراجات کے لئے استعمال کر کے اس جمع رقم سے نجات حاصل کر لی تھی۔ اس دوران اپنے بے جا اخراجات کے حوالے سے بادشاہ کو ابوالفضل کے والد شیخ مبارک کا ناصحانہ بیان ملا تھا۔ اس سے پہلے سنگیت کی ایک نمائش ابوالفضل کے بھائی شیخ فیضی نے کہا تھا کہ ہمارے شیخ مبارک کا دربار سے زیادہ لینا دینا نہیں ہے مگر بادشاہ نے جواباً کہا کہ نہیں، اس تمام وہ تمہارے لئے

چھوڑے ہیں۔ اس نے شیخ بنجھو۔ میاں تان سین اور دوسرے سنگیت کاروں کو شیخ مبارک کے پاس بھیجا تا کہ ان کی قدر و قیمت کا شیخ کو اندازہ ہو سکے۔ اس نے میاں تان سین سے مخاطب ہو کر کہا سنا ہے کہ تم کچھ گا لیتے ہو۔ اس نے گانا سنا، اس کا موازنہ جنگلی جانوروں کی آوازوں سے کیا اور تان سین کی آواز کو ان سے کمتر قرار دیا۔(46)

بدایونی کے بطور سُر سنگیت کے ناقد شیخ مبارک کو نیچا دکھانے کی خواہش کے باوجود اس بیان کا دستاویزی پہلو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ درباری سنگیت کاروں اور صوفی سنگیت کاروں کے درمیان مضبوط تعلق تھا۔ اس زمانے میں تان سین کے اصل سنگیت کے بارے میں کسی معاصر اعداد و شمار کا فقدان تھا چنانچہ اس کی شاعرانہ صلاحیت کی جو واہ واہ تھی اس میں بھی تضاد ہے۔ تان سین کی آواز کے بارے میں مذمتی رائے کے ساتھ یہ حقیقت بھی توجہ کے قابل ہے کہ اس کی عمر زیادہ ہو چکی تھی۔ اس کو جب 1562ء میں دربار سے وابستہ کیا گیا تھا اس وقت وہ خود اپنے فن سے سبکدوش ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

(ج) تان سین کی وفات

اکبر نامہ کا ایک اور اہم تاریخی پہلو تان سین کی وفات سے تعلق رکھتا ہے۔ "15 دو (اردی بہشت 997 / 20 اپریل 1589ء) کو میاں تان سین کی وفات ہوئی اور عالم پناہ کے حکم کے مطابق تمام سنگیت کار اور گائیک اس کے جنازے میں شریک ہوئے تھے۔ وہ اس طرح گا بھی رہے تھے جس طرح شادی کے موقع پر گایا جاتا ہے۔ اس عہد کی مسرت کا تان سین کی وفات کے ساتھ خاتمہ ہو گیا تھا۔ عالم پناہ نے کہا کہ اس کی موت سُر سنگیت کی موت ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ بعد کے ہزار برسوں کے دوران بہت کم ہوں گے جو اس کی آواز کی مٹھاس اور فن کے برابر ہو سکے ہوں۔(47)

میری معلومات کے مطابق تان سین کی وفات کے بارے میں کوئی دوسرے ہند ایرانی بیانئے حوالہ نہیں دیتے ہیں نہ اکبر پر اس سانحے کے اثرات کا ذکر کرتے ہیں اور نہ ان احکامات کا کوئی حوالہ جو بادشاہ نے آخری رسومات کے اہتمام کے موضوع پر جاری کئے تھے۔ اکبر نامہ کا بیان اس لئے بہت سے سوالوں کو جنم دیتا ہے جن کو کوئی جواب نہیں ملتا ہے۔ جیسے کہ مقام

جہاں تان سین کی وفات ہوئی تھی۔ موجودہ زمانے کے مقبول بیانئے اس واقع کے وقوع کو آگرہ سے یا فتح پور سیکری سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ہے کہ ان دنوں اکبر لاہور میں تھا اور کشمیر کی طرف اپنے پہلے سفر کو روانہ ہونے والا تھا۔(48) ابوالفضل نے حتمی تاریخ لکھی ہے اور اس کے بیان سے نظر آتا ہے کہ اس واقعہ کا اکبر خود شاہد بھی تھا۔ متن اس چیز کا بھی حوالہ دیتا ہے جس میں تان سین کے مردہ جسم کو دفن کرنے سے پہلے رکھا گیا تھا۔ فارسی متن کی اصطلاحات وعبارت غیر مبہم ہے اور دفنانے کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے چنانچہ اس کی قبر کا مسئلہ تان سین کی سوانح کے ایک اور متنازعہ پہلو کی نشاندہی کرتا ہے یعنی اس کے عقیدے اور گوالیار میں اس کی قبر کے بارے میں جو شیخ محمد غوث کے مزار سے قریب بتائی جاتی ہے جو یقیناً تان سین کا گرو بھی رہا ہوگا۔(49) قبر کے بارے میں تحریری حوالہ کہ تان سین کی قبر گوالیار میں ہے بعد کے زمانے کا ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس کا پہلا حوالہ تحفۃ الہند (1675ء) میں ہے جو کہ مرزا خان کا انسائیکلوپیڈیائی (قاموسی) کام ہے جس میں ہندستانی اور ایرانی سُر سنگیت کے عنوان سے ایک مکمل باب شامل ہے۔(50)

مرزا نے تان سین کی زندگی کا خاکہ راجا (ریوا کا راجا رام چندر) سے شروع کیا ہے جس کے بعد اس نے اکبر کے دربار سے وابستگی اختیار کی تھی۔ وہ چونکہ شیخ محمد غوث گوالیاری کا چیلا تھا اس لئے اسے اسی مزار (روضہ) کے احاطے کی پھلواری میں دفن کیا گیا تھا۔(51) دونوں قبروں کا ایک اور مرتب بیان مع تان سین کے تاریخی کیریر جیمس فوربس کے بیان میں ملتا ہے جو مئی 1785ء میں گوالیار میں تھا۔(52)

تان سین کے مذہب کے بارے میں جو تنازعہ سنگیت کاروں اور سنگیت کے مورخوں نے اٹھایا ہے وہ باقاعدگی کے ساتھ اس زمانے میں دوبارہ ابھر آتا ہے جب گوالیار میں اس کے سالانہ عرس کی تقریب ہوتی ہے، اس کی قبر پر چادر چڑھائی جاتی ہے اور ساتھ ہی سُر سنگیت کا جشن برپا ہوتا ہے تاہم تازہ تنازعہ پر کوئی مزید بحث اس مقالے کے حدود سے علاقہ نہیں رکھتی ہے۔

جیسا کہ مادھو کے سنسکرت متن اور ہند ایرانی حوالوں سے شہادت ملتی ہے تان سین محض سنگیت کار نہیں تھا۔ وہ ایک شاعر بھی تھا (وگیا کار) جس کی غزلوں کو زیادہ تر مدھیہ دیسی بھاشا لکھا گیا تھا جس کو بعد میں برج بھاشا کہا جانے لگا تھا۔(53) یہ حقیقت کہ اکبر نے اس کی

سرپرستی کی تھی اور دوسروں نے بھی اسے پسند کیا بتاتا ہے کہ بادشاہ مقامی زبانوں کو جانتا اور سمجھتا تھا جن میں گانے لکھے اور بنائے گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ ان کی امیجری اور جمالیاتی اقدار کا پارکھ اور مداح تھا جو فارسی شاعری کے مقابلے میں بالکل مختلف تھیں۔(54)

(د) دوسرے درباری سنگیت کار

ابوالفضل نے جن دوسرے درباری سنگیت کاروں اور شاعروں کا ذکر کیا دوسرے تمام دستیاب ماخذ ان کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں بتاتے ہیں۔ اکبر جن دوسرے شاعر گیت کاروں کی سرپرستی کرتا تھا ان میں مالوہ کا حکمراں باز بہادر بھی تھا۔ ابوالفضل کے مطابق مغل بادشاہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے پہلے وہ ایک ایسا گائیک تھا جس کا کوئی حریف نہیں تھا۔ وہ ایک دلچسپ سیاسی شخص بھی تھا جس کی روپ متی کے ساتھ رومان کی کہانی نے موسیقی اور رقص کے شعبوں میں اس کے حقیقی کارناموں کے مقابلے میں اتنی مقبول ہوئی کہ بہت سے فیاضی لیجنڈ قسم کے بیانیوں اور موجودہ زمانے کے رقص و سرود کاروں نے اس سے تحریک حاصل کی ہے۔(55) اس کو یہ حق یقیناً پہنچتا کہ اس کے کارناموں کا صحیح جائزہ ہندی ایرانی ماخذ، مقامی زبانوں کے ادب اور ضمیاتی دستاویزات کے تناظر سے لیا جانا چاہئے۔ اس کی بہت سی غزلیں اواخر سترہویں صدی کے مجموعوں میں ملتی ہیں۔ ایک اور اہم اور اپنی کلا میں ڈوبا ہوا پُستی سمپر ادائے کا شاعر (بھگت کوی) اور درباری سنگیت کار دھوندھی کے نام کا بھی حوالہ آیا ہے۔ پستی سمپر ادائے ولا بھا چاریہ کا وشنو وادی فرقہ تھا جس کے مغل دربار سے بہت گہرے روابط تھے۔(56)

4: ہند ایرانی ماخذ۔ ایک طائرانہ مطالعہ

ہند ایرانی متون سے جمع کی گئی معلومات ہندستانی اور ایرانی دونوں ہی قسموں کے سنگیت کی دستاویزات محفوظ کرتے ہیں جن کو اکبری دربار کی سرپرستی حاصل تھی۔ بہت سے سنگیت کار اپنی جغرافیائی اور ثقافتی اصل کی وجہ سے سنگیت کی مختلف قسمیں ساتھ لے کر آئے مگر جب دربار سے وابستہ ہوئے تو انہوں نے ان قسموں کو ایک رنگ و روپ دینے کی کوشش کی اور جس کی اکبر

نے سر پرستی بھی کی۔ آرٹ اور سُر سنگیت کے دو نمایاں رجحانات کا باہمی اشتراک اور بعض لوک قسموں کی موجودگی جن کے حوالے ابوالفضل اور بعد کے قلمکاروں جیسے سیف خاں، فقر اللہ نے دیئے ہیں اور درباری سنگیت کاروں کی آوت جاوت ایک ایسا منظر دکھاتی ہے جن کا دستیاب معاصر تحریری ماخذ کے ذریعہ جائزہ لینا بہت مشکل ہے۔

کیا پھر اکبری دربار ملے جلے یا کھچڑی قسم کے سُر سنگیت کے اسالیب کی تجربہ گاہ تھا؟ جو اب تک ہندستانی موسیقی میں زندہ وفعال ہے؟ کیا ایرانی اور ہندستانی سنگیت کار ہند ایرانی سُر سنگیت کے عمل کو بڑھاوا دے رہے تھے؟ جس کی اکبر ہمت افزائی کرتا تھا؟

(ب) بطور سرپرست موسیقی اکبر سے متعلق مقامی زبانوں کے ماخذ

مقامی زبانوں میں تخلیق کیا جانے والا ادب خصوصاً برج بھاشا کا جو سولہویں صدی سے لے کر بعد کے زمانوں پر محیط ہے اور اس کا علاقہ آگرہ۔ گوالیار یا مدھیہ دیش ہے تحریری ماخذ کا قیمتی سرمایہ ہے جو مغل تاریخ کے سماجی وثقافتی پہلوؤں کو دستاویزی صورت دیتا ہے۔ برج بھاشا کا شعری ونثری کام کو جن میں اکبر کو بطور سُر سنگیت کے سرپرست موضوع بنایا گیا ہے دو وسیع تر قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ماخذ کے اولین نمونے ویسنو کے مقدس ہستیوں کے حوالے سے بیان ہیں۔ (وارتا اور اسی طرح کا ادب) اور دوسرے آرٹ سنگیت میں گائی جانے والی غزلیں جن کی سرپرستی بھی اکبر کرتا تھا بلکہ بطور شاعر وہ خود بھی شعروں کو دھنوں پر مرتب کرتا تھا۔

1- صحائف نگاروں کی شہادتیں

اپنی بہت زیادہ مقبول اپیل کے متوازی ویشنو وادی اور زیادہ جامع کرشنا وادی نشاۃ الثانیہ نے جو برج علاقے کے قدیم مقدس کردار کی از سرنو دریافت سے منظر عام پر آیا تھا ایک ایسی تحریک بنا جس کے زیر اثر وسیع حمدیہ ادب تخلیق ہوا جو تحریری اور زبانی روایات کے روپ میں موجود ہے۔ (57) ان متون کی پہلی قسم جو اکبر کے امیج کی سند رکھتی ہیں بھگتی تحریک کے زیر اثر سترہویں صدی اور اس کے بعد کے زمانوں کے نثری کام اور تخلیق کی جانے والی شاعری پر مشتمل ہے۔ ماضی کے مہان سنتوں سادھوؤں کے سوانحی بیانات ہونے کی بنا پر یا مختلف فرقہ

جاتی تحریکات کے بانیان و پیروکاروں کی سوانح ہونے کی بناپر ان متون کا مقصد زبانی روایت کے ذریعہ پڑھنے اور سننے والوں کے وسیع تر حلقے کے شعور و کردار کی تربیت کرنا تھا۔ ولبھ آچاریہ (1479-1531ء) پستی مارگ کا بانی (پستی=خدا کی عطا کے ذریعہ تکمیل وحدت کا طریقہ) اور اس کا جانشین بیٹا وٹ حال ناتھ (1515-1586ء) جس نے حلقے کو منظم کیا تھا اور اسے پھیلاؤ مہیا کیا تھا ان مذہبی لیڈروں میں نمایاں ہیں جو شخصی طور پر قیمتی ادبی تخلیق کے سرمائے زیادہ برج بھاشا کو مانتے ہیں یا اس سے تحریک حاصل کرتے ہیں یا اس کی سرپرستی کرتے ہیں۔(58) ولا بھائیاں سیرتوں کا سرمایہ وارتا کہلاتا ہے۔ بنیادی وارتا کاوراسی دیس ناون کی وارتا ہیں اور دوسو باون دیس ناون کی وارتا ہیں جو ولبھ کے چوراسی چیلوں اور وٹ حال ناتھ کے دوسو باون چیلوں کی ترتیب کے ساتھ داستانی (لیجنڈری) زندگی کو بیان کرتے ہیں۔ (لفظ کوراسی=چوراسی)۔(59) دونوں ہی متون ہیں جن کی تنقیدی تشریح نہیں ملتی ہے اور وہ وٹ حال ناتھ ایک بیٹے گوکل ناتھ (1551-1647؟ء) کی بتائے جاتے ہیں لیکن گوکل ناتھ کے ایک چیلے ہری رے کو جو وارتا کی تشریح (بھاؤ پرکاش) کے مصنف ہیں عموماً اول الذکر وارتاؤں کا اصل مرتب سمجھا جاتا ہے۔

اکبر اکثر تان سین کے ساتھ دکھائی دیتا تھا۔ ان متون میں بار بار آنے والا موضوع اس طرح ہے۔ دربار میں کوئی ایک سنگیت کار جو کہ اکثر تو تان سین ہی ہوتا تھا سادھو ویشنو اشاعر (بھگت کوی) کوئی نظم یا پد گاتا تھا۔ اکبر گانے کے بول مرتب کرنے والے کے بارے میں دریافت کرتا تھا اور پھر اسے سادھو شاعر کے پاس لے جایا جاتا تھا۔ یہاں سادھو اپنے طریقے سے بادشاہ کا امتحان لیتا تھا اور اس بات چیت اور سوال و جواب کے نتیجے میں کوئی اخلاقی قدر سامنے آتی تھی۔ خیال میں مختلف پہلو ہوتے تھے لیکن ان میں بطور سنگیت خصوصاً ہندستانی گلے کا سنگیت اور مقامی زبانوں کی غزلوں کے سرپرست کے مرکزی امیج اکبر ہی کا ابھرتا تھا۔ اس سے اکبر کی تجسس کی عادت اور مذہبی واردات کے بارے میں خیالات کا علم ہوتا ہے۔

برج ماخذ سے مستعار بعض منتخب مثالیں بہت اجزا پیش کرتی ہیں جو سادھو شاعر دوں سورداس، کمبندھ داس اور نند داس کے پروں پر مرتب کئے گئے گانوں اور برہم چاری سنگیت کار سوامی ہری داس سے اکبر کی خصوصی دلچسپی کو واضح کرتی ہیں۔ ان تینوں کے مابین

بھی تان سین بیچ کے آدمی کی طرح نظر آتا تھا جو اکبر کے حضور ذہن کو گرفت کرنے والی غزلیں گاتا تھا۔

الف: سورداس

سورداس کی سوانح نے بہت زیادہ عالمانہ کاموں کو تحریک فراہم کی ہے، تھوڑے اور متنازعہ تاریخی اجزا کو استعمال کرتے ہوئے ویشنو وادی (ولبھائیتی مع غیر فرقہ وارانہ) مقدس ہستیوں کے سوانحی ماخذ اور ادبی کام اسی سے منسوب ہیں۔ جو تنقیدی تناظر میں ترتیب کے مرحلے میں ہیں۔(60) کوراسی ویس ناون کی وارتا، سورداس اور ولبھ آچاریہ سے اس کی ملاقات جو اس کے گرو کی ایماء پر ہوئی۔ اس کے شاعرانہ میں ترتیب کے مرحلے میں ہیں کام کا مکمل انتساب پستی مارگ کے نام جو یقیناً بعد کے فرقوں کا کام ہے۔ وارتا کا تیسرا حصہ (پراسنگ) سورداس کی مرتب کی ہوئی بہت سی غزلوں پر مشتمل ہے جن کو ہر شخص پڑھتا اور گاتا تھا۔ درج ذیل واقعہ جس میں اکبر اور تان سین شامل تھے یہاں ہم اسے رچرڈ بارز کے ترجمے سے مستعار لے کر اس کا اختصار پیش کریں گے۔(61) ایک اکبر نے سورداس کی ایک غزل (پد) جو تان سین نے گائی سنی تھی۔ اس کے فوراً بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ سورداس کو دربار میں لایا جائے جو صرف برج میں گوردھن پہاڑی پر شری ناتھ جی کے لئے گاتا تھا۔ کچھ مشکلات پر قابو پانے کے بعد بھگت شاعر اکبر کے پاس لایا گیا۔ بادشاہ نے احترام کے ساتھ فرمائش کی کہ وہ وشنو کے اعزاز میں کوئی مرتب نظم گائے۔ اس نے گا کر سنایا جس سے بادشاہ بے حد متاثر ہوا اور خوب واہ واہ کی۔(62) اس کے بعد بادشاہ نے یہ فرمائش کر کے کہ وہ بادشاہ کی شان میں کچھ گا کر سنائے سورداس کو جوش دلایا۔ فرمائش کی تکمیل کرتے ہوئے اس نے گانا گایا مگر یہ گانا اکبر کی نہیں کرشن کی تعریف میں تھا۔(63) شاعر کی روحانیت سے متاثر ہو کر اکبر نے اس سے کسی بیت کی ذومعنویت پر سوال کیا۔ وہ شاعر کو انعام بھی دینا چاہتا تھا مگر شاعر نے انعام لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد سورداس نے بادشاہ سے کہا کہ آئندہ وہ کبھی دوبارہ اس سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ ایک اور واقعہ اکبر کی نہ صرف سنگیت کے عملی پہلو سے بلکہ درباری سنگیت کاروں کی گائی ہوئی غزلوں سے دلچسپی پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ سورداس کی مرتب کی ہوئی

غزلوں کے گائیکوں کو سونے اور چاندی کے سکّے دیئے تھے اور ان کے فارسی میں کیئے گئے ترجموں کو پڑھا تھا۔

فرقہ کے یہ بیانئے واضح طور پر اکبر کا امیج اور ہندو کلچر کے بارے میں جانکاری کی اس کی خواہش کو منعکس کرتے ہیں۔ یہ بات قابل توجہ اور دلچسپ ہے کہ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ اکبر نے سورداس کے کلام کا فارسی ترجمہ کروایا تھا گو کہ متعلقہ بیانیہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ بادشاہ ان غزلوں کے معنی اب جس وقت سورداس نے اس کے کہنے پر گائی تھیں فوری طور پر سمجھ رہا تھا اور یہی وجہ ہے کہ بادشاہ نے غزلیں سن کر اسی وقت تعریفی ردعمل کا اظہار کیا تھا۔

(ب) کمبھنداس

کوراسی ویسواناون کی ورتا میں ولبھ کے چیلے سادھ شاعر کمبھنداس کی وارتا سے اکبر اور اس کے ایک سنگیت کار (کلاوت) جس کا نام نہیں بتایا گیا ہے کے تعلق کا بیان ملتا ہے۔ زیر حوالہ بے نام سنگیت کار نے بادشاہ کے سامنے کمبھنداس کا کلام فتح پور سیکری میں گایا تھا۔ بھگت شاعر پر اکبر کے لوگوں نے دباؤ بھی ڈالا تھا کہ وہ دربار میں آئے۔ بادشاہ نے اسے لانے کے لئے سواری بھی بھیجی تھی مگر سواری پر آنے کے بجائے وہ پیدل چل کر دربار میں آیا تھا۔ سواری پر بیٹھنے سے اس نے انکار کر دیا تھا۔ پیدل چلتے ہوئے اس نے اپنی دھرتی ماتا برج چھوڑنے اور نرگ کی طرف جانے پر خود کو کوسا بھی تھا۔ دربار میں آکر شاعر نے ایک تازہ پد تخلیق کی اور اسے اکبر کے سامنے گا کر سنایا تھا۔ اس نے کہا کہ "اب میں اس ہستی کو خراجِ عقیدت پیش کروں گا جس کا چہرہ دکھ اور غم لے کر آتا ہے۔ لال گریدھر کی غیر موجودگی میں یہ محل ویران دکھائی دیتا ہے۔(65) پہلے تو اکبر نے ناراضگی کا اظہار کیا لیکن پھر اسے محسوس ہوا کہ کمبھنداس اپنے گرو کی ذات میں کس حد تک ڈوبا ہوا ہے چنانچہ بادشاہ نے سادھو سے کہا کہ بابا صاحب آپ جس بھی حکم کے لئے کہیں میں وہ حکم دینے پر تیار ہوں۔ کمبھنداس نے جواب دیا کہ اس دن کے بعد سے پھر کبھی آپ مجھے نہیں بلائیں گے۔ اس کے یہ الفاظ سننے کے بعد اکبر نے ناگواری کے ساتھ اسے جانے کو کہا تھا۔(66)

سُر سنگیت سے اکبر کی دلچسپی کے حوالے سے دوسو باون ولیس ناوان کی وارتا کی بعض

وارتاؤں میں ملتے ہیں جن میں تان سین کا بھی ذکر ہے۔ایک اور واقعہ گوند سوامی کے وارتا میں بیان ہوا ہے۔اکبر گوند سوامی کے بارے میں معلومات ہونے کے بعد بھیس بدل کر اس کا سنگیت سننے گیا تھا۔اس کے سنگیت سے بے حد متاثر ہونے کی وجہ سے اکبر خود پر قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار واہ واہ کرنے لگا۔اس سے گوند سوامی غصے میں آ گیا جس کے بعد اس نے راگ بھیروں نہ گانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ واہ واہ کی وجہ سے راگ میں آلودگی شامل ہو گئی تھی۔(67)

(ج) نند داس

سورداس ہی کی طرح ولبھ فرقہ کا ایک اور نمائندہ شاعر شاعر اعظم نند داس تھا۔اس کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جن کو است چھاپ کا اعزاز حاصل تھا(است چھاپ سے مراد آٹھ مہروں والا)۔دوسو باون ویس ناون کی ورتا میں اس کی بھی وارتا شامل ہے۔است چھاپ کی وارتا میں بھی کچھ فرق کے ساتھ اس کی وارتا شامل ہیں جو ولبھائیتی بیانیوں میں زیادہ نمایاں نہیں ہو سکی تھی۔(68) است چھاپ وارتا کے ایک منظر کی ایک نند داس کی کرتن کو تان سین نے اکبر کے سامنے گایا تھا جو اس کے رقص میں کرشن کے بیان سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ وہ شاعر سے ملنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔بیربل نے اسے دربار میں بلایا تھا۔جب آخر کار اکبر مانسی گنگا میں نند داس سے ملا تو بادشاہ نے اس کی نظم (پد) کی ایک سطر کے معنی اس سے دریافت کئے مگر شاعر نے معنی بتانے میں پس وپیش کیا اور اس کے بجائے شاعر نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ دربار میں جائے اور ایک خاص خاتون جو محل میں موجود ہے اس سے معنی پوچھ لے۔بیربل کو تان سین کے ساتھ چھوڑ کر وہ الٹے پاؤں دربار میں واپس گیا اور متعلقہ عورت کو بلا کر معنی پوچھے۔عورت پر نقاہت کا غلبہ طاری ہو گیا اور وہ مر گئی۔اکبر واپس بھاگ کر نند داس کے پاس آیا اور اسی لمحے نند داس کی آتما بھی اس کے جسم سے نکل کر جنت (لیلا) میں پہنچ گئی۔اس معمے کے بارے میں بیربل نے اکبر کو تفصیل سے بتایا کہ دونوں ہی عشق میں ڈوبے ہوئے معنی کو راز ہی میں رکھنا چاہتے تھے اور اس راز کو کھولنے کے بجائے دونوں نے مرجانے کو ترجیح دی۔(69)

(د) سوامی ہری داس

اواخر کے سوانحی ادب میں جو اٹھارہویں صدی اور اس کے بعد کی صدی کا ہے اور اب

موجودہ زمانے میں سنگیت کاروں کی زبانی روایت اور عوام میں مقبول بیان کے ذریعہ ہم تک پہنچتا ہے اس میں ورن دابن کے نامور سادھو سنگیت کار سوامی ہری داس کا نام آتا ہے اور اسے اکثر بطور تان سین کے گرو کے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے شاعرانہ کام بھی جانے مانے جاتے ہیں اور مشہور ہیں مگر اس کی سوانح کے بہت سے پہلو ابھی تک ابہام میں ہیں اور ان سوالوں پر بحث کا یہاں موقع نہیں ہے۔(70)

(i) سوانحی (مقدس ہستیوں کی) شہادتیں

پہلا بیانیہ جس میں تان سین، اکبر اور سوامی ہری داس کا ذکر آیا ہے "پد پر اسمگ مالا نظر آتا ہے۔ جو ناگری داس کے نام سے منسوب ہے (1764-1699ء) سونت سمھ کے نام سے کشن گڑھ کا سابق راجا تھا (1744ء سے) اور 1757ء میں سنیاس لے کر ورندابن چلا گیا تھا جہاں اس نے ناگری داس نام اختیار کر لیا تھا۔(71) پد پر اسمگ مالا پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے مگر دوسرے مختلف مسودوں میں اس کی نقلیں شامل ہیں ان میں سے ایک پر سم وت 1748ء (1691ء) کا سال درج ہے۔ بیان کی ابتدا اکبر کے سوال سے ہوتی ہے جو اس نے تان سین سے پوچھا تھا کہ اس کا گرو استاد کون تھا اور وہ کون ہے جو اس سے بہتر گا سکتا ہے۔ تان سین نے جواباً کہا کہ وہ کل سنگیت کے باب میں وہ ایک ویشنو کا جس کا نام ہری داس جو ہے چیلا تھا جو ورندابن میں رہتا تھا۔ جیسا کہ اول الذکر قصوں میں آیا ہے اکبر اور تان سین اسی وقت سوامی جی سے ملنے کے لئے ورندابن روانہ ہو گئے تھے۔ یہاں پہلے تان سین نے ایک راگ گایا اور بعد میں مہاراج سوامی سے درخواست کی کہ وہ کچھ سنائیں۔ سری ہری داس جو نے راگ ملار (ملہار) گانا شروع کیا گو کہ یہ کیتر ویساکھ (چیت بیساکھ) یعنی (مارچ۔مئی) کا مہینہ تھا مگر بادل امڈ کر آنا شروع ہو گئے تھے اور مور کوکو کرنے لگے تھے۔ اس کے بعد سوامی جی نے بسو پد (وشنو پد) گانا شروع کیا۔ موسم بھی ایسا تھا کہ موروں نے ناچنا گانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے بول شاعر نے اسی وقت تیار کئے تھے۔ راگ چھیڑنے کے بعد فوراً بارش شروع ہو گئی تھی۔(72) مختصر ابتدائیہ کا وہی انداز ہے جو لبھائیتی تحریروں میں ملتا ہے البتہ اس میں ایک جادوئی سمت کا اضافہ سوامی ہری داس کے سنگیت کی قوت کی دین ہے جو انہوں نے چیلے کو منتقل کی تھی۔

نجمت سد دھانت میں جو کسور داس (1763?) سے منسوب ہے۔ تان سین کو سوامی ہری داس کا چیلا بتایا گیا ہے جو اس متن کے مطابق نمبارک حلقے سے وابستہ تھا۔(73) تان سین نے ایک منظر کو گایا تھا جو اب تک مشہور ہے یہ راگ دیپک تھا جس نے آگ کے شعلے پیدا کر دیئے تھے۔ اسی راگ کے حوالے سے اب تک تان سین کو جانا جاتا ہے۔ اس واقعہ کا مقام رام چندر بگھیلا کا دربار ہے نہ کہ مغل دربار جیسا کہ اب جدید زمانے میں سمجھا جاتا ہے۔ آگ لگنے کے بعد رام چندر کے پاس اسے بجھانے کا سوائے اس کے کوئی اور راستہ نہیں تھا کہ کسی سے فوراً راگ ملہار چھیڑنے کو کہے جو راگ دیپک کے اثرات کو زائل کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ دربار کا کوئی سنگیت کار راگ ملہار کو صحیح طور پر نہ گا سکا تھا۔ ایک ماہر گائیک کے طور پر تان سین اڑچ کے لئے چل دیا جہاں ایک عورت نے اس کے روگ کو پہچان لیا اور پھر اسے راگ ملہار گانا سکھایا۔ عورت کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ وندرابن گیا جہاں اس نے اسی راگ کو سوامی جی (سوامی ہری داس جس کو کہ متن میں مرکز بنایا گیا ہے) سے سیکھا اور اسی کا داس ہو گیا۔ (داس کے معنی ہیں پرستار)۔ یہاں سے وہ آگرہ گیا جہاں اکبر کو اس کے آنے کا پتہ چلا اور اسے گانے کے لئے بلایا۔ اکبر نے اس سے پوچھا کہ وہ سوامی ہری داس جی کی طرح اچھا کیوں نہیں گا سکتا ہے۔ تان سین نے کہا کہ وہ دنیا کے بادشاہ (خدا) کے لئے گا رہا تھا اور سوامی ہری داس خود اپنے لئے گا رہے تھے۔(74) جدید دور کے بیانئے اس کا زیادہ پروقار جواب دیں گے اور کہیں گے کہ خود خدا نے سوامی ہری داس کا روپ دھار لیا تھا۔(75) ایک اور واقعہ یوں ہے۔ ایک دن اکبر نے تان سین کو اس کی پاکیزگی کے عوض دو قیمتی ہیرے انعام دیئے تھے۔ بعد میں جب بادشاہ کو معلوم ہوا کہ تان سین نے ان کو دو ملازموں کو دے دیا ہے تو وہ سخت برہم ہوا تھا۔ اکبر نے ان دو ہیروں کی واپسی کا حکم دیا تھا۔ تان سین مدد لینے کے لئے راجا رام چندر بگھیلا کے پاس گیا۔ راجا نے اسے بچانے کے لئے ہیروں سے جڑا ہوا ایک پنکھا دیا جس کی مالیت اکبر کے دو ہیروں کے مقابلے میں تین سو گنا زیادہ تھی۔ رام چندر نے تان سین سے یہ بھی درخواست کی تھی کہ وہ جا کر ان کی طرف سے سوامی ہری چندر کو مبارک باد پیش کرے۔ اکبر کو اس پر بے انتہا حیرت ہوئی۔ بعد میں تان سین رام چندر کی مبارکباد پہنچانے کے لئے ورندابن چلا گیا تھا۔(76) اسی طرح کی روح لکشمن داس کی بھگت سندھو میں بھی

متحرک دکھائی دیتی ہے جس کا اصل متن تو غائب ہو گیا ہے لیکن ایف۔ایس۔گروز (1882ء) نے اس کا جو ترجمہ کیا تھا وہ ملتا ہے۔(77) بھگت سندھو کے ترجمے کا نمائندہ حصہ سوامی ہری داس سے متعلق ایک باب پر مشتمل ہے۔اس کا انحصار بعض ابتدائی سوانحی بیانیوں پر ہے (مقدس ہستیوں کی سوانح) متن اکبر۔تان سین اور ہری داس کے تعلقات پر ویسنوا بیان کے حوالے سے چند نئے اجزا کا اضافہ دکھاتا ہے۔(78) اواخر کا سوانحی ادب (مقدس ہستیوں کا سوانحی ادب) بہت ہی قیمتی زبانی روایت سے تحریک حاصل کرنے کی وجہ سے بعض رنگا رنگ اجزا پیش کرتے ہیں جو ایک داستانی (لیجنڈری) کی حیثیت سے تان سین کے سفر کا منظر دکھاتا ہے۔ان کے متون میں بھی سُر سنگیت کے سرپرست کی حیثیت سے اکبر کا امیج دکھائی دیتا ہے تاہم سُر سنگیت کے موضوع پر انیسویں صدی کے بعض ہندی متون جو مقدس ہستیوں کی سوانح اور زبانی روایت کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں مغل سنگیت کاروں کے بارے میں مذمتی بیان پیش کرتے ہیں جس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ اکبر کم معیار کے سُر سنگیت کا سرپرست تھا۔اس کی ایک اہم مثال پنالال گواسمی کی کتاب ''نادبنود گرامتھ'' ہے جو دہلی سے 1896ء میں چھپی تھی۔(79) سُر سنگیت کی تھیوری اور آلات موسیقی کے استعمال پر ہندی میں پہلا کام جس میں سوغزلیں جو راگ کی وضاحت کرتی ہیں راجا مارواڑ کے سپہ سالار سری کسور سدھا جی کا ہے اس میں تعارف نامہ کے آٹھ صفحات کا موضوع سوامی ہری داس جی ہیں۔(80)

موسیقی اور علم موسیقی پر بعد کے ثانوی ماخذ اور رسالے (مینولز) میں جو طالبعلموں کے مطالعے کے لئے منظور کیے گئے ہیں گواسامی جی کی تحریروں کے بہت سے حوالوں پر مشتمل ہیں۔(81) بیسویں میں جو تحریریں سوامی ہری داس کے موضوع پر لکھی گئی ہیں ان میں ہمیشہ اکبر کا ذکر ہوا ہے۔.........کی تقریبات کے لئے حال ہی میں جو مضامین اور کتابچے شائع ہوئے ہیں (زیر ترجمہ کتاب کے اصل انگریزی متن میں یہ جملہ ادھورا ہے ص 208 کی آخری سطر)

(ii) کچھ صنمیاتی شواہد

صنمیات بھی اکبر، تان سین اور سوامی ہری داس کے مابین ملاقات کی تصدیق کرتے ہیں جن کا بیان بعد کے مقامی زبانوں کے ماخذ میں ہوا ہے۔اس واقعہ کو تصویر کرنے والی تصویروں

معلوم ہے۔(89) اس بات کی تصدیق دستیاب ہے کہ وہ ان شاعروں کو جو مقامی زبانوں میں شعر تخلیق کرتے تھے ان کو بھی سرکاری طور پر تحفظ فراہم کرتا تھا۔(90) البتہ مقامی زبانوں کا خود بادشاہ کس حد تک شاعر تھا اس کے بارے میں کسی حتمی بات تک پہنچنا خاصا مشکل کام ہے۔ اکبر نے نام سے بہت سی بحور و آہنگ میں اور بہت سی بے بحور اور بے آہنگ ابیات منسوب کر دی گئی ہیں۔ جو مسودوں پتھر پر چھاپی گئی تحریروں اور مطبوعہ شعری مجموعوں میں ملتی ہیں۔(91) ان کی صحت بہر حال مشکوک ہی ہے اور ان پر اعتبار کرنا اسی طرح مشکل ہو جاتا ہے جس طرح کہ دوسرے شاعروں اور شاعر سنگیت کاروں پر جن کی اپنی نظمیں (مکتک) یا غزلیں (گے پد) بہت سے مجموعوں میں ادھر ادھر موجود دکھائی دیتی ہیں۔(92)

اپنی یادداشتوں میں جہانگیر لکھتا ہے کہ لال کلونت جو اپنے بچپن ہی سے اکبر کے خدمتگار کی حیثیت سے پلا بڑھا تھا اس نے بادشاہ کو ہندی زبان، اس کے حروف اور اس کی آوازیں سکھائی تھیں۔(93) ہم فرض کر سکتے ہیں کہ گائیک ہوتے ہوئے لال کلونت نے اکبر کو ہندی کے کچھ شعری اصناف یا زیادہ امکان ہے کہ برج کی سکھائی ہوں گی۔ جس میں (برج میں) اس زمانے کی غزلیں جو وکل گائیکی کے آرٹ میں گائی جاتی تھیں۔(94) اکبر نے یقیناً اس لسانی اور غالباً ادبی تربیت سے فائدہ اٹھایا ہو گا تا کہ وہ قریبی درباری شاعروں کی گائی ہوئی شاعری کو اچھی طرح سمجھ سکے جیسے کہ درباری شاعر کوی گنگ اور عبدالرحیم خانِ خاناں۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں کے جو درباری سنگیت کاروں کے مجموعے اور مختلف شاعروں کے کلام کے مجموعے یا (اینتھالوجیز) ہیں ان میں خصوصیت کے ساتھ تان سین نمایاں دکھائی دیتا ہے جس سے اس کی شخصی صلاحیت و ذہانت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس خوبی کو ان ہند ایرانی لکھاریوں نے بھی دیکھا ہے جنہوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔(95)

یہ حقیقت کہ تان سین اکبر کا انتہائی ممدوح سنگیت کار تھا اور بطور دھرپد کی دھنوں کے مرتب اور اس کا مظاہرہ کرنے والے کے جانا مانا جاتا تھا بتاتی ہے کہ بادشاہ کو بھی سنگیت کے اس خصوصی فن سے کتنا لگاؤ تھا۔ سولہویں صدی میں وکل سنگیت کی اہم قسم دھرپد ہی تھا۔(96) اسی قسم میں غزلوں کو گایا جاتا تھا جن کو تخلیق کار شاعر واگے یا کارا برج بولی میں تخلیق کرتا تھا جو درباری گائیک بھی تھا یا ویشنو امندر سے وابستہ یا دونوں سے وابستہ تھا۔(97) اب تک زبانی

روایت اور کبھی کبھی مختلف شاعروں کی غزلوں کے مجموعوں (اینتھالوجیز) اور درباری سنگیت کاروں کے مجموعوں کے ذریعہ لوگوں تک یہ روایات پہنچ رہی ہیں۔قرونِ وسطیٰ کے ہندستان کی ثقافتی تاریخ کے لئے دھر پد گائیکی ایک گراں بہا ادبی ماخذ ہے۔(98)

ابوالفضل نے ہندستانی سنگیت کے جائزے میں دھر پد کو آگرہ، گوالیار اور بری علاقوں کا سب سے نمایاں وکل فارم قرار دیا ہے۔گوالیار کے راجا مان سنگھ تومر (1486-1516ء) کے دربار میں اس کی اصل کی تاریخ کے مختصر بیان کے بعد ابوالفضل اس طرح دھر پد کا بیان قلمبند کرتا ہے۔"گائیکی کا ایک اسلوب جو عام لوگوں کا پسندیدہ اور امراء و شرفاء کو مرغوب ہے۔دھر پد آہنگ کی چار سطروں پر مشتمل ہوتا ہے، ان کے لفظوں کی برابری اور قوافی ناگریز نہیں ہیں۔اس کا تاثراتی میدان عشق کا جادو اور دل عجیب وارداتی کیفیت ہوتا ہے۔(99)

لاتعداد غزلوں کے مرتبہ مجموعوں (پد ولی اور پد سنگرادھ) کے جو اواخر سولہویں صدی سے ملتی ہیں اور ویشنو اپو جا میں مشتمل ہیں ان میں دھر پد گانے، درباری سنگیت کار اور مواد شامل ہے شاعری کا بہت اہم ماخذ ہیں جن کو قرون وسطیٰ کی ثقافتی تاریخ مستند ادبی ماخذ مانا جانا چاہئے۔بعض اوقات دھر پد گانے نظری مجموعوں کی وضاحت کے لئے بھی استعمال ہوتے تھے جیسے اواخر سترہویں صدی کا سنگیت کے موضوع پر سنسکرت (متن بھاوابھٹ) جس کا تعلق بیکانیر کے راجا (1669ء) انوپ سنگھ کی سرپرستی سے تھا۔وہ اورنگ زیب کا ملازم تھا اور اسے فن وثقافت کے سرپرست کی حیثیت سے شہرت حاصل تھی۔(100) بھاوابھٹ میں اس نے بہت سے راگوں کی وضاحت کی ہے جن میں مقامی زبانوں کے سو سے زیادہ نمونے شامل ہیں جو اس نے شاید اپنے والد جنز دھن بھٹ سے لے کر جمع کئے تھے جو شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے درباری سنگیت کار تھے۔(101) درباری سطح پر مرتب کئے جانے والے یا ان کی سرپرستی میں لکھے جانے والے مجموعوں میں حکمراں کا نام بھی شامل ہوتا تھا جیسے کہ سلطان علاؤالدین، سلطان سلیم، شاہ بہادر، باز بہادر، راجا رام، اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب وغیرہ۔ان سب سے بہتر طور پر اکبر ہی کی شخصیت کو سربلند کیا ہے۔(102)

مقامی زبانوں میں مرتب کیا جانے والا سیکولر یا حمدیہ و مدحیہ کلام متعلقہ مصنف کے دستخط (بھنیتا یا چھاپ) بھی رکھتا تھا۔اسی طرح بہت سے دھر پد گانوں کے متون میں جو کہ عموماً بے

کا ایک سلسلہ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ 1760ء کے لگ بھگ کشن گڑھ کی مشہور خرد مصوری کے نمونوں کی تحریک کی دین ہے۔ جن کی نمائش نیشنل میوزیم دہلی میں ہوئی تھی۔ (83) کارل کھنڈ لاوالا اور موتی چندر کے لفظوں میں۔ ''منظر ایک خوبصورت علاقہ ہے جہاں پھولوں سے لدے ہوئے پیڑ ہیں اور ان میں کلیوں کا ہجوم ہے۔ دائیں سمت کی طرف ایک پتلا دبلا شخص ہری داس جس کا سر منڈا ہوا ہے وینا بجا رہا ہے۔ بائیں سمت میں تان سین ایرانی انداز میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کے پیچھے ہاتھ باندھے ہوئے اکبر کھڑا ہے۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ تصویر کا پورا ماحول تقدس میں ڈوبا ہوا ہے جو گرو اور اس کے چیلے کے موزوں فضا مہیا کرتا ہے تاکہ وہ اپنے شان دار سنگیت کا مظاہرہ کریں۔ تان سین جیسا کہ وہ نیشنل میوزیم کے پورٹریٹ میں نظر آتا ہے یہاں اس مقابلے میں جوان دکھائی دیتا ہے۔ (84)

کے کھنڈ والا اور ایم۔ چندر تان سین (90-1585ء) کے ایک پورے پورٹریٹ کا حوالہ دیتے ہیں جو نیشنل میوزیم دہلی میں ہے اس میں وہ بوڑھی عمر میں نظر آتا ہے لیکن چہرے اور جسم کے خدوخال پہلے ہی جیسے ہیں۔ (85) دوسری تصویروں کے مقابلے اس میں اکبر زیادہ بوڑھا دکھائی دیتا ہے۔ دیوناگری کی کھدائیاں تین شخصیات سوامی ہری داس، میاں تان سین اور پات ساہ (بادشاہ) اکبر کی صورتیں دکھاتی ہیں۔ یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ کشن گڑھ کے راجا ساونت سمھ کے زمانے تک رنگین مصوری معاصر تھی یعنی 1744ء سے لے کر 1757ء تک جب وہ سنیاس لے کر وندرابن چلا گیا تھا۔ ساونت سمھ نے مشہور رنگین مصور اور رنگ کار نہال چند کی سرپرستی کی تھی جو ''برگے آف لو'' کا بھی مصنف تھا اور جو نیشنل میوزیم دہلی میں محفوظ ہے۔

حال کی کتابوں میں وہی موضوع بار بار تصویر کیا گیا اور شائع کیا گیا ہے۔ جس خیال کی مقبولیت کی نشاندہی ہوتی ہے جس پر تحریروں اور زبانی روایت میں آراء ملتی ہیں۔ (86)

(ہ) سوانحی (مقدس ہستیوں کی) ماخذ کا طائرانہ جائزہ

اکبر کے زمانے سے تعلق رکھنے والے سنگیت اور سنگیت کاروں کے موضوع پر اور اس سے قریبی بعد کے زمانے کے ہند ایرانی بیانئے بادشاہ اور سوامی ہری داس کے درمیان کسی بھی

سمبندھ کا ذکر نہیں کرتے ہیں۔صرف زیادہ بعد کے دوسرے فرقوں کی تحریروں اور ادب میں تان سین کے ذریعہ سادھو سنگیت کار سے اکبر کے سمبندھ کے بارے میں جانکاری ملتی ہے (یہاں تان سین کا ذکر ایک سنگیت کار کی حیثیت سے ہوا ہے نہ کہ شاعر کی حیثیت سے جو اپنے شعروں کی دھنیں مرتب کرتا ہو)۔اس سمبندھ کی وضاحت بعض افسانوی قسم کی ضمیاتی شہادتوں کے ذریعہ کی گئی ہے۔تینوں کے مابین ناخوشگوار ملاقات کی وضاحت بادشاہوں کی سادھوؤں فقیروں اور درویشوں کے ساتھ بہت ہی روایتی قسم کی ان کے یہاں حاضری دینے سے ہوتی ہے۔یہاں حیرت زدہ کرنے والے سنگیت میں گائی جانے والی بعض صوفیانہ ابیات کے زیر تحریک جس کے تناظر کا اپنا ایک اسلوب ہوتا تھا عموماً مایوسی پر منتج ہوتی تھیں کیونکہ بادشاہوں کی شاہانہ حیثیت کی ان محفلوں میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔سادھو، درویش یا فقرا فیاضانہ شاہی انعامات کو نہ صرف ٹھکرا دیا کرتے تھے بلکہ اکثر غصے کا اظہار بھی کرتے تھے۔اس قسم کے رویئے کا مظاہرہ صرف مقدس ہستیاں ہی بادشاہ کے سامنے کر سکتی تھیں۔اس قسم کا یقین کیا جانے والا بیان جس صحت کا تعین کرنا ممکن نہیں ہے تاریخی شہادت کے لئے حوالہ نہیں بنایا جا سکتا ہے۔البتہ اس کی مدد سے ایک غیر روایتی قسم کے حکمراں کا ملا جلا امیج ضرور بنایا جا سکتا ہے۔(87)

2: برج شاعری کے سرپرست کی حیثیت اکبر کا کردار

کیا اکبر خود فارسی اور ہندی کا شاعر تھا؟ یا وہ ہندستان کی شعری مقامی زبانوں سے کافی حد تک مانوس تھا اور اسی لئے ہندستانی سنگیت کار جو کلام گاتے تھے بادشاہ اسے سمجھ کر واہ واہ کیا کرتا تھا؟ ابوالفضل کا بیان ہے کہ ''ہندی اور فارسی کلام سے عالم پناہ ایک جیسی تحریک حاصل کرتے ہیں اور شعری اسلوب و بیان کی خوبیوں کا تجزیہ ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ اس پر تنقید بھی کرتے ہیں۔شاعری کی بہت سی کتابوں میں سے وہ مولانا روم کی مثنوی معنوی کو برجستہ پڑھتے ہیں۔اس کے علاوہ حافظ کا صوفی دیوان بھی پڑھتے ہیں۔ان خوبیوں، ان کے حُسن اور ان کی نیک ترغیبات سے لطف حاصل کرتے ہیں۔ہندی زبان کے شاندار خیالات کا بھی وہ مطالعہ کرتے ہیں اور سازوں کے ساتھ سنتے ہیں۔(88)

فارسی کے مہان شاعروں کی اکبر جس اہتمام کے ساتھ سرپرستی کرتے ہیں کسے نہیں

بحر مرتب کی جانے والی شاعری ہے اور جس کو یا تو قلمبند کیا گیا ہے یا زبانی روایت کے مطابق رٹ کر یاد کرلیا جاتا تھا چوتھی سطر میں سنگیت شاعر کے دستخط شامل ہوتے ہیں۔اس کے باوجود دستخطوں کا ہونا اس بات کی سند نہیں ہوسکتی ہے کہ دستخط کرنے والا ہی مرتب یا مصنف ہو۔یہ وہ نکتہ ہے جس کو بیشتر دانشوروں نے جنہوں نے لاتعداد گانوں کے متون کو ایک مصنف یا مرتب سے منسوب کیا ہے نظر انداز کر دیا ہے۔(103) جمع کرنے کے عمل اور بڑی تعداد میں ایسے کلام کی ترتیب کاری میں جن پر تان سین کی چھاپ (مہر یا دستخط) ہے مجھے کئی ایسے متون ہاتھ آئے ہیں جن میں اکبر کی سرپرستی کا ذکر ہے یا اس کے حوالے نام کے ساتھ ہیں یا بعض میں اسی کو شاعر اور مرتب کہا گیا ہے۔(یعنی چھاپ اکبر کی ہے نہ کہ تان سین کی جیسا کہ پہلے اوپر زیر نظر آچکا ہے)۔(104) دوسرے دھرپد متون کی طرح جو بادشاہوں کی شان میں مرتب کئے گئے تھے یہ دونوں ادبی نقطہ نظر سے کچے ہیں۔

حرف آخر

ان تمام مختلف مواد کو رکھتے ہوئے ہم اکبر کی زندگی ایک رخ کی دوبارہ صورت گری کی کوشش کرسکتے ہیں لیکن اس میں اکبر کی داستان کا ایک چہرہ بھی ہے مستقبل کے لئے موجود ملتا ہے۔قرون وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ میں حکمراں حضرات جنہوں نے ادب عالیہ، عمارت سازی، مصوری اور فعال فن ہند ایرانی اور ہندستانی دونوں جیسے سُر سنگیت اور رقص وغیرہ کی ہمت افزائی کی تھی۔اکبر ان کا مثالی سرپرست کی حیثیت سے ہر موڑ پر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ جس کے نہ ختم ہونے والے تجسس نے مختلف سمتوں سے آنے والے کلاکاروں کو اپیل کرتا تھا۔ ان میں سے ذہین اور ماہر مرتب کرنے والے شعراء نے بہت سے مقامی زبانوں کے شعری کلام میں جو مرتبہ مجموعوں میں ملتا ہے اور ان کی ماہرانہ تخلیق کاری نمونہ ہے زندہ سنگیت کاروں کی یادوں کو کروٹ دے کر تازہ کرتا ہے۔ان میں بہت ہی نادر جن کی سنگیت میں غیر معمولی لیاقت تھی اور جن کا بادشاہ کے ساتھ بہت گہرا سمبندھ بھی تھا ہندستان کی ثقافتی تاریخ پر ان کے نقوش کو کوئی مٹا نہیں سکتا ہے۔

حوالہ جات

1- فرانسوئے نالینی ڈیل وو۔ انڈو پرشین لٹریچر آن آرٹ میوزک۔ سم ہسٹاریکل اینڈ ٹیکنیکل آسپکٹ۔ کان فلوئینس آف کلچر۔ فرنچ کان ٹری بیوشن ٹو انڈو پرشین اسٹڈیز۔ ایف۔ ڈیل وو ایڈیشن۔ دہلی 1994ء ص 130-93

2- اکبر نامہ فارسی ایڈیشن۔ آغا احمد علی اور مولوی عبدالرحیم تین جلدیں۔ کولکتا ایشیا سوسائٹی آف بنگال۔ ببلیوتھیکا انڈیکا 1886-1873ء ایچ۔ بیورج کا انگریزی ترجمہ۔ تین جلدیں کولکتا ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال 1939-1873 طبع ثانی دہلی 73-1972ء

3- منتخب التواریخ فارسی ایڈیشن۔ کبیر الدین احمد، احمد علی اور ڈبلو۔ این۔ لیز 3 جلدیں کولکتا ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ببلیوتھیکا انڈیکا 69-1864ء۔ انگریزی ترجمہ تین جلدیں۔ جلد اول جی۔ رینکنگ، جلد دوم ڈبلو۔ ایچ او اور جلد سوئم ٹی۔ ڈبلو ہیگ۔ کولکتا۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ ببلیوتھیکا انڈیکا 1925-1884ء

4- جہانگیر۔ تزک جہانگیری۔ فارسی ایڈیشن۔ سید احمد خان۔ علی گڑھ 1864ء تزک جہانگیری یا جہانگیر کی یادداشتوں کا انگریزی ترجمہ۔ اے۔ راجرز ریو جس کی درجہ بندی ایچ۔ بیورج نے کی۔ طبع ثانی دہلی 1978ء

5- عبدالحمید لاہوری۔ پادشاہ نامہ کا فارسی ایڈیشن۔ کبیر الدین احمد، عبدالرحیم اور این ڈبلو۔ لیز۔ 2 جلدیں۔ کولکتا ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ ببلیوتھیکا انڈیکا 72-1866ء

6- صمصام الدولہ شاہنواز۔ معاصر الامراء جس پر ان کے بیٹے نے نظر ثانی کر کے اس میں اضافہ کیا تھا یعنی عبدالحئی صارم اورنگ آبادی نے 3 جلدیں کولکتا ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ببلیوتھیکا انڈیکا 91-1888ء انگریزی ترجمہ ایچ۔ بیورج ایضاً 1911ء متن جلد 2۔ ص 135-134 جلد دوم ص 581

7- دیباچہ نویس کے نام کے بغیر ہزار درپد کے دیباچے کا تنقیدی ایڈیشن جو انڈیا آفس

لائبریری کے لندن میں ایم ایس ایس سے دستیاب ہے اور ببلیوتھیک نیشنل پیرس از شریف حسین قاسمی (قند پارسی دہلی جلد VIII سال 1994ء۔ مزید دیکھئے دیوناگری متن اور ہندی ترجمہ از پی۔ ایل۔ سرما۔ سنگیت ناٹک اکیڈمی۔ نائک بخشو دہلی 1972ء حصہ دوم ص 13-3

8- ہندستان میں اور باہر محفوظ بہت سے ایم۔ ایس۔ ایس۔ میں دیکھئے سیف خان فقیر اللہ راگ درپن۔ ایم۔ ایس۔ این 1937ء۔ انڈیا آفس لائبریری میں اس کی تاریخ کا اندراج 1196ھ/1782ء ہے جس کا ذکر ہرمان ایتھے کے کیٹلاگ آف پرشین مینو سکرپٹ ان دی لائبریری آف دی انڈیا آفس۔ آکسفورڈ 1903ء جلد 1۔ دیکھئے این 2017 ص 21-1120۔ راگ درپن کا ایک اہم ایم۔ ایس جس پر فقیر اللہ کی مہر ہے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ لائیڈن کا ذخیرہ فارسیا علوم این 41۔ فارسی ایڈیشن بھی دیکھئے از این۔ ایچ۔ انصاری اور شکلا۔ محمد عثمان قیس کا راگ درپن اور صوت الناقوس۔ پرشین ریسرچ جرنل۔ اسپیشل نمبر دہلی۔ شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی 1981ء

9- ابوالفضل۔ اکبر نامہ متن جلد 1 ص 24-23 ترجمہ۔ جلد 1 ص 125-69

10- ایضاً۔ جلد 1 ص 30 ترجمہ۔ جلد 1 ص 94

11- ایضاً۔ جلد 1 ص 21 ترجمہ۔ جلد 1 ص 63۔ اور اکبر نامہ کا مصور ایم۔ ایس۔ جو برٹش میوزیم میں ہے۔ او آر 12988۔ 20 بی، 21 اے اور 22 اے۔ ایک اور ایم۔ ایس۔ چیسٹر بیٹی لائبریری ڈبلن (انڈ۔ ایم۔ ایس نمبر 3)۔ دیکھئے تاریخ خاندانِ تیموریہ۔ ایم۔ ایس۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ 284 اے۔ اسے کھیم اور لال نے مصور کیا تھا۔ مزید دیکھئے گیتی سین، میوزک اینڈ میوزیکل انسٹرومینٹس ان دی پینٹنگز آف اکبر نامہ۔ کواٹرلی جرنل آف دی نیشنل سینٹر فار دی پرفارمنگ آرٹ جلد VIII نمبر 4 دسمبر 1979ء ص 7-1 خصوصاً ص 5-4

12- ساسانائدوں کے زمانے سے فوجی بینڈ (نوبا) شاہی حدود کا نمایاں ادارہ تھا۔ ایچ۔ جی۔ فارمرا۔ ہسٹری آف عربین میوزک ٹو دی 13 تھ سنچری 1929ء لندن۔ طبع دوم 1973ء ص 8-206 اور اسی مصنف کی طبل خانہ۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔

لیڈن، ای۔ جے۔ برل۔ 1938ء ص 22-217

13- ابوالفضل۔ آئین اکبری فارسی ایڈیشن ایچ بلوچ مان کا دو جلدیں کولکتا ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ ببلیوتھیکا انڈیکا 1877ء انگریزی ترجمہ تین جلدیں۔ جلد 1 بلوچ مان، جلد 2 اور 3 جیرٹ کولکتا ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ببلیوتھیکا انڈیکا۔ 77-1867ء طبع ثانی دہلی 78-1977ء متن جلد اول ص 47-45 ترجمہ جلد اول ص 54-52

14- Ibid., Text, Vol.I, p.47; Tr., Vol.I, p.54. Henceforth Persian terms in square brackets have been reintroduced from the edn. cit. by the present author.

15- ایضاً۔ متن جلد 1 ص 47۔ ترجمہ جلد 1 ص 53

16- جی۔ سین۔ اور اینڈریو۔ جے۔ گریک۔ دربار اکبری کے آلات موسیقی جرنل آف ایشین کلچر۔ جلد IV موسم بہار۔ 1980ء ص 177-154 اور انڈین میوزک اِن دی 16 تھ سنچری۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا لاس اینجلیز کی پی ایچ ڈی تھیسس 1988ء (غیر مطبوعہ) باب VI۔ ایس۔ پی۔ ورما۔ آرٹ اینڈ میٹریل کلچر اِن دی پینٹنگز آف اکبرس کورٹ۔ دہلی 1978ء موسیقی کے آلات پر باب VI ص 70-60۔ اس مصنف کی کتاب دی لائف آف اکبر ایز السٹریٹیڈ ان کان ٹمپریری مِنی ایچرس۔ ایکو یبیشن کیٹلاگ۔ سمینار "اکبر اینڈ ہز ایج" علی گڑھ 1992ء

17- ابوالفضل۔ آئین اکبری۔ متن۔ جلد 2 ص 144۔ ترجمہ جلد 3 ص 273

18- See Abul' Fazl, AN, Text, Vol.II, p.181; Tr., Vol.II, p.279.

19- دیکھیں ایم ایس برٹش لائبریری۔ او آر 1996ء مزید دیکھیں پی۔ ایم۔ جوشی اسد بیگس مشن ٹو بیجاپور 04-1603ء مہامہو پادھیائے پروفیسر ڈی۔ وی۔ پوت دار 60 فرسٹ برتھ ڈے کمیموریشن والوم مرتبہ سریندر ناتھ سین، پونہ ناشر ڈی کے۔ ساتھے 1950ء ص 196-184

20- دیکھیں اسد بیگ۔ ایم ایس برٹش لائبریری۔ او آر 1996۔ 16 اے۔ پی۔ ایم۔ جوشی۔ ص 193۔ نظیر احمد۔ کتاب نورس از عادل شاہ ثانی۔ دہلی 1956ء ص 49-48

21- آلے کے بیان کے لئے اور جس انداز سے اسے استعمال کیا جاتا تھا دیکھیں بدایونی۔

منتخب التواریخ متن جلد دوم ص 91-290 ترجمہ جلد 2 ص 299

22- دیکھیں ابوالفضل آئین اکبری۔ متن جلد 2 ص 144-134 ترجمہ جلد III ص 273-260

23- ایضاً۔ جلد 2۔ ص 142-134 ترجمہ جلد III ص 271-260

24- ایضاً۔ متن جلد 2 ص 143-142 ترجمہ جلد 3 ص 273-271

25- ایضاً۔ متن جلد II ص 144 ترجمہ جلد 3 ص 273

26- دیکھیں، سم گیتا رتنا کار مصنفہ سارنگا دیو جس میں کالی ناتھ کا کالاینڈھی اور سمہا بھوپال ایڈیشن کا سم گیتا سدھار کار بھی شامل ہے۔ مرتب ایس۔ سبرا ہمائین ساستری چار جلدیں۔ مدراس 53-1943ء۔ یحییٰ الکابلی کی ''لہجات سکندر شاہی'' کے لئے دیکھیں۔ سی۔ اے۔ اسٹوری۔ پرشین لٹریچر: اے بائیو ببلیوگرافیکل سروے جلد دوم حصہ 3 جی آرٹس اینڈ کرافٹس لیڈن۔ ای۔ جے۔ برل 1977ء۔ دیکھیں این 705 ص 414۔ مزید دیکھیں این۔ احمد۔ دی لہجات سکندر شاہی: اے یونیک بک آن انڈین میوزک آف دی ٹائم آف سکندر لودھی (1517-1489ء)۔ اسلامک کلچر۔ جلد XXVIII این 3 جولائی 1954ء ص 417-410

27- سی۔ اے۔ اسٹوری۔ جلد 2 حصہ 3 جی آرٹس اینڈ کریفٹس۔ دیکھیں نمبر این 707 ص 15-414

28- سی۔ ریو۔ سپلیمنٹ ٹو دی کیٹلاگ آف دی پرشین مینوسکرپٹس ان دی برٹش میوزیم۔ لندن 1895ء دیکھیں این 162 (4) ایم۔ ایس 75-1073ھ/1664-1662ء

29- سی اے اسٹوری، جلد 2 حصہ 3 جی آرٹس اینڈ کریفٹس۔ دیکھیں این 708 ص 415 جو 1077ھ/1666ء کے ایم ایس کا حوالہ دیتا ہے اور بودلین لائبریری میں محفوظ ہے۔ کیٹلاگ آف دی پرشین، ترکش، ہندستانی اینڈ پشتو مینوسکرپٹس ان بودلین لائبریری۔ آکسفورڈ 1889 حصہ 1 دیکھیں این 1845 ص 1063

30- ابوالفضل۔ آئین اکبری متن جلد 1 ص 263 ترجمہ جلد 1 ص 263 ترجمہ جلد 1 ص 681

31- ایضاً۔ متن جلد 1 ص 64-263 ترجمہ (1) ص 82-680

32- ایضاً۔ متن جلد 1 ص 263 ترجمہ جلد 1 ص 681

33- ایضاً۔ متن جلد 1 ص 64-263 ترجمہ جلد 1 ص 82-681

34- فقیر اللہ۔ راگ درپن ص 34

35- ابوالفضل۔ آئین اکبری۔ متن جلد اول ص 263 ترجمہ جلد اول ص 681۔ تان سین پر کتابوں پر کتابیاتی حوالوں اور تبصروں پر میرے ترجمے کے لئے دیکھیں ایف۔ ڈیلوائے "تان سین ایٹ لا ٹریڈیشن ڈیس چانٹس دھرپد۔ این لینگو برج دو XVI ای سیکل اے نوس جاورس۔ ڈی لٹ کا مقابلہ سوربون یونیورسٹی پیرس 1990ء پاسم۔ انگریزی میں: تان سین اینڈ دی ٹریڈیشن آف دھرپد سانگس اِن برج لینگوئج فرام دی 16 تھ سنچری ٹو دی پریذینٹ ڈے۔ دھرپد اینول جلد VIII ورنارسی 1993ء ص 44-37

36- دیکھیں مادھو۔ "ویرا بھانو دے کا دیا" کے۔ کے۔ لینے اور ایچ ایس اپدھیائے کا ایڈیشن مع ہیرانند شاشتری کا تنقیدی تجزیہ۔ ریوا وریوا دربار پر 1938ء مزید دیکھیں پی۔ کے۔ گوڈے "اے کان ٹمپریری سنسکرت ٹری بیوٹ ٹو دی میوزیکل ٹیلنٹس آف تان سین دی گریٹسٹ میوزیشن آف اکبرس کورٹ اینڈ اٹس ہسٹاریکل پرسپیکٹیو۔ پی۔ کے۔ گوڈے۔ اسٹڈیز اِن انڈین لٹریری ہسٹری جلد III پونہ۔ 1956ء ص 95-188

37- دیکھیں مادھو، بیت 26 سنسکرت متن اور انگریزی متن جو پی۔ کے۔ گوڈے کی کتاب میں ص 91-190 میں ہے۔ یہ میرا ترجمہ ہے۔

38- ایضاً۔ ابیات 31-27

39- ابوالفضل۔ آئین اکبری اے۔ این متن جلد 2 ص 181 ترجمہ جلد II ص 280-279

40- بدایونی۔ متن جلد 2 ص 335 ترجمہ جلد 2 ص 345 موضوع راجا رام چندر کی ہار اور 1563ء میں اطاعت شاہی کا اقرار۔ مزید دیکھیں ابوالفضل اے۔ این۔ متن جلد اول ص 83-181 ترجمہ جلد اول ص 83-281

41- دیکھیں عبدالحمید لاہوری۔ پادشاہ نامہ جلد 1 ص 7

42- دیکھیں عنایت خان۔ رسالہ ذکر معنیان ہندستان سید علی حیدر کا فارسی ایڈیشن (ایم۔ ایس۔ این 1735-1734۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ 1961ء ص 13-12 اور

ایس۔اے۔حیدر کے مرتبہ متن کا تعارف۔

43- دیکھیں صمصام الدولہ شاہ نواز خان۔ معاصر الامراء۔متن جلد دوم ص 134-138 ترجمہ جلد دوم ص 581-584

44- دیکھیں انفراص 41-46

45- دیکھیں ہری ہرنواس دیویدی تان سین۔ جیوانی (جیون) ویا کتیوا نتھا کرنیوا۔ گوالیار 1986ء ص 41۔اورنجی رابطہ دسمبر 1985ء

46- دیکھیں بدایونی۔متن جلد دوم ص 265 ترجمہ جلد دوم ص 272-73

47- دیکھیں ابوالفضل۔اے۔این۔متن جلد سوئم ص 536-37۔ترجمہ جلد III ص 6-10

48- ایضاً۔متن جلد III ص 537 ترجمہ جلد III ص 817

49- بدایونی۔متن جلد III ص 4-6 ترجمہ جلد III ص 6-10۔مزید دیکھیں آر۔ناتھ۔دی ٹامب آف شیخ محمد غوث ایٹ گوالیار۔ اسلامک آرکی ٹیکچر اینڈ کلچر اِن انڈیا۔ دہلی 1982ء ص 79-86

50- دیکھیں مرزا خان۔تحفتہ الہند۔این۔ایچ۔انصاری کا ایڈیشن۔تہران 1976ء خصوصاً موسیقی کے عنوان پر پانچواں باب (در علم سنگیت یعنی علم موسیقی) ص 322-456

51- ایضاً۔ص 361

52- دیکھیں جیمس فاربس۔اورینٹل میمائیرز سیلیکٹیڈ فرام اے سیریز آف لیٹرز رٹن ڈیورنگ سیوینٹین ایرز ریزی ڈینس ان انڈیا۔چار جلدیں۔لندن 1831ء۔دوسرا نظر ثانی کیا گیا ایڈیشن، مع ڈبلو۔ایچ۔صدیقی کے نئے تعارف کے۔دہلی 1988ء جلد چار ص 31-33

53- See supra, note 35. On Tansen as a poet see also Suniti Kumar Chatterji, 'Tansen as a Poet', Acharya Sri P.C. Ray Commemoration Volume, Calcutta, 1932, pp.45-65; see also F. Delvoye, 'The Thematic Range of Dhrupad Songs attributed to Tansen, Foremost Court-Musician of the Mughal Emperor Akbar', Studies in

South Asian Devotional Literature, Research Papers 1988-91 presented at the Fifth Conference on Devotional Literature in New Indo-Aryan Languages, held at Paris-EFEO, 9-12 July 1991, eds., Alan W. Entwistle and Francoise Mallison, New Delhi, and Paris, 1994, pp.406-27.

54- دیکھیں ایف۔ ڈیل وے۔ یس چانٹس دھر پدر این لینگو براج دیس پوئینٹس میوزیشینز ڈی انڈے موغول۔ لٹریچرس میڈیویلز ڈی۔I انڈے دونارد کا اٹری بیوشن دی چارلوٹ واودے ودلے اے ڈے سس ایلیوس، ایڈیشن پیرس 1991ء ص 185-139

55- دیکھیں صمصام الدولہ شاہ نواز خان۔ معاصر الامراء۔ متن جلد اول ص 391-387 ترجمہ جلد اول ص 396-394

56- الن۔ ڈبلیو۔ اینٹ وِسل۔ براج۔ سینٹر آف کرشنا پلگر یمج۔ گرونیکن 1985ء ص 62-157 مزید دیکھیں ڈنڈا یالو گپتا اناچھاپ اور ولبھ۔ سمپرادے۔ ایک گاوے سنات ماک دو جلدیں۔ دوسرا ایڈیشن پریاگ 1970ء جلد 1 ص 32

57- دیکھیں چارکورٹ وادے وے۔ لاسٹ اینڈ فاونڈ۔ انڈو ایرانین جرنل۔ این 18۔ 1976ء ص 213-195

58- اے۔ ڈبلو۔ اینٹ وِسل۔ ص 43-141 اور 54-151 اور پاسم۔ مزید دیکھیں رچرڈ برزدی بھگتی سیکٹ آف ولبھ آچاریہ۔ فریدآباد 1976ء طبع ثانی دہلی 1992ء

59- کوراسی ویس ناون کی ورتا۔ ایم۔ ایس سے 1695۔ مرتب دوارکاداس پارکھ طبع ثانی۔ متھرا۔ شری بجرنگ پستا کلے، 1970ء دیکھیں دوسو باون وارتا کے دو ایڈیشن مرتب براج بھوسن سرما اور دوارکا داس پارکھ۔ 3 جلدیں۔ کنکرولی 3-1951 اور ازاین ڈی سرما گاور۔ طبع ثانی متھرا۔ 1972ء

60- دیکھیں وادودے ولے، پیسٹوریلز پرساور داس۔ پیرس۔ این۔ آر۔ ایف۔ گیلی مارڈ 1971ء۔ کینتھ۔ ای۔ برایئنٹ۔ پوئمنر ٹو دی چائلڈ گوڈ۔ برکلے اور لاس اینجلس، 1978ء۔ VIII ص 6-1۔ جان اسٹریٹن ہاولے، دی سیکٹیرین لوجک آف دی سور

داس کی وارتا، بھگتی اِن کرنٹ ریسرچ 82-1979ء۔ ایم۔ تحصیل ہورسٹ۔ مان ایڈیشن۔ برلن 1983ء ص 69-157۔ اسی مصنف کی کتاب۔ سورداس، پوئیٹ، سنگر، سینٹ۔ سیٹل 1984ء اور دہلی 1984ء

61- دیکھیں کوراسی ویس ناون کی وارتا میں سورداس کی وارتا این 81 ص 41-400 خصوصاً ص 19-417 اور انگریزی ترجمہ آر۔ پارز ص 39-105 خصوصاً ص 23-121

62- دیکھیں ایضاً ص 15-414۔ ترجمہ ایضاً ص 21-120، اس نے یہ سب جانو بھگت کے لچھن پد کا جو راگ لغت میں ہے ترجمہ نہیں دیا ہے۔

63- دیکھیں ایضاً ص 417۔ ترجمہ ایضاً ص 121۔ نہیں رہیومن میں تھورا پد کا۔

64- دیکھیں ایضاً ص 90-476۔ ترجمہ ص 206-165

65- ایضاً۔

66- ایضاً۔

67- دیکھیں گوند سوامی سنودیا برہمن کی وارتا جو دو سو باون ویس ناون کی وارتا میں ہے۔ این۔ ڈی۔ سرما گورمتھرا کا ایڈیشن۔ ص 11-1 خصوصاً پر اسمگ 5 ص 9-8

68- See Do sau bavan vaisnavan ki varta, op.cit. (edn. B. Sarma and D. Parikh, Kankroli), Vol.III, pp.356ff; Astachap ki varta, edition (based on two MSS dated 1640 and 1695) by K.M. Sastri, Kankroli, 1952, pp.525-92.

69- است چھاپ کی وارتا ص 592-587

70- سوامی ہری داس سے متعلق بہت سی مطبوعات میں سے دیکھیں رچرڈ ڈیل ہینز۔ سوامی ہری داس اینڈ دی ہری داسی سمپرادے۔ ساوتھ ایشین ریجنل اسٹڈیز پینائل وانیا یونیورسٹی فلاڈلفیا پی ایچ ڈی مقالہ 1974ء۔ گوپال دت۔ سوامی ہری داس کا سمپرادے اور اس کا وانی ساہتیا۔ دہلی 1977ء اور چیل بہاری اپادھیائے۔ ہری داس تتواجح ناسا اتہاسک ساک سویم کے آدھار پر۔ ورندابن منی پارا 1983ء

71- ناگری داس اور اس کے کاموں کے لئے دیکھیں آر۔ ایس۔ میک گریگر۔ ہندی لٹریچر فرام اٹس بگننگ ٹو دی 19 تھ سنچری۔ وزبادن 1984ء ص 59-158 اور 210

(پد پر اسمگ مالا کا بیان) اور اے۔ڈبلو۔اینٹ وسل ص 71-270 اور آر۔ڈی۔ہینز ص 108-102

72- پد پر اسمگ مالا منسوب ناگری داس۔مرتبہ کے۔گپتا۔ناگری داس گرنتھاولی 2 جلدیں۔ ورناسی (بنارس) 1965ء۔

73- کسور داس اور نجمت سدھانت کے لئے دیکھیں آر۔ایس۔میک گریگر ص 165 اور اے۔ڈبلو۔اینٹ وسل۔ص 156 اور 194 نجمت سدھانت کوتی استھان نے شائع کیا تھا (سوامی ہری داس کی جماعت) چار جلدیں وندابن 15-1911ء

74- دیکھیں نجمت سدھانت۔مدھیہ کھانڈ۔ص 91-89 متن کا اختصار بی۔اپادھیائے کے یہاں ملتا ہے ص 14-13۔یہ میرا اختصار ہے۔

75- اس داستان یا لیجنڈ کا ایک اور بیان جو مختلف ہے بغیر کسی حوالے کے کے۔خاندلا والا اور ایم۔چند کے ایڈیشن میں ملتا ہے۔اے۔کان ٹمپریری پورٹریٹ آف تان سین۔للت کال نمبر 1 اور 2 (اپریل 1955ء۔مارچ 1956ء) ص 15

76- نجمت سدھانس مادھے کھانڈ ص 99-96

77- ایف۔ایس۔گروز متھرا، اے ڈسٹرکٹ میمائیر 1882ء طبع ثانی تیسرا ریو ایڈیشن 1883ء احمد آباد 1978ء ص 220-219

78- آر۔ڈی۔ہینز ص 63-55

79- دیکھیں پنالال گوسوامی نادبنود گرامتھ۔دہلی 1896ء

80- ایضاً۔ص 50-43

81- ایک مثال جس میں نادبندو گرامتھ کا ذکر ہے سم گیت۔کاویا سدھ کی پہلی جلد ہے (احمد آباد 1937ء) جو کہ گجراتی زبان میں وکل موسیقی پر ہے۔مصنفین سی۔نائیک اور آر سی نائیک نے سوامی ہری داس کی مختصر سوانح دی ہے ص 74-73 جس کے بعد تان سین ہے ص 77-74۔دونوں میں وہ پنالال گوسوامی کی نادبنود گرامتھ کا نام کے ساتھ حوالہ دیتے ہیں۔

82- آ کاریہ (اچاریہ) سری گوپال گوسوامی۔راسخ۔ساکھی۔سمیرادیا کاریا، سری سوامی ہری داس۔انڈین فلاسفی اینڈ کلچر کواٹرلی جرنل آف دی انسٹیٹیوٹ آف اورینٹل فلاسفی۔

ورندابن جلد XIX نمبر 3 ستمبر 1974ء ص 183-194

83- تصویر رنگ وار این 61 / 14-48 اکثر تحریروں میں دی جاتی ہے۔ دیکھیں کے۔کھنڈل والا اور ایم۔چندر پلیٹ 1 تصویر 1۔ جس کا ص 20 پر بیان ہوا ہے۔ اور دیکھیں جی۔دتا۔ص 108-104۔ اور کے چیتنا۔ اے ہسٹری آف انڈین پینٹنگ۔ مینوسکرپٹ۔ مغل اینڈ دکنی ٹریڈیشن دہلی 1979 این 47 (گوکہ مصنف اس کا زمانہ اکبر تک لے جاتا ہے)۔ مزید دیکھیں ایف۔ برنل۔ دی سپلیمنٹ آف انڈین مینی ایچرس۔ زبانی ایڈیشن۔ بولوجین اور دہلی پلیٹ 55 (دو صفحوں میں) گوکہ مصنف کرداروں کا تجزیہ نہیں کرتا ہے اور ص 151 پر منظر کو اس طرح بیان کرتا ہے ''شہزادے کا موسیقی کا سبق۔'' مگر اکبر کی تصویر کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ آر اے آنند کر سنا سورسمرات۔ تان سین کی ساہی ہم۔ دھرپد اینول جلد III 1988ء ص 5-3۔ (انگریزی اختصار ص 8-7 اور 9)۔ سی بی گپتا۔ اے نوٹ آن دی پریزرویشن آف مینی ایچر پینٹنگز آف ورنداون ریسرچ انسٹیٹیوٹ۔ جرنل آف دی ورنداون ریسرچ انسٹیٹیوٹ جلد 2 ستمبر 1977ء ص 57-61

84- دیکھیں کے۔کھنڈال والا اور ایم۔ چندر ص 20 سوامی ہری داس نے جو ساز بجایا تھا وینا نہیں تھا بلکہ تمپورا (تمبورا) تھا۔

85- دیکھیں رنگین تصاویر این 50 28 / 14 نیشنل میوزیم دہلی میں جن کا بیان اول الذکر دونوں مرتبین نے کیا ہے ص 16 اور رنگ میں بلیٹ اے۔

86- دوسری رنگین تصویروں کے حوالے سے دیکھئے۔ جو اسی خیال پر ہیں اور ڈیلوے کی تھسس میں ص 229-227 پر شامل ہیں۔

87- ویشنوا فرقے کی روایت میں تان سین کے مطالعہ کی تفصیلی اور تجزیاتی کوشش موجودہ مصنف کر رہا ہے اور اس پر کام مکمل ہو رہا ہے۔

88- ابوالفضل اے این۔ متن جلد 1 ص 271۔ ترجمہ جلد 1 ص 520

89- ایم۔ عبدالغنی اے ہسٹری آف پرشین لینگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ ودھ اے بریف سروے آف دی گروتھ آف اردو لینگویج۔ الہ آباد۔ 1930ء طبع ثانی ویسٹ میڈ۔ 1972ء۔ حصہ III۔

90- آر۔ایس۔میک گریگر۔ص 122-118۔مزید دیکھیں سریو پرشاد اگروال اکبری دربار کے ہندی کوی۔لکھنو 1950ء۔

91- مزید کتابیاتی حوالوں کے لئے مثال کے لئے دیکھیں۔میک گریگر۔ص 21-120

92- پریم لت سرما دھرپت کے پدوں میں چھاپ اور اس سے ادبھوت سماسیا ایم۔دھرپد اینول۔ورناری جلد II 1987ء ص 98-84 اور انگریزی میں اختصار "سگنیچر ان دھرپد سانگ ٹیکسٹس اینڈ دی پرابلم ارائیزنگ دیرفارم ص 101-99۔دیکھیں ایف۔ڈیل وے، پرابلمز اینڈ پراسپکٹس آف کریٹیکل اسٹڈیز آف سرکل ٹیکسٹس۔سم کیت مم انوسند دھان کی سم سیا ایم اور کتمرا۔پرابلمز اینڈ ایریاز آف ریسرچ اِن میوزک ایس۔چودھری ایڈیشن۔اجمیر 1988ء ص 180-149 خصوصاً ص 63-161

93- جہانگیر۔تزک جہانگیری ترجمہ حصہ اول ص 150

94- سینتی کمار چٹرجی۔انڈو آرین اینڈ ہندی۔کولکتا۔فرما۔کے۔ایل مکھوپادھیائے۔دوسرا اضافہ کیا گیا ریوایڈیشن 1960ء ص 200 اگر کسی ہند آریائی زبان کو بادشاہی زبان کہا جاسکتا ہے تو وہ اتری ہندستان کی برج بھاکا (بھاشا) تھی۔

95- ایف۔ڈیل وے۔ڈی لٹ تھسس پاسم۔

96- ایضاً۔دیکھیں کے۔سی۔برہسپتی دھروا پداور اس کا دکاس۔پٹنہ 1976ء اور اندورام سریواستو۔دھرپد۔اے سٹڈی آف اٹس اوریجن۔ہسٹاریکل ڈویلپمنٹ۔اسٹرکچر اینڈ پریذنٹ اسٹیٹ دہلی 1980ء دھرپد پر کتابیاتی حوالوں کے لئے۔ایف ڈیل وے۔ ببلیوگرافی آن دھرپد۔ڈی۔اے۔جلد اول 1986ء ص 115-95 ڈی اے جلد 2، 1987ء۔ص 21-119۔ڈی۔اے۔III 1988ء ص 102-98۔ڈی۔اے۔IV 1989ء ص 07-105۔ڈی۔اے۔V 1990ء ص 20-117۔ڈی۔اے VI 1991ء ص 33-30۔ڈی اے۔VII 1992ء ص 15-112۔ڈی۔اے۔VIII۔ 1993ء ص 90-86۔ڈی۔اے۔IX 1994ء ص 60-56۔اور ایف۔ڈیل وے (فرنچ زبان میں کتاب) ص 41-140 اور 85-180

97- چمپا کلی چھابلی داس نائیک۔است چھاپیہ بھگتی سم گیت (حویلی سم گیت) اد بھاؤ اور وکاس احمد آباد جلد 1، 1983ء اور جلد 2، 1985ء۔ویشوا سنگیت کی روایت اور اکبری

دربار کے سنگیت کاروں کے مابین قائم اشتراک کے علاوہ درگاہوں کی صوفی سنگیت اور درباری سنگیت کے مابین تعلق کی نشاندہی میر عبدالوحید بلگرامی کی حقائق ہندی 1566ء میں ہوئی ہے۔ ایڈیشن اور ترجمہ ہندی میں ایس۔ایس۔اے۔رضوی کا ہے۔ورناسی 1957ء۔ ہندایرانی متون میں ادھرادھر بکھری ہوئی معلومات ملتی ہیں جن پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔(98)

98- ایف۔ڈیل۔وے۔لاٹرانسمیشن ڈیس ریپرٹوریز ڈانس لامیوز کے وکیل ہندستانی ایس۔ایکزیمپل ڈیس چانٹس دھرپد۔پوروسارتھ پیرس (آنے والی ہے)۔

99- ابوالفضل۔آئین اکبری۔متن جلدII ص138 ترجمہ جلدIII ص66-265۔میرا تناظر۔

100- مہاراجا انوپ سنگھ کے لئے دیکھیں۔ پی۔ڈبلو۔ پاولٹ۔گزیٹیرز آف دی بیکانیر اسٹیٹ 1874ء طبع ثانی بیکانیر 1908ء دوسری طبع ثانی 1932ء ص45-38۔گوری شنکر ہیراچند اوجھا۔دی ہسٹری آف راج پوتانا جلد 5 حصہ اول۔ہسٹری آف بیکانیر اسٹیٹ۔اجمیر 1939ء ص91-253۔

دیناناتھ کھتری۔بیکانیر راج کا سنسکرتا اتہاس۔بیکانیر 1978ء ص52-47

ہیرمن گوئیز۔دی آرٹ اینڈ آرکیٹیکچر آف بیکانیر اسٹیٹ۔آکسفورڈ۔ برونوکیسیر۔ بیکانیر اسٹیٹ سرکار رائیل انڈیا اور پاکستان سوسائٹی کے لئے 1950ء پاسم۔

101- بھاؤ بھٹ کے لئے دیکھیں۔ادھیناتھ اپادھیائے۔ بھاؤ بھٹ کے گرنتھ اور ان میم (میں) دھرواپد۔ڈی۔اے۔جلد 1، 1986ء ص92-69۔مزید دیکھیں۔جی۔ایچ اوجھا۔ص285 اور ایچ۔گوئیز ص47

102- دیکھیں اکبر سے منسوب دھرپد کے کچھ نمونے جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے متن برج میں دیئے گئے ہیں اور ترجمہ فرنچ میں ہے۔ایف۔ڈیل وے کی کتاب ''لیس چانٹس دھرپد این لینگوے براج'' ص79-176

103- دیکھیں سوپرا نوٹ 92

104- مثلاً دیکھیں معاصر الامراء میں تبصرے۔متن جلدII۔ص138-134 ترجمہ جلدII۔ ص584-581

❁❁❁❁❁

ہندستان کا ادراک:
اکبر اور ابوالفضل کے حوالوں سے

ایم۔اطہر علی

قبل از ایک صدی سے بھی زیادہ کے عرصے سے بطور خیال ہندستان کی حیثیت بار بار زیر بحث رہی ہے۔کیا یہ وقعتی بس جغرافیائی اظہار ہے، بلند و بالا پہاڑوں کے سلسلے کا ایک نیم (آدھا) دائرہ جواتر میں ہندستان کی حفاظتی فصیلیں ہیں اور باقی تمام حصے میں سمندر ہندستان سے گلے ملتا ہے جو دکن میں ایک الٹے تکون جیسا نظر آتا ہے؟ اس کی حدود نے برطانوی ہندستان کے سامراج کے لئے مثالی سائنسی سرحدیں بنادی ہیں اور ان کے گھر کے اندر کے دیس پر ان کے پُرعزم تسلّط کو ممکن بنایا ہے جس کے لئے راج شعوری طور پر اپنی وراثت ہونے کا دعوے دار ہے۔کیا علاوہ اس کے اب بھی سیاسی سہولت کے لئے ہندستان کے علاقے کے تصور سے بالاتر کوئی چیز تھی۔کیا کچھ تھا جس پر برطانوی سامراج کے ترجمانوں نے خود کو دوہری سوچ سے جکڑ لیا۔ہندستان کثرت میں وحدت کا مقام ہے جس پر وی۔اے۔اسمتھ تو زور دے گا لیکن سائمن کمیشن اس کی تردید کرے گا۔(2) زیادہ قریبی زمانے میں غالباً جیسے کہ الکزنڈر کے کام ''امیجنڈ کمیونیٹیز'' (3) سے جزوی طور پر متاثر ہو کر نچلے طبقے یا بعد جدید حلقوں میں ہندستانی قوم کے تصور پر تنقید کی گئی ہے۔جیسا کہ پروفیسر پارتھا چٹرجی ہمیں بتاتے ہیں کہ ہندستان کی قومی تاریخ کے تصور کی اکائیت ہندستانیوں کو مزید تقسیم کرنے کی ایک کوشش۔(4) گو کہ ہم تعجب کے ساتھ یہ سوچیں گے کہ کس مقام سے ہندستانیوں نے جنم لیا تھا

اگر کوئی ہندستان تھا ہی نہیں۔

اس بارے میں دو آرا کا کوئی امکان نہیں ہے اس لئے کہ ہندستان کے تصور کی تاریخ کے مطالعے کا معاملہ بہت سخت ہے ان کے لئے بھی جو اس کی موجود اور ماضی کی حقیقت پر زور دیتے ہیں جیسا کہ قومی تحریک کے ترجمانوں کا موقف ہے اور ان کے لئے بھی جو لارڈ سائمن کی انگلی پکڑ کر چلے اور اس حقیقت سے انکار کیا۔ اس موضوع کے مطالعہ کے لئے یہ مقالہ اکبر اور اس کے صلاح کاروں (نورتنوں) جو کہ یقیناً اعلیٰ مراعات یافتہ امراء کی صف میں تھے کے ذہنوں میں موجود ہندستان کے تصور کا احاطہ کرتا ہے۔

اس قسم کے مطالعہ کے لئے ایک سوچ کار کو اس عرب ایرانی روایت سے معاملہ کرنا ہوگا جس سے ہندستان کے اکبر پس منظر وابستہ تھا۔ ہندستان کے دو نام تھے اول ہند جس کا ماخذ قدیم لفظ ہندو ہے (ویدک سندھو کا اوستائی مترادف)۔ اس کے بعد یونانیوں نے بھی اسے ہند ہی کہا تھا جب کہ اواخر ایرانی نام تھا ہندستان۔ ایران میں علاقوں کے نام کے ساتھ ''ستان'' کے لاحقے کو جوڑنے کا رجحان ہوا کرتا تھا۔ (نخارستان، بجستان اور گرجستان وغیرہ)۔

باہر سے آنے والوں کی حیثیت میں ایرانی پچھمی دریائے سندھ کی تمام علاقائی حدود کو ہندستان میں شمار کرتے تھے۔ گیارہویں صدی میں سائنس داں ابوریحان البیرونی نے اپنی کتاب ''کتاب الہند'' (1035ء) میں ہندستان کی مختصر مگر جامع جغرافیائی تعریف قلمبند کی تھی۔ دکن میں ہندستان کے چاروں طرف سمندر ہے جبکہ دوسری تمام تین سمتوں میں بلند و بالا پہاڑی سلسلے ہیں جن کی چوٹیوں پر سے پگھل کر نیچے آنے والا پانی ہندستان کو سیراب کرتا ہے۔ (5) سنسکرت زبان سیکھنے اور مقدس سنسکرت صحیفوں کے مطالعہ کے بعد البیرونی کو بھی ان مشکل مسائل کا ادراک ہوا جو ہندستان کے تصور کی خاکہ سازی میں رکاوٹ بنتے تھے۔ ہماونت (ہمالہ) سے دکن کی سمت میں پھیلی ہوئی آبادی کو بھارت ورش کہا جاتا تھا جو جمبودوپا کا مرکز تھا۔ البیرونی کہتا ہے کہ ایک مفروضہ یہ رائج تھا کہ بھارت ورش میں تمام ملک کی آبادی شامل تھی جبکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ وہ حصے جن کے نام دیئے گئے ہیں اور ان کا بیان ہوا ہے ہند یا الہند میں شامل تھے۔ (6) البیرونی کے مطابق اس ملک کے باسی ہندوان کا ایک پہچان میں آنے والا اعلیٰ کلچر تھا۔ جن کی زبان سنسکرت تھی۔ مصنف نے اس زبان کو جاننے سمجھنے اور

پڑھنے کی کوشش کی تھی۔اس نے یہ مطالعہ کسی تعصب کے بغیر تنقیدی تناظر میں کیا تھا۔اس لئے مصنف کو ایک پائیدار اور منظم ثقافتی ایکتا دکھائی دی جس کا انعکاس ہندوؤں کی طرف سے فخر کی صورت میں ہوتا تھا۔اس نے معذرت کے ساتھ یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ ایک باہر سے آنے والے کو ان کے (ہندوؤں کے کلچر) کلچر کے مطالعے سے روکتا ہے۔

غوری فتوحات کے بعد جب سلطنت سے قائم ہوئی اور ہندستان کے بڑے حصے میں ایک اور متوازی کلچر برہمنی کلچر کے ساتھ ساتھ ظاہر ہوا۔البیرونی نے واضح طور پر برہمنی کلچر اور ہندستان اور نئے ظاہر ہونے والے کلچر کے درمیان تمیز کی جو اس زمانے میں اس کے لئے بالکل فطری تھا مگر ان حدود میں ہندستان کا تصور عموماً ثقافتی حوالے سے غیر جانبدار کردار کے ساتھ موجود تھا جن کی حدود کا بیان البیرونی نے کیا ہے۔اس کا بہت صاف آئینہ عصامی کی نظم (1350ء) ہے جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے/ ملک ہندستان کی شان و شوکت پر اپنا فیض نازل کر،/ کیونکہ ہندستان خوشبوؤں میں بسا ہوا ایک ایسا باغ ہے جس سے جنت حسد کرتی ہے۔

اس نظم میں ہندستان کی آب وہوا، یہاں کی دریاؤں، یہاں کی زرخیزی، یہاں کا زندگی بخشنے والا ماحول کی تعریف کی گئی ہے جو ہندستان میں آنے والے اجنبیوں کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ یہاں بس جائیں۔ثقافتی خصوصیت میں کوئی رکاوٹ نہیں بنتی ہے۔(8) عصامی نے ہندستان کے باسیوں کے لئے واضح انداز میں لفظ ہندیان یا ہندو استعمال کیا ہے اور وہ مسلمانوں کو بھی اسی لفظ سے منسوب کرتا ہے۔(9) تاکہ ایک دھرم کے پیروکار ہندوؤں اور ہندستان کے باسیوں ہندیان کے درمیان فرق قائم ہو جائے جو اس کے زمانے میں قائم ہو گیا تھا۔

1318ء میں امیر خسرو نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندستان کی اول الذکر قدرتی اور طبعی خوبیوں کے مقابلے میں مزید زیادہ اعلیٰ خوبیاں دریافت کی ہیں۔اپنی دھرتی ماں ہندستان سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہندستان میری جنم بھومی ہے، میں اس پر سانس لیتا ہوں، یہ میرا دیس ہے اور اپنے دیس سے محبت کرنا ہر دیس بھگتی کا ایمان ہے۔(10) ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہندستان کی مٹی کی زرخیزی اور سرشار کر دینے والی آب وہوا نے اسے جنت جیسا

بنا دیا ہے۔(11) اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہندو علوم اور عقائد کے کارناموں کو بھی نتھی کیا ہے۔ یونان کی طرح جیسا کہ خسرو نے کہا ہے ہندوؤں کے پاس بھی سائنسی علوم کا سرمایہ تھا اور اعلیٰ سوچ رکھنے والے ہندو ایک خدا کو مانتے تھے۔(12) البیرونی کا بھی یہی موقف ہے لیکن اس کے بعد امیر خسرو ضمیر متکلم جمع کے صیغے میں بات کرتے ہیں۔ ہم ہندستان کے لوگ باہر کی زبانیں بھی بولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چینی، منگول، ترک اور عرب ہماری ہندی زبان بولنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔(13) ہندستانی حصول علم کے لئے اپنے دیس سے باہر نہیں جاتے ہیں البتہ دوسرے باہر کے دیسوں کے لوگ حصول علم کے لئے ہندستان آتے ہیں۔(14) ہندستان نے دنیا کو علم الاعداد، پنچ تنتر کی کہانیاں اور شطرنج کا کھیل مہیا کیا ہے۔(15) اس نے مزید ہندستان میں رائج بہت سی زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ غوری اور ترک جب ہندستان آئے تو فارسی زبان لے کر آئے جس کو اب ہر سطح کے لوگ پڑھتے ہیں اس کے علاوہ بہت سی علاقائی زبانیں یعنی ہندوائی رائج ہیں جن میں سے خسرو نے بارہ زبانوں کی فہرست قلمبند کی ہے جن میں تامل اور کنا ڈا بھی شامل ہیں پھر وہ عالم برہمنوں کی سنسکرت زبان کا ذکر کرتا ہے۔(16) ہندستانی زبانوں کی قدر و قیمت پر وہ فخر کا اظہار کرتا ہے۔ اس سے پہلے ہندستان کے اعلیٰ برہمن کلچر نے اس قدر وضاحت کے ساتھ ہندستان کی اکائی اور اس کی پہچان کا تعین نہیں کیا تھا۔ گو کہ یہ کلچر قدیم زمانے سے ہندستان کا اٹوٹ انگ رہا تھا۔ ہم پہلے سے ہی ہندستان کے ایک ایسے تصور سے آشنا ہوتے ہیں جس کا ایک اپنا نادر ملا جلا کلچر تھا اور جس سے ترک تارک وطن خاندان کے لوگوں جیسے کہ امیر خسرو نے محبت اور وفاداری کا اظہار کیا ہے اس پر وہ نازاں ہیں اور انہوں نے فارسی کو اپنی ایک زبان کہہ کر گود لیا ہے۔

ایک اور قابل توجہ اہم پیش رفت جس نے لازماً ہندستان کے ایسے دیس کا تصور دیا جس کے اپنے سماجی اور ثقافتی ادارے تھے اور جہاں مسلمان کمیونٹی کی نشو و نما بھی اپنے رنگ ڈھنگ سے ہوئی تھی جو ہندستان سے باہر کی مسلمان آبادیوں سے بالکل ہی مختلف ہو گئی تھی۔ کٹر پنتھی عالم دینیات اور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی اور اخلاقیات پر اپنے کام جس کی لکھت کا زمانہ 1590-91 ہے معذرت خواہانہ انداز میں مانتا ہے کہ یہاں کے مسلمان قوانین متاعی بیاہ اور شوہر کی طرف سے فوراً طلاق دینے کی اجازت دیتا ہے اور پھر مزید تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے

کہ ہندستان کے لوگوں میں یہ رجحان کہ وہ طلاق دینے سے اجتناب برتتے ہیں اور لفظ طلاق کو مثل گالی بدترین لفظ تصور کرتے ہیں ایک قابل تعریف رواج ہے۔ طلاق کو وہ اس حد تک برا سمجھتے ہیں کہ طلاقی کو اپنے سماجی تانے بانے ہی سے باہر نکال دیتے ہیں۔(17) اس طرح بدایونی جیسا کٹر مسلمان بھی صاف لفظوں میں اسی موقف کا اظہار کرتا ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کے رنگ ڈھنگ ان کی روایات اور ان کے رویئے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے مختلف ہیں۔ اس کی ایک مثال تو طلاق کے خلاف ان کا رویہ ہے۔ کوئی شوہر جو اپنی بیوی کو طلاق دے اس کی مذمت کی ہے۔ اس گہرے اثر کی وجہ ہندو قانون بھی ہو سکتا ہے جو بیاہ کے مستقل جاری رہنے کو ممکن بنا دیتا ہے۔ اس کے بارے میں حتمی رائے دینا مشکل ہے لیکن یہ رجحان رواج کی صورت میں ہندستانی مسلمان سماج کا بھی ایک نمایاں پہلو ضرور ہے۔

تاریخی اعتبار سے ہندستان کی پہچان اور اکائی کا بیان بھی بدایونی کے اس بیانئے کے کچھ ہی دن بعد رکھا گیا تھا۔ اس بیانئے کا مصنف بدایونی ہی کا ایک دوست نظام الدین احمد ہے جس نے 94-1593ء میں اپنی طبقات اکبری مکمل کر لی تھی۔ اس تاریخی بیانئے کی ندرت یہ تھی کہ اس میں ہندستان کے نو الگ الگ علاقوں، دہلی، دکن، گجرات، مالوہ، بنگال، جونپور، کشمیر، سندھ اور ملتان زیر مطالعہ آئے۔ رواج کے مطابق خاندانوں کے حکمرانوں کی تاریخ نویسی سے آگے جا کر ہندستان کی عمومی تاریخ نویسی ایک مثبت اگوائی تھی۔ اپنے اس کارنامے کے لئے نظام الدین احمد کو جو اعزاز حاصل ہونا چاہئے تھا صحیح طور حاصل نہیں ہوا۔ اس نے ماضی کے بیانیہ نگاروں سے جن میں بدایونی بھی شامل تھا تحریک حاصل کی تھی۔ اس کے بعد محمد قاسم فرشتہ کا قابل تحسین تاریخی بیانیہ ''گلشن ابراہیمی'' 10-1609ء آتا ہے۔ فرشتہ نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر ہندستان کی قبل از اسلام کے تاریخی زمانے کو از سر نو تشکیل دینے کی کوشش کی۔ باوجود اس کے کہ ان تاریخی بیانیوں میں تاریخ کا نظریہ محدود ہی ہے اور صرف اس حد تک آگے گیا ہے کہ محض حکمراں خاندانوں کی الگ درجہ بندی کے علاقوں اور ماضی کی تاریخ تک پہنچ ہوئی ہے۔ ان تاریخی بیانیوں میں ہندستان کی ایکتا کا جو شعور ظاہر ہوا ہے قابل تعریف ضرور ہے۔(18)

اس طرح یہ تو ہوا کہ ہندستان کے تصور کی ہند اسلامی روایت محض جغرافیائی حدود سے نکل

کر آگے کی طرف گئی تھی اور جس سے سب سے پہلے اکبر مانوس ہوا تھا۔ اس کا جنم اگر چہ (1542ء میں) ہندستان میں ہوا تھا مگر اس کا بچپن 1555ء تک افغانستان میں گزرا تھا جس کا ذکر ہندستان واپس آ جانے کے بعد اس نے خود کیا تھا۔(19) ہندستان آ جانے کے بعد اکبر نے اپنی رعایا کی زبان اور اس رسوم ورواجات سے واقف ہونے میں بہت دلچسپی لی تھی۔ 1563ء میں آدھم خان کا مقابلہ کرتے ہوئے اس نے جو ہندی گالی استعمال کی تھی اب تک مقبول(20) عام ہے۔ بادشاہ ہندی میں شعر کہتا تھا۔ سرکاری سوانح نگار کے مطابق ان اشعار کے لفظوں میں رنگا رنگ خود بینی تھی۔(21) ہندستانیوں کی طرح بادشاہ نے بھی اپنے بال بڑھا لئے تھے اور ان کو ترشواتا نہیں تھا۔(22) اس نے داڑھی بھی نہیں رکھی تھی ہندستانی قصوں سے اسے اتنا لگاؤ تھا کہ اس نے 72-1571ء سے پہلے ہی سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ کروا لیا تھا۔(23) لیکن اکتوبر 1578ء میں پہلی بار ہم دیکھتے ہیں کہ بادشاہ ہندستانیوں سے اپنی محبت کا بھی برملا اظہار کرنے لگا تھا۔ دربار کی ایک شاہی تقریب میں بھی اس نے ہندستانیوں کے کھرے سچ بولنے کی عادت کی تعریف کی تھی۔ ان کی عورتیں خواہ کتنی ہی سخت اور اذیت بھری زندگی کیوں نہ گزارتی ہوں اپنے شوہروں کی وفاداری اور محبت کا دم بھرتی تھیں ہندستانی عورتیں اپنے شوہر کی وفات کے بعد خود کو بھی آگ لگا کر ختم کر لیتی تھیں (رسم ستّی)۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اکبر نے ہندستانیوں کی بزدلی کی مذمت بھی کی تھی جو اپنی عورتوں کو ستّی ہو جانے کی اجازت دیتے تھے یا اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔(24) مسلمانوں میں چونکہ ستّی جیسی کوئی رسم نہیں تھی یوں ہندستان اور ہندستانیوں کے مابین ایک مشترک سماجی اور ثقافتی رنگ ہونے اور بھائی چارے کے باوجود ہندو ہندستان کا ایک الگ رنگ بھی نظر آتا تھا کیونکہ مسلمان ہندستانی سماج بہت سی مشترک رسوم اور رواجوں میں ڈھل جانے کے باوجود بعض مذہبی معاملات کا دفاع بھی کرتے تھے۔

ہندستان کی پہچان کا ایک اسی سے ملتا جلتا رجحان ان دنوں پنپنا شروع ہو گیا تھا جن دنوں اکبر نے ہندو دھرم کے مختلف مسالک اور ان کے اعتقاد سے آگاہی حاصل کرنے پر توجہ دی تھی۔ 1578ء میں دو بار دو برہمنوں پرشوتم اور دیوی (؟) نے بادشاہ کو ان پے چیدگیوں سے آگاہ کیا تھا جس کے مطابق بادشاہ نے جانا تھا کہ آواگون کا اعتقاد ہندو دھرم کا لازمی حصہ

ہے۔(25) جیسا کہ ابوالفضل بتاتا ہے کہ اکبر آواگون سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں ہندستان کی ہندو اکثریت کا یہ ایمان اوتاروں کے نزول پر تھا نہ کہ پیمبروں کے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر مطالعے و مشاہدے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندستان میں کوئی بھی پیمبری کا دعویٰ نہیں کرتا تھا۔ اس کی وجہ پہلے کی مثالوں کے موقف پر اعتقاد ہے جو قدیم زمانے سے چلا آ رہا تھا۔(26)

ان تمام بیانات میں صاف دکھائی دیتا ہے کہ اکبر کو ہندستان پر یقیناً فخر تھا مگر اس میں تنقید کا عنصر بھی شامل رہا تھا۔ ہندستان اگر اپنے بعض رسوم اور اعتقادات کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا تو اس سے یہ مفہوم نہیں لیا جانا چاہئے کہ ان کو صحیح بھی مان لیا جائے۔ اس طرح اکبر نے ہندستان فہمی میں ایک نیا پہلو پیدا کر دیا تھا جس کا مقصد سدھار کے رجحان کو بڑھاوا دینا تھا۔ اس نے رسم ستی اور کم عمری کی شادیوں پر پابندی لگا دی تھی۔ اس نے لڑکیوں کے لئے ورثے کی تقسیم میں برابری کو ترجیح دی تھی۔ غلامی اور غلاموں کے بیوپار سے اسے سخت چڑھ تھی جس کی وہ مذمت کرتا تھا۔(27) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بادشاہ نے ماضی کی بعض خرافات کو رد کر دیا تھا۔ ثقافتی اکائی کی صورت میں دیکھے جانے والے ہندستان سے جس میں ثقافتی فرق کے بھی پہلو تھے جو تجزیاتی شکل ابھرتی ہے اس کے تناظر میں اکبر پہلا بادشاہ تھا جس نے سماجی اور اخلاقی بہتری کی تحریک پیدا کی تھی۔ اس نے بڑے حوصلے کے ساتھ روایت پرستی کے رجحان پر کاری ضرب لگائی تھی۔ اس کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ "تعقل کے رجحان کی ہمت افزائی اور روایت پرستی کا رد اکبر کا نہایت فعال کارنامہ تھا۔ جیسا کہ اوپر کے حوالوں سے واضح ہوتا ہے۔ بادشاہ نے یہ دلیل بھی پیش کی تھی کہ اگر روایت پرستی ہی صحیح سمت ہوتی تو ہر پیغمبر نے بھی اپنے ماضی ہی کے پیغمبروں کی تعلیمات کا پرچار کیا ہوتا اور وہ کوئی نیا پیغام لے کر نہ آتے۔(28)

اس تاریخی تناظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکبر کے ساتھ ہندستان کے جدیدیانے کی قبل از جدید بصیرت کا آغاز ہو گیا تھا خواہ یہ کسی قدر محدود ہی کیوں نہ قرار دی جائے۔ اس احیائیت کے رجحان کو نظر انداز کر کے حب الوطنی کا زیادہ جدید تصور دیا تھا۔ اکبر اور اس کے حلقہ بگوشوں کے لئے بالتفصیل اور گہرائی کے ساتھ ہندستان کیا معنی رکھتا تھا اس کا اندازہ اس کے خاص

ترجمان ابوالفضل ہی کے بیانات سے کیا جا سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پچھلے تمام لکھاریوں کے مقابلے میں ہندستان کی جغرافیہ کا ابوالفضل زیادہ شعور رکھتا تھا۔ جیسا کہ اس نے لکھا ہے کہ اتر کی طرف بلند و بالا پہاڑوں کی تہہ در تہہ قطاریں ہیں جو اسے طوران وسطی ایشیا اور ایران سے الگ کرتی ہیں تو دوسری طرف چین (چین اور ماچین) کو ہندستان سے علیحدہ کرتی ہیں۔ (29) اس کا لکھا ہوا یہ بیان ایک زمانے تک ان برطانوی پالیسی ساز مکالمہ گویان کے لئے مددگار حوالہ بنا رہا تھا جو افغانستان کے دل سے ملحق سرحد کو سائنسی سرحد قرار دیا کرتے تھے۔ ''ماضی کے صاحب بصیرت لوگوں نے کابل اور قندھار کو جڑواں صدر دروازے قرار دیا تھا جہاں سے ہندستان آنے کا راستہ ملتا تھا۔ قندھار سے راستہ ایران کو جاتا تھا اور دوسرا طوران کی طرف جاتا تھا۔ ان دو صدر دروازوں کی چوکیداری ہندستان کے لئے امن کی ضمانت تھی کیونکہ ان ہی راستوں سے لٹیرے ہندستان آتے تھے اور یہی راستے بیوپار کے عالمگیر مشغلے کا ذریعہ تھے۔ ان کی چوکیداری عالمی بیوپار کے فروغ کا بھی ذریعہ بنتی تھی۔ (30)

یہ بہت اہم بات ہے کہ ابوالفضل ہندستان کو ایک آبنائے سمجھتا ہے کیونکہ اس کے بقول پچھم پورب اور دکن کی سمتوں میں ہندستان کی سرحد سمندر ہے۔ اس کے باوجود وہ مدعی ہے کہ سرندیپ (سری لنکا)، ساترا میں اچین، ملایا (یا ملوک) مالاگھا (یا ملاکا) اور دوسرے جزیرے ہندستان میں ہی شامل ہیں اس لئے سمندر اصلاً ہندستان کی سرحدوں کی حتمی لکیر نہیں کہا جا سکتا ہے۔ (31) یہ ہندستان کا کسی حد تک انتہا پسندانہ تصور ہے جو بعد میں عظیم تر ہندستان کے رجحان کا محرک بھی ثابت ہوا تھا اور جس کو ماننا بہت مشکل ہے۔ ابوالفضل غالباً صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ سمندر دوسرے سمندر پار علاقوں تک ہندستان کے ثقافتی اثرات کی پہنچ کو نہیں روک سکتا تھا۔ اس کا یہ بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

ابوالفضل اپنے دیس پریم کا مظاہرہ ہندستان کے عوام کی ناقابل تردید تعریف کے ذریعہ کرتا ہے۔ ''ہندستان کے عوام خدا پرست، فیاض دل اور باہر سے آنے والوں کے دوست ہیں ان کا کھلا ہوا چوڑا ماتھا ان کے چہرے کو خوشگوار بناتا ہے وہ علم سیکھنے کا شوق رکھتے ہیں، رہبانیت سے محبت کرتے ہیں، ان کا مزاج انصاف پسند ہے، وہ باصلاحیت اور محنت کش

ہوتے ہیں۔ نمک حلالی ان کا شیوہ ہے، سچائی ان کا آدرش ہے اور وفاداری ان کی عادت ہے۔" (32)

یہ بات قابل غور ہے کہ یہ تمام خوبیاں ہندستان میں بسنے والے عوام سے منسوب کی گئی ہیں نہ کہ کسی ایک مذہب کے ماننے والوں اور پیروکاروں سے لیکن چونکہ بہت بڑی ہندستانی اکثریت ہندو تھی جیسا کہ ابوالفضل کہتا ہے کہ یہ تمام ہندستانی لوگ جن میں ہندو بھی شامل ہیں خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ مزید دلیل پیش کرتا ہے کہ ان میں کچھ ہندو اگرچہ مورتیوں سے عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہیں لیکن حقیقت میں اسے بت پرستی نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ دیوی دیوتا تو محض خدا کی وحدت اور پرستش کا ایک ذریعہ ہیں۔ (33) ہم یہاں اس موقف کے دفاع سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے ہیں صرف اس ضرورت کی نشاندہی کررہے ہیں جس کی بنا پر ابوالفضل نے اس موقف کا اظہار کیا ہے۔ ہندستانی عوام کو خدا پرست کہہ کر اس نے ہندوؤں کو بھی اس صف میں شامل کرلیا ہے۔

ایک اہم کلچر کی جنم بھومی اور بنیاد ہونے کے حوالے سے ہندستان کو تسلیم کرتا جس نے اظہار کے لئے ہندستانی ہندی (یعنی سنسکرت) زبان پیدا کی وہ موضوع ہے جس کا احاطہ آئین اکبری کے بعد کے حصے میں طویل مگر بالکل صحیح تفصیلی جائزے کا ابتدائی موڑ ہے۔ اس حصہ کا عنوان ہے "ہندستان کا بیان۔" اس بیان میں ایسا کوئی کوئی رنگ نہیں دکھائی دیتا ہے۔ جس کو بنیاد بنا کر ہم کہہ سکیں کہ مصنف نے ہندستانی کلچر کو فرقہ وارانہ تناظر میں پیش کرنے کے بارے میں سوچا بھی ہو موجودہ زمانے کے موضوع سے متعلق رائے دینے والوں کی ایک خاص عادت تعصبات ہیں کہ جب اور جہاں ابوالفضل نے اپنے ارادے کے تناظر میں ہندستان دیس کے حالات پر کچھ لکھتا ہے اور ہندستانی بزرگ علماء کے نقطہ نظر کا جائزہ لیتا ہے (34) تو مترجم اپنے تبصرے کے آخر میں یہ فقرہ دیتا ہے کہ یہ وہ نقطہ نظر ہے جس کو ہندوؤں کی پڑھی لکھی اکثریت نے قبول کیا ہے۔ (35) حقیقت یہ ہے کہ ابوالفضل جب ہندستان کو بیان کرتا ہے تو اس کے ذہن میں مذہب کا قطعی کوئی خیال نہیں ہوتا ہے۔ اس کے ذہن میں صرف علم جوتش اور جغرافیہ کے بارے میں ہندستانیوں کے محسوسات ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں اس کا رویہ البیرونی ہی جیسا ہے جس نے بھی ہندستانی علوم کے تمام سلسلوں کا احاطہ کیا ہے۔

اپنے جائزے کو سمیٹتے ہوئے ابوالفضل معذرت کرتا ہے کہ اس کے پاس ہندستانی علماء کے خیالات کا یونانی اور ایرانی علماء کے خیالات سے موازنہ کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔(36) اس سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس معذرت سے قطع نظر کہ وہ البیرونی کی طرح آگے نہیں جاسکا۔ ہندستان کے کلچر کے بارے میں اس کا نقطہ نظر غیر فرقہ وارانہ اور لازماً سیکولر تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندستانی کلچر کے موضوع پر ابوالفضل کا بیانیہ جو فارسی میں ایک سو پچاس بڑے صفحات پر پھیلا ہوا ہے تفصیلات اور صحت کے اعتبار سے ایک شاندار کارنامہ ہے جو سیکولر علوم، رسوم اور نسلی ولسانی موضوعات پر محیط ہے۔ اس کا یہ بیانیہ البیرونی کے بیانئے سے بالکل آزاد ہے اور اس کا نقطہ نظر بھی مکمل طور پر معلوماتی ہے۔ ابوالفضل نے یقیناً یہ معلومات لاتعداد ہندستانی متون سے حاصل کی ہیں اور اس کے لئے بہت سے مستند علماء مفسرین اور ترجمہ کاروں کو ذریعہ بنایا ہے۔(37) لیکن ان معلومات کی تدوین میں جس احتیاط اور جامع اظہار سے اس نے کام لیا اس کا اپنا کارنامہ ہے۔ اس جائزے کا جادوناتھ سرکار کے تحقیر آمیز تبصرے کے باوجود تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔(38) کیونکہ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ کیسے اور کن نکات کی بنیاد پر اس زمانے میں (1595ء) ہندستانی اعتقاد اور افکار و نظریات تھے، یا ان کا اظہار ہندستان میں کیا جاتا تھا۔

ابوالفضل کو خصوصی دلچسپی فارسی داں طبقے کو ہندستانی کلچر سے آگاہی فراہم کرنے میں تھی اور اس کا بیان بعض اختلافات کے باوجود ایک اکائی ضرور ہے۔ وہ ایک وسیع تر اکائی پر نظر رکھتا ہے تاکہ خارجی اور داخلی ٹکراؤ کی صورتیں ہم آہنگ ہو جائیں، دشمنی کے کانٹوں اور اشتعال کے تناظر میں محبت رواداری اور دوستی کا نمایاں رنگ بھی واضح ہو۔ تعقل پسند اسباب و علل کے ذریعہ حقیقت وضع کی جاسکے اور تمام معلومات کو مرتب کیا جاسکے۔(39) اس کا اپنا انداز نظر پوری طرح سائنسی اور پوری طرح عقلی ہے۔(40) اور ان ہی بنیادوں پر وہ مختلف ہندستانی اعتقادات اور نقطہ ہائے نظر کے اپنے جائزے کو سند فراہم کرتا ہے۔ ایک موقع پر وہ لکھتا ہے کہ (41) ایک موقع پر آبادی کے لائق دنیا کے یونانی اور ہندستانی نقطہ نظر کو نامنظور کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ موجودہ زمانے میں صداقت پسند دانشور خط استوا کے نیچے دکن کے علاقے کو اسی قدر آباد سمجھتے ہیں جتنا کہ اتر ہے۔

دوسرے لفظوں میں ابوالفضل ثقافتوں کے باہم متوازی منہاج سے بالاتر ہو کر دیکھ رہا تھا۔ یا ایک کھچڑی ہندستانی ثقافت جو روایات کا محض تال میل تھی۔ اس کھچڑی ہندستانی کلچر کو ہمیں یہ بتاتے ہوئے کہ ہندستان میں باہر سے آنے والے آدم سے لے کر ہمایوں تک (42) اور پھر زیادہ قابل ذکر ہندستان کے مسلمان بزرگانِ دین اور درویش آتے ہیں۔ (43) یہ موقف اختیار کرتا ہے کہ یہ وہ بہاؤ تھا جو ہندستان میں آ کر ہندستانی ہو گیا تھا لیکن اس بہاؤ کو ہر حال میں خود کو مقامی فضا کے ساتھ جوڑنا تھا جس کے جواز کے لئے دلیلیں ہوں کیونکہ اس عمل کی تکمیل کے بعد ہی اعلیٰ سطح کی ایکتا حاصل ہو سکتی تھی۔ اس اعلیٰ سطح تک پہنچ کے لئے ابوالفضل نے خود مختار حکمراں یا بادشاہ کے لازمی کردار کو بنیاد قرار دیا ہے۔ کئی سفر بھگتنے کے بعد ہمایوں کو تو ہندستان آنا ہی تھا اور اس کے آنے کا جشن بھی ہونا تھا کیونکہ اسی واقعہ نے اکبر کو تخت شاہی تک پہنچایا تھا اور یہ لوگوں کے بارے میں اسی کے عدل وانصاف اور فیصلے کی دین تھی۔ جس کی وجہ سے ہندستان سات اقلیموں کے اچھے لوگوں کا مجموعہ بن گیا تھا اور ہر شخص اپنے اپنے طریقوں سے اپنے مقاصد حاصل کرتا تھا۔ (44) اس کے لئے بادشاہ نے صلح کل کے اپنے اصول کا نفاذ کیا تھا۔ ابوالفضل اور اس کے جیسے لوگوں کے لئے بھی یہ اصول مفید تھا (45) اور عوام الناس کے لئے بھی کیونکہ بادشاہ سب کا باپ تھا۔ ہر قسم کے لوگ اسی کی وجہ سے تمام سہولتیں اور فائدے حاصل کرتے تھے۔ لوگوں کے مابین اگرچہ بھانت بھانت کے مختلف عقائد تھے تاہم ان کی بنا پر نہ کوئی تنازعہ ہوتا تھا اور نہ ٹکراؤ۔ ایک ایکتا کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ ان تمام رویوں کے باوجود بادشاہ نے لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے بے عقل اور بے جا نچلے درجے کے حربے اختیار نہیں کئے بلکہ تعقل پسندی کے اپنے موقف کو ہر مرحلے میں ترجیح دی۔ (46) دوسرے لفظوں میں بادشاہ کے فرائض میں یہ فرض بھی شامل تھا کہ وہ موجود عقائد کی رنگارنگی کو برداشت کرنے کے رویئے کو بڑھاوا دے اور اس کا دفاع کرتا رہے جو اکبر نے کیا تھا۔ دلیل سے معاملات کو نبٹانے اور روایت پرستی کے رد پر بھی بادشاہ قائم رہا تھا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ابوالفضل اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جو تعقل پسندی اور حقیقت کے تناظر میں اکبر کے سماج سدھار کی تحریک کو جواز فراہم کرتا ہے تاکہ ایک ایسا ہندستان بنے جو پوری دنیا میں اپنی مثال آپ ہو۔

حوالہ جات

1- آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا۔لندن۔1919ء ص IX-X

2- اس کے نقطہ نظر پر تنقید کے لئے دیکھیں آر۔پی۔دت۔انڈیا ٹوڈے۔ممبئی 1947ء ص 237-39

3- بینیڈکی اینڈرسن۔امیجنڈ کمیونیٹیز۔ریفلیکشنز آن دی اوریجن اینڈ اسپریڈ آف نیشنلزم۔لندن 1983ء

4- سبالٹرن اسٹڈیز VIII دہلی 1994ء ص 49

5- ایڈورڈ۔سی۔ساچو ترجمہ البیرونیز انڈیا۔لندن 1910ء (1) ص 198

6- ایضاً ص 294-98

7- ایضاً ص 22-24

8- عصامی۔فتوح السلاطین۔اے۔ایس۔اوشا ایڈیشن۔مدراس۔1948ء ص 604-605۔اس نے یہ کتاب دولت آباد دکن میں لکھی تھی اور اس لئے وہ پورے دیس کو ہندستان لکھتا ہے۔

9- ایضاً۔ص 465۔اصامی محمد تغلق کی فوج کا ذکر کرتا ہے جو ترماشرین کی منگول فوج سے مقابلہ کر رہا تھا۔

10- نہہ سپہر۔محمد وحید مرزا ایڈیشن لندن 1950ء ص 150

11- ایضاً ص 151-61

12- ایضاً ص 162-66

13- ایضاً ص 167-168

14- ایضاً ص 168-167

15- ایضاً ص 170-168

16- ایضاً ص 181-178 کیا امیر خسرو نے اس لئے ہندستان کا پہلا دیس پریمی شاعر تھا؟ بہت پہلے اے۔بی۔کیتھ نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ماضی کے کلاسیکی زمانے میں دیس پریم کا ایسا جذباتی رجحان سنسکرت لکھاریوں میں نہیں تھا۔اے۔ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر۔لندن 1920ء ص 345

17- نجات الرشید۔سید معین الحق ایڈیشن لاہور 1927ء ص 345

18- عصامی نے یہ بھی لکھا ہے کہ علاؤ الدین خلجی نے ہندستان کو ترقی دی جبکہ محمد بن تغلق نے اسے تباہ کیا۔"فتوح السلاطین" ص 605

19- ابوالفضل۔آئین اکبری۔نولکشور ایڈیشن، لکھنو 1892ء۔III ص 188۔"ہم جب ہندستان پہنچے تو یہاں ہاتھی دیکھ کر بے حد لطف آیا تھا۔ان ہاتھیوں میں بڑی کشش تھی۔"

20- بائزید بیات۔تذکرہ ہماریوں و اکبر۔ایم۔ہدایت حسین کا ایڈیشن۔کولکتا 1941ء ص 52-251

21- ابوالفضل۔اکبرنامہ۔احمد علی ایڈیشن۔کولکتا 87-1837 ص 71-270

22- اکبرنامہ کا پہلا مسودہ۔بی۔ایل۔ایڈ 27، 247۔الیف 294 اے۔

23- بدایونی، منتخب التواریخ۔کولکتا۔69-1865ء (II) ص 78-177

24- اکبرنامہ کا پہلا مسودہ بی۔ایل۔ایڈ 27، 247۔الیف۔الیف۔295 بی۔296 اے۔ لوگوں کے رویئے کی کافی سخت مذمت کا حوالہ ابوالفضل نے اکبر کے اقوال سے قلمبند کیا ہے۔آئین اکبری کا آخری حصہ جلد III ص 190

25- بدایونی۔منتخب التواریخ۔(II) ص 400-398

26- آئین اکبری III ص 185

27- عرفان حبیب۔اکبر اینڈ سوشل اِن اکویٹیز، اے اسٹڈی آف دی ایولوشن آف ہز آئیڈیاز۔پروسیڈنگز آف دی انڈین ہسٹری کانگریس۔ورنگل 93-1992ء کا اجلاس۔

دہلی 1993ء ص 310-300۔ وہ اکبر کے معمولات میں روایت آلودہ ہندستان پر اس تنقید کو دیکھتے ہیں جو بعد میں انیسویں صدی کے دوران ہندستان کی نشاۃ الثانیہ کا شعلہ بن کر ظاہر ہوئی تھی۔

28- اکبر آئین اکبری میں کہتا ہے۔ جلد III۔ ص 179

29- ایضاً۔ ص 4

30- ایضاً۔ II ص 192 اس اقتباس کا حوالہ وی۔اے۔اسمتھ کے یہاں دیکھیں۔ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا ص 755۔ موضوع سائنسی سرحد کی بحث۔

31- آئین اکبری III ص 4

32- آئین اکبری III ص 5

33- ایضاً۔

34- آئین اکبری III ص 2

35- آئین اکبری III ترجمہ ایچ۔ایس۔جیرٹ ایڈیشن جادو ناتھ سرکار۔ کولکتا 1948ء ص 1۔ یہ بھی واضح نہیں ہے کہ جیرٹ کے مطابق اکثریت کیا ہے۔ ایسی ہی عدم صحت کے ساتھ مگر کم ناانصافی کرتے ہوئے جیرٹ اور سرکار ہندی کو سنسکرت کہتے ہیں۔ وہ پڑھنے والوں کو یہ نہیں بتاتے ہیں کہ اصل متن میں لفظ سنسکرت نہیں ہندی ہے۔

36- آئین اکبری ایڈیشن۔ نولکشور III ص 177۔ جغرافیہ اور جوتش کے سلسلے میں ابوالفضل نے یونانی نقطہ نظر کے تفصیلی حوالے نہیں دیئے ہیں۔

37- ایضاً۔ III ص 2

38- آئین اکبری III ترجمہ سرکار ایڈیشن ص 19

39- آئین اکبری نولکشور ایڈیشن III ص 2

40- ایضاً ص 30

41- ایضاً ص 22

42- ایضاً ص 163-152

43- ایضاً ص 177-163، ابوالفضل سے پہلے اس حوالے سے بہت کٹر پنتھی عالم عبدالحق

دہلوی تھے۔ انہوں نے 1591ء میں اخبار الاخبار مکمل کی تھی جو 255 مسلمان ہندستانی درویشوں کی سوانح پر مشتمل مجموعہ ہے۔

44- آئین اکبری، نولکشور ایڈیشن۔(III) ص 163

45- ایضاً(III) ص 178-177

46- ایضاً(I) ص 3

❁❁❁❁❁

زمانہ وسطیٰ کا بنگالی ادب:

عہد اکبری کے بنگال کے مطالعے کا ایک ماخذ

انیرودھ رے

بنگال میں سولہویں صدی بھونچال اور تبدیلیوں کی صدی ثابت ہوئی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب صدی کے دوسرے دہے کے ختم ہوتے ہوئے بنگال کے منظرنامے پر پرتگالی ظاہر ہوئے تھے۔ پہلے شیر شاہ کے ہاتھوں غور کی فتح اور بعد میں غور پر ہمایوں کی فتح سولہویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں کے واقعات ہیں جن کی بنا پر افغانوں اور مغلوں کے درمیان محاذ آرائی ہوئی تھی جس میں اوڑیسہ کے راجاؤں نے بھی حصہ لیا تھا۔ یہ محاذ آرائی عارضی طور پر اکبر کے جرنیل منعم خاں کی کامیابی پر تمام ہوئی تھی جس نے 1575ء میں غور پر قبضہ حاصل کر لیا تھا پھر بھی آخری اور حتمی مفاہمت سترہویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوئی تھی۔

فاتحوں کی آمد آمد کے ساتھ ہماری نظر مذہبی سدھار کار چیتنیا پر پڑتی ہے جس کے مختصر مگر شہاب ثاقب جیسے کیریر نے بنگال کے ثقافتی تانے بانے پر گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ یہاں ہمارا ہدف بنگالی کے ماخذ کے تناظر میں سماجی و اقتصادی قوتوں کی کارکردگی کا تجزیہ ہے جو زمانہ اکبر کے بنگال میں پہلے سے متحرک تھے اور جیسا کہ آگے ہم اس کایا پلٹ کا مطالعہ کریں گے جو سولہویں صدی کے بنگال میں ہوئی تھی۔

بعض اسکالرز نے ماضی ہی مانا کہ قرونِ وسطیٰ کے بنگال کی تاریخ کا ماخذ زمانہ وسط کا بنگالی ادب ہے۔ 1964ء میں (1) آستوش بھٹاچاریہ نے منگل نظموں میں موجود قیمتی مواد کی

طرف توجہ دی تھی۔ دوسرے جیسے کہ تپن رے چودھری (2)، عبدالکریم (3)، سکھ مائے مکھو پادھیائے (4) اور بعد کے انل چندر بنرجی (5)۔ ان ہی ذرائع کو سلطنت اور مغل بنگال دونوں کے مطالعے کے لئے استعمال کیا تھا۔ ان کے ہوتے ہوئے بھی ضرورت ہے کہ ان ذرائع کا دوبارہ جائزہ لیا جائے تاکہ نئی قوتوں کی اس فضا اور ان اثرات کا ادراک کیا جا سکے جو دھیرے دھیرے بنگال کے منظرنامے کو بدل رہی تھیں۔ ان ذرائع کی یکسانیت کی وجہ سے ہم نے زیادہ توجہ ان بھکیر اتھی علاقوں پر مذکور کی ہے جن میں چٹا گانگ اور اراکان کے قیمتی اور مختلف بنگالی ماخذ کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ بھکیر اتی علاقوں کے معاصر بنگالی ماخذ اپنے نقطہ نظر، مواد اور اسلوب کے اعتبار سے اول الذکر ماخذ سے مختلف ہیں جن کا آگے ہم مطالعہ کریں گے۔

زمانہ وسطیٰ کا بنگالی ادب جس کی بنیاد مذہبی لگاؤ پر قائم ہے دو وسیع تر قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (6) ایک قسم وسط سولہویں صدی سے لے کر چیتنیا کی موت کے بعد تک کی وشنوائی نظموں پر مشتمل ہیں۔ دوسری قسم نظموں کا ساکتا حلقہ ہے جن کو مزید تین ذیلی حلقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں اول مناسا منگل (سانپ دیوی کی پوجا) دوم چندی منگل (چندی دیوی کی پوجا) اور سوئم دھرما منگل (دھرما خدا کی پوجا)۔ اولین ذیلی حلقہ مناسا منگل کا ہے جب زیادہ قریبی دھرما منگل کا ہے جن کی اصل میں شروعات اواخر سترہویں صدی سے ہوئی تھی اور ان کا فروغ اٹھارہویں صدی میں ہوا تھا۔ یہ بنگال کے صرف ایک علاقے تک ہی محدود تھیں۔ سکومر سین کا موقف ہے کہ مناسا یا چندی پوجا قبل از ویدک زمانے ہی کی روایت کا تسلسل ہیں اور ان کی جڑیں بنگالی عوام کی نفسیات کے اندر بہت گہرائی تک پھیلی ہوئی ہیں۔ (7)

مزے کی بات یہ ہے کہ منگل نظموں کے پہلے دو حلقے (مناسا اور چندی) ہمیشہ اپنا تانا بانا ان بیوپاریوں کی مشکلات کے قصوں پر بنتے ہیں جو سمندر کے ذریعہ تجارتی سفر کیا کرتے تھے۔ ان کا مرکزی خیال بیوپاریوں کا کھویا ہوا منافع و کامیابی حاصل کرنے کے لئے دیوی کی حمایت حاصل کرنا ہے۔ ان نظموں میں چاند سوداگر کا قصہ اہتمام کے ساتھ بیان ہوا ہے اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ اس قصے کا جنم غالباً پاٹلی پتر (پٹنہ) میں ہوا تھا اور چودھویں صدی کے کسی وقفے میں وہ ہجرت کر کے بنگال آ پہنچا تھا۔ (8) یہ بھی دلچسپ اتفاق ہے کہ بنگال آزاد بھی اسی دور میں ہوا تھا اور وسط چودھویں صدی سے ایک انتظامی دائرے سے منتھی ہو گیا تھا جس کا

محرک سلطان الیاس شاہ (52-1351ء) سونارگاؤں پر فتح تھی۔

حوالہ دی جانے والی اول الذکر وشنوی نظمیں سولہویں صدی کے نصف دوم اور سترہویں صدی سے تعلق رکھتی ہیں۔ چیتانیا نے زیادہ تر چھوٹے شہروں میں وقت گزارا تھا اسی لئے ادب کی اس قسم کے ذریعہ بھگیرانی کے دونوں کناروں پر آباداں شہروں کی تصویریں اس ادب میں دکھائی دیتی ہیں۔ اس میں ہم دستکاروں اور بیوپاریوں کی دنیا کا منظر دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے توسط سے ہمارا تعارف بنگال میں مغل راج سے ہوتا ہے اور اقتصادیات وسماج کا وہ بدلاؤ دکھائی دیتا ہے جو سولہویں صدی کے دوران بھگیرانی کے علاقے میں ہوا تھا۔ مغل راج نے اس علاقے میں مروج سیاسی ڈھانچے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ ایک طویل خون آشام لڑائی جاری رہی تھی خصوصاً بالائی بھگیرانی میں اور جس کے نتیجے میں غور کا زوال ہوا تھا جو ان دنوں پچھمی ہندستان میں بہت بڑا شہر تھا۔

• غالباً موجودہ صورت میں منگل نظموں کا بانی ہری دت چودہویں عیسوی کے آخر تک زندہ تھا۔ (9) اس کا کام ایک بیوپاری کے حوالے سے ہے جو اپنے قیمتی مال سے بھرے ہوئے چودہ جہازوں کے ساتھ واپس آیا تھا۔ دلچسپ بات ہے کہ اس کام کے مسودے اور بعد کی تمام نقلیں موجودہ ضلع باقر گنج بنگال کے ساحلی علاقے سے دستیاب کی گئی ہیں۔ (10) اس علاقے کو باکلا کہا جاتا تھا اور ابوالفضل نے بھی اسی نام کا حوالہ دیا ہے۔ (11) جو بارہویں صدی اور اس کے بعد کاروباری مشاغل کی بنیاد تھا۔ (12) اس کے بعد کا شاعر نارائن دیو نے بھگیراتی کے علاقہ میں اپنا آبائی مکان چھوڑ دیا تھا اور پچھمی بنگال آ گیا تھا۔ اس مسودے کی تاریخ نے بعض الجھنیں پیدا کر دی ہیں اور تازہ تر رائے یہ ہے کہ اس کا زمانہ پندرہویں صدی کے اواخر کا تھا۔ (13) اس کی پدم پران میں چونکہ چیتانیا کا کوئی حوالہ نہیں ہے اس لئے پہلی تاریخ ہی کو مان لیا گیا ہے۔ کہانی ایک بیوپاری چاند سوداگر کے خلاف الزامات اور اس کی مشکلات پر محیط ہے۔ وجے گپتا نے جس نے اپنی پدم پوران کو 85-1884ء میں بنگال کے سلطان جلال الدین فتح شاہ 87-1481ء کے زمانہ اقتدار میں مکمل کیا تھا۔ (14) نظموں کی اس قسم کو بہت زیادہ مقبول عام بنا دیا تھا۔ اس کا مسودہ گیلا پھلاسری گاؤں میں جہاں اس کے جانشینوں کی تلاش بٹوارے تک جاری تھی باکلا کے علاقے سے بھی دستیاب ہوئی تھی۔ (15)

ہمارے نقطہ نظر کے مطابق کاروباریوں کے مشاغل کی معلومات جیسے کہ کشتیوں کی قسمیں، سمندری راستے، دونوں کناروں پر آباد شہر اور تبادلے میں حاصل ہونے والی اشیاء نہایت مزیدار حصے ہیں۔ پندرہویں صدی تمام ہونے تک سمندر میں لے جانے والے جتنے جہاز بیوپاری چند نے حاصل کئے تھے ان کی تعداد چودہ تھی۔ اوائل سولہویں صدی تک ان کی تعداد گھٹ کر سات رہ گئی تھی۔ چودہ جہازوں کی تعداد کو غالباً ایک بیوپاری کے حوالے سے بہت زیادہ سمجھا گیا تھا۔ یا تو یہ حقیقت پسندی کا کمزور نقطہ نظر تھا یا پھر یہ بنگالی بیوپاریوں کے کاروباری مشاغل میں دھیرے دھیرے کمی کی نشاندہی کرتا ہے۔

وجے گپتا نے اپنے چودہ ڈنگاؤں میں ان اشیاء کی تفصیلات دی ہیں تجارت کے لئے بیوپاری دکشنی (دکنی) ٹپن لے جایا کرتے تھے۔ ان اشیاء میں چاول، سوتی کپڑے، مختلف قسموں کے قیمتی پتھر جو دکنی ہندستان سے لائے جاتے تھے مع ہیرے جواہرات اور کورل کے مختلف قسموں کا اناج، پان کے پتے، چھالیا اور پھولوں کے شامل ہوتی تھیں۔ بعد میں سات سو گھوڑوں اور مصالحہ جات کا جن کے تبادلے میں سونا حاصل کیا جاتا تھا حوالہ ملتا ہے۔ (16) غالباً شاعر کے ذہن میں گجرات کا شہر پٹن تھا جو ماضی میں بطور بندرگاہ اہم ہوا کرتا تھا۔ ہر صورت میں اس کا بیان ساحلی تجارت سے متعلق ہی ہے نہ کہ دکنی پچھمی ایشیا کی سلطنتوں کے ساتھ تجارت۔

کشتی بنانے کا ایک بیان ہمیں جیون میترا کی تحریروں میں ملتا ہے۔ (17) جس کا تعلق اتری بنگال سے تھا اور زمانہ اٹھارہویں صدی کا وسط تھا۔ اس نے لکھا کہ ایک ڈنگے کی لمبائی سو گز اور چوڑائی پچاس گز ہوتی ہے اور اس کی لکڑی خاص قسم کی ہوتی ہے جس کا شعری نام ذہن کی مسرت ہوتا ہے۔ اس لکڑی کو سمندر کے بیچ ایک جزیرے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ بتائی گئی ہے کہ ان ڈنگوں میں مستول کے علاوہ تصویریں بھی جن میں جانوروں کی تصویریں شامل ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں کشتیوں کی تیاری کی بھی ایک رسم ہوتی تھی۔ اس کی شروعات استاد بڑھئی یا ادھکاری کرتا تھا۔ اس سے پہلے مختلف جانوروں کی قربانی دی جاتی تھی جس کے ساتھ ساز بجائے جاتے تھے۔ اس قسم کی رسومات سے شاعر کی مانوسیت واضح ہے اور یہ رسم ماضی کی کئی صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ یہ رسم دیوی کالی یا چنڈی کی پوجا ہی جیسی تھی جو

ستمبر۔ اکتوبر سے شروع ہو کر بعد تک جاری رہتی تھی اور نومبر کے وسط میں ختم ہوتی تھی۔ یہ زمانہ دکنی پوربی مانسوں کا ہوتا تھا جن کے ذریعہ جہاز یورپ سے آتے تھے۔ یہی وہ زمانہ بھی ہوتا ہو گا جب جہاز مزید پچھم کی طرف ہوا کے رخ کے ساتھ دکنی ایشیائی سلطنتوں تک جاتے ہوں گے تاہم زیرنظر ادبی سرمائے میں اس قسم کے سفر کا کوئی بیان نہیں ہوا ہے۔ مناسا کی کہانی میں زمیندار کو بھی بیوپاری بتایا گیا ہے گوکہ بعد کے زمانے میں ہمیں دوسرے بیوپاریوں کے نام بھی ملتے ہیں۔(18)

سولہویں صدی کے ختم پر رارہ علاقے کے مکندوم چکرورتی (19) نے ڈنگا کہی جانے والی کشتی کا بیان قلمبند کیا ہے۔ کشتی کو چونکہ دیوتا وسوا کرم تیار کرتے تھے اس لئے تیاری کی تفصیلات اس نے قلمبند نہیں کی ہیں۔ کشتی کی جسامت وہ سوگز لمبی اور بیس گز چوڑی بتاتا ہے جو اٹھارہویں صدی میں مستعمل کشتیوں کے مقابلے میں چھوٹی تھی۔ کسی بھی دستکار کا نام بھی نہیں دیا گیا ہے۔

پندرہویں صدی کے ختم سے ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ بھگیراتی ندی سے سمندر کو جانے والے راستے کا واضح بیان ہوا ہے۔ اس وقت تک چند کی کشتیوں کی تعداد کم ہو کر سات رہ گئی تھی۔ وپرداس کی نظم کا بیوپاری جس کو پندرہویں صدی سے منسوب کیا گیا ہے۔(20) تریوینی اور مزاپور کے مقام گپتی پورا میں رکا تھا نہ کہ سپت گرام کے مقام پر، البتہ وہ زمینی راستے کے ذریعہ تریوینی سے سپت گرام گیا ضرور تھا جہاں اس نے خریداری کی۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں سرسوتی ندی کشتی رانی کے قابل نہیں رہی تھی اور بھگیراتی کا راستہ جیسا کہ اب بھی ہے تریوینی سے گزر کر جاتا تھا۔ سپت گرام شہر جو کہ مقدس شہر تھا تریوینی تک بڑھ چکا تھا۔ تین دریاؤں کے ملاپ کی وجہ سے یہ مقدس شہر تھا اور سپت گرام سے جڑا ہوا بندرگاہ تھا۔ تریوینی اور سپت گرام کو ملانے والا پل علاؤالدین حسین شاہ نے 1506ھ میں بنوایا تھا۔(21) جس کے نتیجے میں سپت گرام اور تریوینی کو جوڑنے کی ضرورت پوری ہوگئی تھی اور جو زمین کے ذریعہ بھگیراتی نالے سے جاملی تھی۔

وپرداس کے یہاں جو بیان ملتا ہے غالباً بندرگاہ کے شہر کا سب سے پہلا بنگالی بیان ہے۔ ایک صدی بعد فرنچ سیاح قلمکار نے وہاں چھتیس ذاتوں اور ان ذاتوں کو پوجا پاٹ کرنے

کی آزادی کا حوالہ دیا ہے۔(22) اس سپت گرام میں ہندوؤں کے معمولات اور شہر میں مغلوں اور پٹھانوں کی موجودگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ وپرداس نے بھی مکانوں کی قطاروں کا بیان کیا ہے۔ ہر گھر شیشے کی طرح چمکتا تھا اور یہ چمک چاندی کے تاروں سے پیدا ہوتی تھی۔ شہر کی دولت نے لکھاری کی آنکھیں چکا چوندھ کر دی تھیں۔(23) تاہم اس نے ایک بار بھی سرسوتی ندی کا ذکر نہیں کیا ہے۔

وپرداس کالی کتا کا بھی حوالہ دیتا ہے(24) جس کا ذکر ایک صدی بعد ابوالفضل نے بھی کیا ہے۔(25) لیکن وپرداس کا حوالہ بطور جہاں 1530ء کے زمانے میں پرتگالی جہازوں سے مال اترا کرتا تھا۔ بتاتا ہے کہ یہ مقام پرتگالیوں کے آنے سے پہلے موجود تھا جو اس مقام پر بڑے جہازوں کو لنگر انداز کیا کرتے تھے اور یہاں سے مال سپت گرام کو بھیجتے تھے۔(26)

وپرداس نے سمندر کا جو بنگالی تصور پیش کیا ہے(27) اور جس کا ذکر بعد کی صدیوں میں دوسروں نے بھی کیا ہے۔(28) بتاتا ہے کہ لکھنے والوں کا تجارتی دنیا سے رابطہ نہیں تھا خصوصاً ان بیوپاریوں سے جو سمندر پار سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ کشتیوں کے حوالوں سے بھی ہوتا ہے جو دریائی اور ساحلی کشتیاں ہوتی تھیں اور رارہ علاقے کے اندر بنائی جاتی تھیں جن کو کئی دریاؤں کے ذریعہ سمندر تک لایا جاتا تھا۔ وپرداس نے جس طرح سمندر اور دریاؤں کے فرق کو محسوس کیا ہے اور بعد کے لکھاریوں نے بھی اس کا حوالہ سمندری پانی کی وسعت اور چال ہے جہاں سمندر میں جہاز لے کر آنے والا جہازی عملے پر خیالی بھوتوں اور سمندری جانوروں کا خوف ان پر طاری رہتا تھا۔ تجارت صرف سیلون اور اڑیسہ تک محدود تھی جن کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ غالباً زیادہ دور کا علاقہ گجرات بھی اس میں شامل ہو گو کہ اس زمانے تک گجرات کے بارے میں لوگوں کی یادیں حیرت انگیز طور پر گہنا گئی تھیں۔ بیوپاریوں کی زندگی جیسا کہ نظر آتا ہے آسان تھی اور سماج پر برہمنوں کو جو تسلط حاصل تھا اس میں ذرا بھی بدلاؤ نہیں آیا تھا۔(29) نظموں کا ویشنو احلقے کی ابتدا سولہویں صدی کے وسط سے ہوئی تھی۔ ان کی ماہیت مختلف ہے اور ان میں ایک دوسری ہی دنیا نظر آتی ہے مگر کہیں زیادہ غیر دلچسپ ہے۔ ان شاعروں کی صف میں پہلا چھدامنی داس ہے جس نے اپنا تحریری کام 49-1548ء میں مکمل کر لیا تھا۔(30) اس وقت تک دکنی رارہ جو بھگیراتی کا زیریں حصہ تھا چیتیانا تحریک کے بہت زیادہ

اثرات کی گرفت میں تھا۔ چھوٹے شہر جیسے بنادوپ، نادیا، کٹوا، سنتی پور، کھاردھا، فولیا اور سپت گرام اب ویشنواؤں کے طاقتور مراکز ہو گئے تھے۔

1538ء میں بنگال پر شیر شاہ کے حملوں کے وقت سے جس کے بعد کچھ دنوں تک غور پر ہمایوں کا قبضہ رہا تھا، بھگیر اتی کا بالائی حصہ بنام برندری، مغلوں و پٹھانوں اور اکثر پٹھانوں اور اڑیا کے مابین محاذ آرائی میں مبتلا رہا تھا۔ غور ان دنوں شدید دباؤ میں تھا جبکہ بنگال کا مرکزی ڈھانچہ جو وسط چودہویں صدی سے آزاد تھا اس محاذ آرائی کی بنا پر کمزور ہو گیا تھا۔ زیریں بھگیر اتی پٹی پر جو چھوٹے شہر تھے ان حالات کے باوجود پھل پھول رہے تھے۔ جس کا بہترین آئینہ بندوپ اور سپت گرام دونوں شہروں کی نشوونما تھی۔ بندوپ ایک بڑا شہر بن گیا تھا۔(31) وسط چودھویں صدی میں بنگال کے سیاسی انضمام کے ساتھ چٹا گانگ۔ سونار گاؤں کا ڈھانچہ ترقی کر گیا تھا جس کی راجدھانی بھگیر اتی کے بالائی حصے پانڈو میں واقع تھی۔ بنگال میں آنے والے چینی سیاح کے بیان اور خصوصاً چٹا نگ۔ سونار گاؤں کا پانڈو تک راستہ ہمیں پیداوار اور بیرونی تجارت کے فروغ کا منظر دکھاتا ہے۔(32) غالباً چٹا نگ کے اطراف ارکان کا ٹکراؤ اس کا سبب ہو گا۔ وسط پندرہویں صدی سے بھگیر اتی کا راستہ زیادہ سے زیادہ استعمال میں آنے لگا تھا۔ اس طرح ہم منگل نظموں کی تخلیق میں مطابقت رکھتے ہیں جو اس راستے، سپت گرام کی ترقی بطور بندرگاہ اور تریوینی تک اس کے رابطے اور غور کے مقام پر ایک راجدھانی کے قیام کا بیان پیش کرتی ہیں۔ راجدھانی کا علاقہ بھگیر اتی تھا گو کہ بڑے جہاز وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔

پندرہویں صدی کے ختم تک زیریں بھگیر اتی پٹی کے بعض علاقے شہر بن گئے تھے مثلاً بندوپ دھیرے دھیرے باہر سے آنے والوں کا مجموعہ ہو گیا تھا جو خصوصاً چٹا گانگ اور سلہٹ سے آئے تھے جہاں سے دوسروں کے ساتھ ساتھ چیتانیا کے بڑے بیوپاری بھی آ گئے تھے۔(33) سولہویں صدی کی ابتدا سے بندوپ ایک چھوٹا شہر ہو گیا تھا جہاں یونیورسٹی تھی جو برہمنی علوم کی تعلیم پر زور دیتی تھی۔ طالبعلموں کی بہت زیادہ تعداد حاصل کرنے کی اس لئے کوشش کی جاتی تھی تاکہ ان سے فیسیں ملیں جن سے اساتذہ کو معاوضے ادا کئے جاتے تھے۔(34) ایک متوسط طبقے کا ابھار جس سے اساتذہ کا بھی تعلق تھا بہت سے شاعروں کو بھی

لایا تھا جن میں سے سب برہمن نہیں ہوتے تھے۔ اصل میں ایک وسیع تر ہندو متوسط طبقہ چودہویں صدی کے متوسط طبقے پیدا ہو گیا تھا جن میں تعلیم یافتہ کائستھ نمایاں تھے اور جو سرکاری اور زمینداری کے انتظامی شعبے میں ملازمتیں کرتے تھے۔ بندوپ کے متوسط طبقے کے کردار کا مقابلہ چیتانیا سے تھا جب اس نے ملازمت پیشہ لوگوں سمیت نچلے طبقے کو اپنی تحریک کے ساتھ جوڑ لیا تھا جس کے نتیجے میں ذات پات کے سخت قواعد وضوابط اور برہمنوں کے تسلّط کو خطرے کا احساس ہوا تھا۔

منگل شاعروں کے برعکس ویشنوا شعرا بھگیر اتی کے تجارت میں مشغول زمیندار بیوپاریوں کے سفر میں حصہ کم نہیں لیتے تھے اس کے برعکس ویشنوا شعرا ان چھوٹے شہروں میں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے چیتانیا مشاغل میں حصہ لیتے تھے۔ باوجود اس نے وسط سولہویں صدی تک بندوپ زیادہ ترقی نہیں کر سکا تھا۔ چھودامنی داس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بندوپ کے برکونا گھاٹ کے پیچھے کھلے ہوئے میدان تھے جن پر بیس برسوں کے دوران مکانات بن گئے تھے جن میں اب مختلف پیشہ ور دستکاروں کا بھی قیام تھا۔ بندوپ کی آبادی میں جیسا کہ ورنداون داس حوالہ دیتا ہے کوی راجاؤں، ویشاؤں جو عموماً بیوپاری تھے، پان کے کھیتوں پر کام کرنے والوں، بیجوں کو دبا کر تیل نکالنے والوں، سوت بننے والوں، باغ کے مالیوں، حجاموں، سناروں، لوہاروں اور سنگیت کاروں موجود تھے۔ (35) اس نے نہ تو سیپیوں سے چیزیں بنانے والوں کا اور نہ شہر کے محلّوں میں تقسیم کا کوئی ذکر کیا ہے۔ اسی طرح پرتگالیوں کا بھی کوئی ذکر وہ نہیں کرتا ہے حالانکہ کم سے کم 1530ء سے بتور کے راستے سے پرتگالیوں نے بھگیر اتی پٹی پر تجارت شروع کر دی تھی۔ (36) جب کہ بھگیر اتی پٹی کا بالائی حصہ سپت گرام تک سیاسی لڑائیوں کی وجہ سے برباد ہو گیا تھا البتہ اس کے زیریں حصے میں پائے جانے والے اول الذکر چھوٹے چھوٹے شہر زوروں پر تھے۔ یہی زمانہ تھا ج چیتنیا کی تعلیمات نے برہمن تسلّط کے شہر بندوپ کو چیلنج کرنا شروع کیا تھا۔ جو ان دنوں سپ گرام کی سرکار میں تھے۔ (سپت گرام = ست گاؤں)۔ بندوپ میں قاضی کو تن تنہا حاکم کا درجہ حاصل تھا اور بہت سے مسلمان بھی ملّا پاڑہ میں رہتے تھے جو کہ ان دنوں کی تحریروں میں حوالہ بننے والا اکیلا علاقہ تھا جو دوسری آبادی سے مختلف تھا۔

قاضی پر چیتنیا کی فتح ایک جانا مانا گیا واقعہ ہے جس کا یہاں دوبارہ ذکر ضروری ہے۔
چیتنیا نچلے درجے کی ذاتوں کے لوگوں اور قریبی علاقوں کے بیوپاریوں جن کی آماجگاہ بھگیراتی کا زیریں علاقہ تھا اپنا دھرم ساتھی بنایا کرتے تھے۔ یقیناً ملازمت پیشہ حلقے اور بیوپاری کمیونٹیاں سخت گیر ذات پات کے قواعد وضوابط سے آزادی چاہتے تھے اس تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ بنگال پر اکبر کے اقتدار کی آمد آمد کے وقت کتنی قوتوں کی ریل پیل تھی۔ بھگیراتی راستے کے استعمال میں اضافہ ہو گیا تھا، بہت سے چھوٹے چھوٹے شہر منظر پر آ گئے تھے، پرتگالی نظر آنے لگے تھے اور دھیرے دھیرے نئے افکار ونظریات پھیل رہے تھے۔ ان سب نے دستکار پیشہ وروں اور بیوپاریوں کے مابین گہرے تعلق کو تحریک دی تھی اور کم سے کم پوری طرح نہ سہی جزوی طور پر تو ذات پات کے سخت گیر قواعد سے آزادی فراہم کی تھی۔

بندوپ کی نشوونما کا منظر ایک اور ویشنو الکھاری کی تحریروں میں زیادہ بہتر نظر آتا ہے۔ اس کا نام ہے جے نند جو 1560ء کا لکھاری ہے۔ بندوپ کے بارے میں بیان کرتے ہوئے کہ وہ بڑا شہر تھا اس نے بہت سے سجے سنورے مندروں اور ان مندروں میں پوجا پاٹ کی آزادی کے حوالے دیئے ہیں۔ گھر اینٹوں کے بنے ہوئے تھے، ان میں دیواریں تھیں اور دروازے بہت اونچے ہوتے تھے۔ یہاں بہت دور دور علاقوں سے مال آتا تھا اور بکتا تھا جس میں کنجی پورم اور کشمیر سے آنے والا مال بھی ہوتا تھا۔ بندوپ میں بیوپاری بھی آباد ہونے لگے تھے۔(37)

بھگیراتی کے نچلے حصے میں اسی زمانے کے دوران دوسرے شہر بھی ترقی کر رہے تھے جن میں سے بیشتر اینٹوں سے ہی بنے تھے۔(38) اور ان میں مندر موجود ہوتے تھے۔ یہ شہر کپڑا بنانے کے بھی مرکز تھے جو غالباً سپت گرام کی منڈیوں میں بھیجا جاتا تھا۔

دویجا بنسی داس کی نظم میں جس کا زمانہ تخلیق کم یا زیادہ 1575ء ہے لیجنڈ ساز سوداگر چند سوداگر کا ذکر ہوتا ہے جو ایک ہی وقت میں زمیندار بھی تھا، مہاجن بھی اور بیوپاری بھی تھا۔(39) یہ کوئی خیالی سوشہ نہیں ہے بلکہ اس کا ذکر 30 اپریل 1559ء کو پرتگالیوں اور باکلا کے زمینداروں کے مابین ہونے والے معاہدے میں ہے۔(40) بنسی داس کی نظم میں نہ تو سپت گرام کا اور کشتیوں کے بنائے جانے کا کوئی ذکر آیا ہے۔ اس سے ہٹ کر ہمیں قاضی اور

ہندوؤں کے درمیان فرقہ وارانہ ٹکراؤ کی ایک تصویر دکھائی دیتی ہے اور قاضی کی زیادتیوں کی تفصیلات بتائی گئی ہیں جو تن تنہا اختیار کا مالک تھا اور اس نے تمام مسلمانوں کو اکسایا تھا کہ وہ برہمنوں کو مسلمان کرلیں۔ اسی زمانے کی منگل نظموں میں اس موضوع پر کسی واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ہوا ہے۔ جو مکندرم چکرورتی نے 1594ء اور 1626ء کے دوران لکھی تھیں۔ مکندرم ضلع ہگلی کے آرام باغ پرگنہ کے دامونیا گاؤں کا خوش حال کسان تھا۔ راجا مان سنگھ کی گورنری کے دوران (41) اس کو اپنا آبائی دیس چھوڑ کر اور دریا پار کر کے پورب کی طرف جانا پڑا تھا۔

ڈھی دار مامود سریف نے (محمود شریف) جس کا تعلق مکندرم ہی کے گاؤں سے تھا زمین کی ناپ شروع کر دی تھی۔ یہ واضح ہے کہ اس قسم کی ناپ (ایک بگھہ = 15 کوٹے) کی ابتدا چھوٹے چھوٹے بگھوں کے زمینی قطعات کے لئے کی گئی تھی مگر ان کی شرحوں میں کوئی کمی نہیں کی گئی تھی۔ اس طریقہ کار نے کسانوں کو برباد کر دیا تھا جس کا شکار مکندرم بھی ہوا تھا۔ غالباً تعلقے دار (بنگال میں تعلقے دار کی حیثیت نچلے درجے کی تھی جب اودھ میں تعلقے دار بڑی حیثیت کا ہوا کرتا تھا) گوپی ناتھ نندی نے اس بدلاؤ کی مزاحمت کی تھی اور اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ روپیہ کی قیمت میں بھی دس آنے کی کمی آ گئی تھی اور گاؤں کے پوڑداروں (بنیوں یا رقم ادھار دینے والے) ہر ادا کئے جانے والے روپیہ یا ٹکے پر ڈھائی آنہ بیاج لینا شروع کر دیا تھا۔ (42) مکندرم نے اس کو ناقابل برداشت حد تک زیادہ قرار دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منڈی معیشت جس میں نقدی لین دین کا رواج تھا بنگال کے گاؤں تک پہنچ گئی تھی۔ مسئلہ اس بنا پر ابھرا تھا کہ مغلوں نے ضبطی نظام کو متعارف کرانے کی کوشش کی تھی اور جس کے لئے زمین کی ناپ ایک لازمی ضرورت تھی۔

زمین کی ناپ اس رواج کا ذکر مکندرم ہی کے ایک اور اقتباس میں ہے۔ شاعر ایک شہر کے قیام کا ذکر کرتا ہے (جس کو خاص طور پر گجرات کہا جاتا تھا) جس کو جنگلوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ کسانوں کو وہاں جا کر آباد ہونے پر اکسانے کے لئے حکام نے پہلے تین برسوں تک کے لئے تمام محصولات ادا کرنے کی چھوٹ بھی دے دی تھی۔ جو کہ نئی بستیاں آباد کرنے کے لئے مغلوں کا پسندیدہ طریقہ تھا۔ یہ بھی کہا گیا کہ زمینوں کی ناپ نہیں کی جائے گی اور جب بھی محصول مقرر کیا جائے گا وہ فی ہل ایک تنکہ (یا ٹکا = روپیہ) ہوگا۔ (43)

ایک ہی شاعر کے اس طرح کی دو تصویروں کے درمیان واضح تضاد زیادہ گہرائی سے توجہ دینے کا متقاضی ہے۔ پہلی تصویر بھاگنے والے کسانوں کی ہے جنہیں دھی دار محمد شریف کے پیادوں (پیدل فوجیوں) نے طاقت کے ذریعہ روکا تھا اور جس نے جوتی گئی اور کھودی گئی زمینوں کو محصولات ادا کرنے والی زمینیں قرار دیا تھا۔(44) روپیہ کی قیمت گرنے کے ساتھ کوئی بھی پیڈی یا گایوں کو خریدنے پر تیار نہیں تھا۔ محصولات کا جمع کرنا بھی بند ہو گیا تھا اور رقم طاقت کے ذریعہ جمع کروانے کا بھی کوئی ذکر کہیں نہیں ملتا ہے۔ گاؤں میں سیال نقدی کا بھی فقدان تھا۔

دوسری تصویر میں ہم ایک شہر کو آباد ہوتے ہوئے پاتے ہیں جس میں مغل طریقہ کار کے تحت زمینوں کا بھی کچھ رقبہ منتقی رہے گا۔ کوئی بھی اس زمین پر کاشت کر سکے گا بشرطیکہ بل رام منڈل سے ان نئے آباد کار کسانوں نے پٹے پر زمین حاصل کی ہو۔

نئے شہر میں گھر بنانے گایوں اور رسوں کو خریدنے کے لئے کسانوں کو پیشگی نقد بھی دیا جاتا تھا۔ نئی آبادکاری کو سلامی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا اور پیڈی کو بیچنے پر لاگو ٹیکس کا بھی خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ کائستوں کو وہاں آباد ہونے کی اجازت مل گئی تھی اور ان کی زمینوں کی حد بندی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔(45) یہ اقدام یوں ضروری سمجھا گیا ہوگا کہ کائستوں کی زمینوں کی حد واضح طور پر متعین رہے کیونکہ اوائل سترہویں صدی کے ماخذ ہمیں بتاتے ہیں کہ کائستھ چونکہ سرکاری ملازمتوں میں تھے اس لئے ان کے اثرات تھے اور ان کے بارے میں سب ہی کو معلوم تھا کہ وہ بہت لالچی ہوتے ہیں۔(46)

اب یہاں ہم اس مسئلے پر پٹن رائے چودھری کے حوالے سے بات کر سکتے ہیں جنہوں نے بعض تفصیلات کے ساتھ اس نظم سے استفادہ کیا ہے۔(47) انہوں نے اس کا موازنہ دو سترہویں صدی کے ماخذ کے ساتھ وضاحت سے کیا ہے اول بہارستان غیبی اور دوم فاتحیا ابریا۔ ان ماخذ کی بنیاد پر رائے چودھری لکھتے ہیں کہ مغل فتح سے پہلے کے زمانے میں بنگال میں زمینوں کی ناپ کا کوئی رواج نہیں تھا۔(48) بنگال میں ان دنوں موجود کائستوں کے لالچی مزاج کے تناظر میں دیکھیں تو اس رائے کو ماننا مشکل ہو جاتا ہے۔ مکندرم کے نقطہ نظر سے بھی یہ صحیح لگتا ہے جس نے مان سنگھ کی نگرانی میں زمینوں کی ناپ کے طریقہ کو متعارف کرانے کی

مخالفت کی تھی اور تمام مصیبتوں کی جڑ اسی طریقے کو قرار دیا تھا۔اس نے واضح طور پر یہ بھی کہا کہ اس کے خواب نگر میں ناپ کا ایسا کوئی طریقہ نہیں ہوگا۔(49)

اواخر سولہویں صدی کی تاریخ بنگال میں مکندرم کی دین ایک دوسرے نقطہ نظر سے بھی اہم ہے۔نظم میں ان بیوپاریوں کا ذکر کسی خصوصیت کے ساتھ نہیں ہے جو ان لوگوں میں تھے جنہوں نے گجرات کے داستانی (لیجنڈری) شہر میں آکر آبادیاں بنائی تھیں۔اس نے جن لوگوں کا ذکر کیا ہے ویشنوا تھے جو ویشنوا ہونے کے ساتھ ساتھ مہاجن بھی تھے۔(50) ان میں بیشتر کسان بھی تھے اور کچھ پھیری والے تھے جو قیمتی پتھر یا جواہرات بیچا کرتے تھے۔گجرات کے ویشنو وہاں خریداری اور بیچنے کے مشاغل سے بہت خوش تھے۔مکندرم کے ایک اور بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں بنگالی بیوپاریوں کا سمندر پار بیوپار کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا۔وہ کہتا ہے کہ سپت گرام کے بیوپاری کہیں نہیں جاتے ہیں بلکہ اپنے ہی گھر میں بیٹھے بیٹھے اپنا سارا منافع کما لیتے ہیں۔(51) ایک اور مرحلے پر کہتا ہے، سپت گرام رارھ کے علاقہ میں واقع ہے اور ایک حسین شہر ہے مگر ڈاکوؤں کا یہاں ہجوم ملتا ہے۔(52) اس کے بیان میں نہ مبالغہ آرائی ہے اور نہ اپنی ذاتی ناپسندیدگی کا وہ اظہار کرتا ہے۔ایک معاصر یاتری کے بیان کی رو سے غور اور سپت گرام کے درمیان کا پورا علاقہ گھنے جنگلوں میں رہنے والے چوروں سے بھرا ہوا ہے۔(53) اس کا یقینی نتیجہ تھا کہ سپت گرام اور غور کے بیچ راستہ بند ہوگیا تھا اور غور کا بھی زوال ہوگیا تھا۔

معاصر منگل شاعروں میں مکندرم نے ہمیں بیوپاریوں کے بارے میں بہت معلومات فراہم کی ہیں گو کہ اس نے سوداگروں، بانک اور بپاری (بیوپاری) کے مابین فرق کا زیادہ ذکر نہیں کیا ہے۔دھنیت سوداگر کے باپ کی سرادھ رسم میں بیوپاریوں کو حصہ لینے کا نیوتا دیا گیا تھا جن کی فہرست مکندرم نے قلمبند کی ہے۔ان میں دھس دت بنیا جس کا تعلق بردوان سے تھا، چمپی نگر کا چند سوداگر، گھوڑے پر بیٹھ کر آنے والا لکشمی سوداگر، نیلمبر داس، اپنے آٹھ بھائیوں سمیت بنود نسکر، گنیش پور کا سناتن چند، مع اپنے دو بھائیوں کے (گوپال اور گوند)، دس گھرا سے بسولا، سپت گرام سے سری دھر ہزر، بشنودت (سات بھائیوں سمیت جو پالکیوں میں بیٹھ کر آئے تھے)۔جت بیندر داس کیٹی سے، جگرام سے رگھودت، ٹیگھارا سے گوپال دت (بنیا)، تریوینی سے رام رے، (نو بھائیوں سمیت)، لاگا سے رام دت، لنکن سے چندی داس

خان، ست گھارا سے رام دا (بنیا)، بشن پور سے بھگیا بنت خان (بنیا)، خان دا گھوشا سے باسودت، گیتان سے مادھودت (مع چار بھائی) اور دھن پتی کا سسر لکشمی پتی، شامل ہیں۔ سات سوبانک بھی آئے تھے۔(54) ظاہر ہے کہ ایک ہندو مذہبی رسم میں مسلمان بیوپاری مدعو نہیں کیئے گئے تھے تاہم نظم بتاتی ہے کہ مسلمان بھی زیادہ تر بیوپاری تھے اور مختلف ہفتہ واری بازاروں سے تجارتی رابطے میں رہا کرتے تھے۔(55) تعجب کے ساتھ مکندرم شہر گاور کا بھی حوالہ دیتا ہے جو کئی موقعوں پر آیا ہے گوکہ جس زمانے میں وہ لکھ رہا تھا گاور غالباً ختم ہو چکا تھا۔ بیوپاری دھن پتی چڑیوں کا پنجرا لینے کے لئے گاور گیا تھا جو وہاں بنائے جاتے تھے۔(56) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دستکار وہاں تھے اور ان کا خاتمہ نہیں ہوا تھا گویا وہی گاور کو آباد کیئے ہوئے تھے۔حتیٰ کہ گاور میں دھن پتی نے جس طرح سے زندگی بتائی تھی اس بات کی تصدیق نہیں کرتی ہے کہ اس سے پہلے وہاں وبا پھیلی تھی۔(57) اس تناظر میں ہمیں گاور کی اصل صورت حال کے بارے میں رائج نقطہ نظر پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔راجدھانی اگرچہ منتقل ہوگئی تھی مگر شہر مکمل طور پر ختم نہیں ہوا ہوگا۔تاہم مکندرم نے بیوپاریوں کی جو فہرست دی ہے اس میں گاور شہر کے کسی بھی بیوپاری کا نام نہیں ہے۔پچھمی بنگال کی طرف کا بھی کوئی نام فہرست میں نہیں ہے۔

بھگیراتی کے راستے کے نقطہ نظر سے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ نظم 1594ء کے آخری مرحلے میں لکھی گئی تھی۔مکندرم کے یہاں بھگیراتی پور بھستالی سے جہاں مان سنگھ نے اپنی کشتیوں کو لنگر انداز کیا تھا پچھم کی طرف مڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔مکندرم کے ہیرو سوداگر نے بھی یہیں اپنی کشتیاں لنگر انداز کی تھیں۔(58) چودھامنی داس کے زمانے سے دریا نے اپنا راستہ نہیں بدلا تھا۔

مکندرم نے سپت گرام کی دولت کا بھی بیان قلمبند کیا ہے۔ جب کہ اس کا داستانی بیوپاری بھگیراتی میں تریوینی کے مقام پر اپنی کشتیاں لنگر انداز کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مکندرم نے نہ سرسوتی ندی کا اور نہ ہگلی کا ذکر کیا ہے جو اکبر کے فرمان کے تحت حال ہی میں پرتگالی فوج نے قائم کیا تھا اگرچہ وہ دوسرے کنارے کی طرف گارِفا کا ذکر کرتا ہے۔تریوینی کی مخالف سمت میں مکندرم ہاپشار کا حوالہ دیتا ہے۔(59)

تروینی زیادہ آبادی والا شہر ہو گیا تھا جہاں لاکھ کی آبادی تھی۔ چونکہ اسے مقدس پاپوتر

مقام کا درجہ حاصل تھا کیونکہ وہاں تین دریاؤں کا ملاپ ہوتا تھا جو ساتھ ساتھ بہتی تھیں۔ جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا جا چکا ہے وہ سپت گرام سے اپنے بندھن کی وجہ سے اہم شمار کیا جاتا تھا۔ مکندرم کا بیوپاری بھگیر اتی میں تریوینی کے مقام پر دو دن ٹھہرا تھا اور سپت گرام سے اپنی خریداری کی تھی۔(60) باوجود کہ سرسوتی میں مٹی کیچڑ بھر جانے کے جس کی بنا پر راستے کو پورب سے پچھم کی طرف تبدیل کرنا پڑا تھا سپت گرام ہندستان کے ہر علاقے سے بیوپاری برابر آتے تھے جن میں وجے نگر کے علاوہ دور و دراز علاقہ ملایا بھی شامل تھا۔(61) یہ اس نقشے سے ٹکراتا ہے جو جواڈی باروس کا تھا (مطبوعہ 1615ء) جس بھگیر اتی کے علاوہ سرسوتی ندی کا راستہ بھی دکھایا گیا ہے۔(62)

راستے کا جو بیان مکندرم نے لکھا ہے بتاتا ہے کہ بھگیر اتی اپنے پرانے راستے ہی پر چل رہا تھا (نہ کہ موجودہ) جس کے ساتھ کالی گھاٹ، بتور اور چٹا گانگ واقع تھے۔ اس کے یہاں کالی کتا کا بھی ذکر ہے۔(63) جو کہ ظاہر ہے کہ ان دنوں ایک گاؤں تھا۔ اس کی اہمیت البتہ بڑھ رہی تھی جیسا کہ ابوالفضل نے اپنے آئین اکبری میں بھی لکھا ہے۔(64) راستے کے اطراف ایسے نمایاں مقامات بتاتے ہیں کہ بیوپاری کچھ عرصے تک اس راستے کو اکثر استعمال کیا کرتے تھے۔ شروع زمانے کی نظموں اور بعد کی نظموں کے درمیان صرف یہ فرق ہے کہ بعد میں زیریں بھگیر اتی میں بہت سی نئی آبادیاں آباد ہو گئی تھیں جن کے ماخذ کا ذکر وپر داس کی نظموں میں ہوا ہے جن میں چت پور، کالی کتا اور کالی گھاٹ کے حوالے ملتے ہیں۔

شروع اور بعد کی نظموں کے درمیان دوسرے فرق یہ ہے کہ مکندرم ایک سے زیادہ موقعوں پر پرتگالی سمندری ڈاکوؤں کا ذکر بھی کرتا ہے (ان کو وہ ہرماد کہتا ہے جو ظاہر ہے کہ لفظ آرماد سے مشتق ہے۔ تاہم اس نے ان مقامات کو اڑیسہ کی سمت کی طرف زیادہ دکھایا ہے۔ حالانکہ وہ ٹھیک بھگیر اتی کے دہانے پر واقع تھے۔(65) چونکہ کوئی بیان نہیں قلمبند کیا گیا ہے۔ ہم فرض کر سکتے ہیں کہ مکندرم کا ان لوگوں کے ساتھ کوئی ذاتی جھگڑا نہیں تھا۔ ہمد اس کی موجودگی سے قطع نظر سمندر کی طرف جانے والے راستے میں کوئی خاص گڑ بڑ کہیں نہیں تھی مگر بھگیر اتی کے بالائی حصوں کے حوالے سے مکندرم اس قسم کی گڑ بڑ کا ذکر کرتا ہے۔ وپر داس کے زمانے سے جس قسم کے جہاز استعمال تھے ان میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا تھا۔ سمندر کے ساحلی

جہازوں کے لئے مکندرم نے بھی ڈنگا کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اپنے خیالی شہر گجرات میں مکندرم نے مختلف ہندو مسلمان دستکاروں اور ملازم پیشہ وروں کی فہرست شمار دی ہے۔ اس بیان کو عبدالکریم نے بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔(66) اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ مکندرم بنگال میں بہ یک وقت دو متوازی قوتوں کے نظم کی کارکردگی کا منظر دکھاتا ہے۔ منڈی معیشت کی موجودگی کی نشاندہی کرتا ہے جو نقد اور تبادلے کے طریقہ کار کی بنیاد پر قائم تھی۔(67) اس کے شہر گجرات میں مختلف پیشہ ور گروہوں کا وقوع جن کے چاروں طرف کوئی دیوار نہیں ہے مضافات میں دکھایا گیا ہے۔ یہ تصویری خاکہ معاصر گاور کے اس تصویری خاکے ہی جیسی ہے جن کو ہم معاصر پرتگالی ماخذ میں دیکھتے ہیں۔(68) چھوٹے پیانے پر یہ تصویری خاکہ ویشنوا ماخذ میں موجود بندوپ کے تصویری خاکے جیسا ہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مکندرم دستکاروں کے نجات کے لئے کوئی نظریہ نہیں پیش کرتا ہے۔ جن سے اس کا کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے دستکاروں کی سخت گیر برہمنی قانون سے آزادی حاصل کرنے کی خواہش کے بیان کی کوشش کی ہے جو گجرات شہر میں حاوی رہے تھے۔ رنڈیاں تھیں جن کو شہر کے ایک کنارے پر آباد ہونے کی اجازت دی گئی تھی اور وہ منڈی کے نظم کا ایک حصہ تھیں۔ یہ نقشہ مکندرم کے شہری منصوبے میں ہے۔(69)

اس شہر کے پیشوں کی تفصیلات بھی پیش کی گئی ہیں۔ یہاں ہفتہ وار بازاریں لگتی تھیں جن کو ہت کہا جاتا تھا۔ یہ شہر کے اندر لگتی تھیں اور جہاں خریداری اور فروخت کے ذریعہ روٹی روزی حاصل کرتے تھے۔ دریا کو پار کرنے کے لئے بھی کشتی بان کو شاہی ٹیکس جمع کرانا ہوتا تھا۔ گھاس کاٹنے والے یا گھسیارے چند کوڑیاں لے کر گھاس کاٹ دیتے تھے۔ جب کہ شہر کے ایک طرف آباد درزی تنخواہ پر کام کرتے تھے۔ تنخواہ کا معاملہ غیر واضح ہے اور اس کی وضاحت صرف ان دولت مند گھرانوں ہی کے حوالے سے ممکن ہے جن کے یہاں متعین معاوضے پر درزی کام کے لئے رکھے جاتے ہوں گے مگر بیان میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

مٹھائیاں بنانے والے خود ہی اپنی مٹھائی لے کر گھروں کے دروازوں پر جاتے تھے اور اسے بیچتے تھے۔(70) پیداوار کا دستکار نظام اس منڈی معیشت میں فعال تھا۔ یہ دستکار عموماً مضافات میں رہتے تھے جو شہر ہی کی حدود میں ہوتے تھے۔ لیکن کچھ پیشہ ور گروہ بعض وجوہات

کی بنا پر شہر سے باہر بھی رہتے تھے جن کا بیان بہت واضح نہیں ہے۔ ملنگی لوگ باہر ہی رہتے تھے اور اپنی روزی نمک بیچ کر کماتے تھے۔ ان کو مقامی مَل کہتے تھے۔ ان کی جڑت چونکہ چنڈالوں کے ساتھ اس لئے ان کو شہروں سے باہر رہنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ بعض پیشہ ور گروہ اپنی اضافی آمدنی کے لئے دوسری چیزیں بھی بنایا کرتے تھے۔ ڈم جو چتا جلانے کے لئے لکڑی جمع کرتے تھے بھوسے کی ٹوپیاں (ہیٹ) بھی بناتے تھے جو کسان پہنا کرتے تھے۔

مکندرم جیسا کہ نظر آتا ہے بعض پیشہ ور گروہوں کو ناپسند بھی کرتا تھا۔ سبران بانکوں کے حوالے سے جو سونے کے زیورات کا بیوپار کرتے تھے اس نے لکھا کہ وہ خرید و فروخت تو بہت کم کرتے تھے لیکن لوگوں کی دولت کو ہتھیانے کا گر جانتے تھے۔ ویدوں (ڈاکٹروں) کا معاملہ بدترین تھا۔ وہ جب کسی مریض کی تشویش ناک حالت کو محسوس کر لیتے تھے تو بھاگ جاتے تھے۔ (71) اس طرح یہ صحیح ہوگا کہ گجرات شہر میں بطور ایک اہم جزو کے متوسط طبقہ منظر پر آ چکا تھا۔ (72) کائستھوں کی آمد جو سب ہی پڑھے لکھے تھے اس حقیقت کے گواہ ہیں۔

ایک اور سماجی معمول جس کی طرف توجہ ضروری ہے جاج مانی کا نظام تھا جو شہر گجرات میں رائج تھا۔ مکندرم نے برہمنوں کے مختلف حلقوں کی آمد کا بھی بیان قلمبند کیا ہے جن کے سات سو طالبعلم برہمن بھی تھے۔ ایک اور حوالہ سند ہے کہ داستانی (لیجنڈری) بیوپاری گاور ملک میں رہتا تھا۔ (گاور شہر میں نہیں) اس کا نام برندری تھا۔ ان میں سے بعض برہمن پوجا پاٹ کی رسم سیکھنے کے بعد کیونکہ ان معاملات میں زیادہ برہمن ناخواندہ تھے وہ جاج مانی کی رسم شہر میں ادا کرتے تھے اور ان کو بہت سی چیزیں (73) جیسے مٹھائیاں، چاول، دہی اور تیل بطور معاوضہ دیا جاتا تھا۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ یہ بتاتا ہے کہ گاور کے زوال کے بعد شہر کے ختم ہونے کا سلسلہ جاری تھا اس میں جاج مانی نظام کی وہ حد نظر آتی ہے جو منڈی معیشت کے تانے بانے میں موجود تھا۔ گو کہ یہ دونوں ہی قوتیں اکثر باہم متضاد کردار کی حامل ہوتی تھیں۔ تضاد کی یہ حالت کل ہندستان کی صورت کے عین مطابق تھی جہاں اس زمانے میں نقد لین دین، روپے کی معیشت اور متوسط طبقہ منظر عام پر آ رہے تھے۔ (74)

ترقی کا یہ بہاؤ نہ ہی یکساں تھا اور اس کا پھیلاؤ پورے بنگال کا احاطہ کرتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہنر مندی صرف چند شہروں کے اندر ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ مثال کے طور پر

مکندرمؔ بتاتا ہے کہ کس طرح سری منت رارہ کے علاقوں میں چڑیوں کا پنجرہ حاصل نہیں کرسکا اور اسے گاؤں شہر جانا پڑا تھا جہاں اس کام کے کرنے والوں نے اسے پنجرہ بنا کر دیا تھا۔(75) مکندرمؔ نے مسلمان گروہوں، ان کے پیشوں کا بھی ذکر کیا ہے اور مسلمانوں سے کسی نفرت کا اظہار نہیں کیا تھا جیسا کہ اوائل کے ویشنوا اور منگل شاعروں کے یہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔ درنداون داسؔ نے بندوپ کے قاضی اور چیتانیا کے درمیان مشتعل ٹکراؤ کا حوالہ دیا ہے جس کے نتیجے میں قاضی کے گھر کے باہری حصے میں آگ لگا دی گئی تھی۔(76) وجے گپتا نے بھی قاضی کے ساتھ جھگڑوں کے حوالے دیئے ہیں جس سے ہندو بہت نفرت کرتے تھے۔(77) کچھ وقت کے بعد اوائل سترہویں صدی میں جب ہم کرشن داس کوی راج (78) تک پہنچتے ہیں تو قاضی اور چیتانیاں کے درمیان دنگل محض ایک زبانی لڑائی سے زیادہ نہیں رہا تھا اور قاضی محبت سے چیتانیا کو اس حقیقت کے تناظر میں کہ اب قاضی اور چیتانیا ایک ہی گاؤں سے آئے تھے اپنا بھتیجا کہنے لگا تھا۔ اس قسم کی محاذ آرائیوں کا خاتمہ جب کہ ہم اکبر کے زمانہ اقتدار کے اواخر میں دیکھتے ہیں۔ بتاتا ہے کہ پلٹتی بڑھتی ہوئی معیشت نے سماج کے مختلف و متضاد گروہوں کے مابین زیادہ مضبوط ربط و اشتراک پیدا کر دیا تھا۔ بنگالی کلچر کی نشوونما جس کو بہت مہارت سے دوسروں کے علاوہ پٹن رائے چودھری اور عبدالکریمؔ نے یکجا کیا ہے جس کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی لفظوں سے ملی ہوئی بنگالی زبان بھی نشوونما پا رہی تھی جس میں وقت گزرنے کے ساتھ دھیرے دھیرے پرتگالی الفاظ بھی آن گھسے تھے اسی مربوط اور ایک جیسے کلچر کی موجودگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ بنگال میں سلطنت کے دور کے اواخر میں ہمیں مذہبی نفرت کا جو منظر دکھائی دیتا ہے وہ اصل میں سیاسی اور معاشی بحران کا ایک شاخسانہ تھا۔ سیاسی میدان میں شیر شاہؔ کی فتح اور افغان۔ مغل محاذ آرائی نے ایک نراجی حالت کو جنم دیا تھا جس کا نتیجہ بھگیراتی علاقے کی بالائی پٹی میں شہری زندگی کا زوال اور سمٹاؤ کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ اقتصادی قلمرو میں ہندستانی سمندر اور خلیج بنگال پر پرتگالیوں کا نمایاں کردار نے بنگالی بیوپاریوں کے سمندری مشاغل میں سخت رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں۔ اکبر کے اقتدار کے ختم تک پچاس برس کے دوران ہندستانی بیوپاریوں نے کثرت کے ساتھ پرتگالیوں کے جال سے دور بھاگنے کی ہی کوشش کی تھی۔ بنگالی بیوپاریوں نے اگرچہ وسط سترہویں صدی تک اپنے تجارتی مشاغل کی

ازسر نو ابتدا نہیں کی تھی ہندستان سے باہر کے بہت علاقوں کے بیوپاری بنگال میں بہت زیادہ تجارت کرر ہے تھے۔مکندرام اور وپرداس کے بیوپاریوں کا تعلق گندھابنک گروہوں سے تھا جو سری لنکا، اوڑیسہ اور امکان ہے کہ گجرات چلے گئے تھے۔وہ اپنے ساتھ مصالحہ جات، پھل اور بعض بھیڑیں، گھوڑے اور سوتی کپڑے بھی لے گئے تھے جو اس وقت تک برآمد کی اہم اشیاء نہیں بنی تھیں۔ان اشیاء کے عوض تبادلے میں وہ قیمتی پتھر یا جواہرات خصوصاً سری لنکا سے ہیرے، گھوڑے اور مختلف قسم کے مصالحہ جات لیتے تھے۔وہ لے کر واپس نہیں آتے تھے۔بعض درآمدی اشیاء کو دوبارہ سپت گرام سے برآمد کیا جاتا تھا۔صرف سمندر ساحل کی پٹی کا بیوپار تھا جس نے بنگالی بیوپاریوں کی کارکردگی کو سنبھالا دیئے رکھا تھا۔اس لئے مکندرام نے سپت گرام کے بیوپاریوں کو گھروں میں بیٹھا ہوا دیکھا تھا جہاں وہ اشیاء سمندر پار سے آنے والوں کو بیچا کرتے تھے۔

طویل کشمکش نے بنگال کے مرکزی اقتدار کو کمزور کر دیا تھا جس کے نتیجے میں 1570ء کے دوران پچھمی بنگال میں نیم خودمختار زمینداروں نے جگہ بنالی تھی جو دولت لوٹنے والے پرتگالیوں کی مدد سے خوب پھلے پھولے تھے۔یہ پرتگالی چاول، سوتی کپڑوں اور مصالحہ جات کی تجارت کرتے تھے۔(79) سپت گرام اور گاور کے مسلمان آبادی والے شہروں کو زیریں بھگیراتی کے حصے میں بننے والے چھوٹے شہروں نے ہٹا دیا تھا۔اس تناظر میں دیکھئے تو اصل میں یہ زمانہ تضادات، بدلاؤ اور بعض قوتوں کے ابھار کا تھا جو اکثر باہم ایک دوسرے کے ساتھ دست وگریباں رہا کرتی تھیں۔مکندرام جیسا متوسط طبقے کا بنگالی ناخوش نہیں تھا اور وہ مان سنگھ کا قصیدہ خوان تھا۔(80) جبکہ ایک دوسرے ہندو شاعر نے اکبر کے قصیدے گائے تھے۔(81)

حوالہ جات

1- استوش بھٹاچاریہ۔ بنگلا منگل ساویرا اتہاس۔ کولکتا 1964ء

2- پتن رائے چودھری۔ بنگال انڈر اکبر اینڈ جہانگیر۔ دہلی دوسرا ایڈیشن 1969ء

3- عبدالکریم، بنگلار اتہاس۔ سلطانی عمل۔ ڈاکا دوسرا ایڈیشن 1967ء

4- سکھ مائے مکھوپادھیائے، بنگلا ساہتیر پراچین کویدار پرتیچے وسماج۔ کولکتا 1987ء مزید اس کی کتاب مسلمان ادھیکارادی پربا۔ کولکتا۔

5- انل چندر بندوپادھیائے۔ مدھیہ یوگر بنگلا و بنگالی۔ کولکتا۔ 1986ء

6- آستوش بھٹاچاریہ۔ بائس کو پرمناسا منگل۔ کولکتا یونیورسٹی 1962ء

7- سکمارسین۔ بنگلا ساہتیر اتہاس (II) کولکتا 1978ء۔ ص 12-14

8- بائس کوی۔ تعارف ص 25-27

9- ایضاً۔ ص 28

10- ایضاً۔ ص 29

11- ابوالفضل۔ آئین اکبری۔ ترجمہ جیرٹ اور مفسر جے۔ جادو ناتھ سرکار۔ کولکتا 1978ء (II) ص 154

12- یہ بعد کے سینا خاندان کی سلطنت تھی۔ مفصل بیان کے لئے دیکھیں نہار رنجن رے بنگالیر اتہاس۔ کولکتا۔ 1949ء ص 364-80

13- بائس کوی ص 32-36

14- سکھ موائے مکھوپادھیائے۔ بنگلا ساہتیر تھتھیا و کالا رام۔ کولکتا 1988ء دوسرا ایڈیشن ص 1-4

15- وجے گپتا، پرم پران، جے۔کے۔داس گپتا ایڈیشن۔کولکتا یونیورسٹی 1962ء
ص238-42

16- ایضاً۔ص238-42

17- بائس کوی ص129-32۔میترا نے چودہ ڈنگوں کا ذکر کیا ہے۔

18- ایضاً۔ دوجا بنسی داس، مناسا منگل۔اس نے اسے 1575ء میں مکمل کیا تھا گو کہ بھٹاچاریہ اسے سترہویں صدی کے اواخر سے منسوب کرتے ہیں۔اس نے بیوپاریوں کے نام دیئے ہیں۔

19- مکندرم چکرورتی۔کوی کان کن چندی۔الہ آباد۔ 1921ء (دوسرا ایڈیشن)
ص227-229

20- بائس کوی۔ص147-150

22- Shamsuddin Ahmed, Inscriptions of Bengal, Rajshahi, 1960, pp.173-76.

22- ونسنٹ لی بلین۔لیس وائجیز فارمیوکس۔1948ء ص126-29

23- بائس کوی ص148-149

24- ایضاً۔ص150

25- آئین اکبری (II) ص154

26- سیزر فریڈریکی۔ 1573ء اور 1581ء کے درمیان (پرچار ہز پلیگر یمج میکلے ہاوز ایڈیشن۔ایڈنبرگ (V) ص410)

27- بائس کوی ص153

28- دوسرے لکھاریوں میں دیکھیں کیتاک داس کھیم چند۔ایضاً۔ص159

29- وجے گپتا، دوسروں کے ساتھ برہمنی خداؤں اور جانوروں کی قربانی کا حوالہ دیتا ہے۔

30- چودھامنی داس۔گورنگ وجے۔کولکتا۔

31- پی۔سی۔بگچی۔ پولیٹیکل ریلیشنز بیٹوین بنگال اینڈ چائنا اِن دی پٹھان پیریڈ۔ وسوا۔

بھارتی اینلو 1945ء(1) ص 134-96

32- جے۔نند چیتنیا منگل، کولکتا 1971ء ص 11-10 ورنداون داس، چیتنیا بھگوت بندوپ۔
تیسرا ایڈیشن ص 161

33- ورنداون داس۔چیتنیا منگل۔کولکتا 1971ء ص 11-10

34- ایضاً۔ص 11

35- ایضاً۔ص 41-230

36- جے۔جے۔اے کومپوس نے 1535ء میں سپت گرام میں پرتگالیوں کی آمد بتائی ہے۔گو کہ اس نے تجارت کے بارے میں کوئی بات نہیں لکھی ہے۔ہسٹری آف پروتیوگیزان بنگال، ہندستانی ایڈیشن۔پٹنہ 1979ء ص 37

37- جے۔نند۔ص 12-11

38- ہری چرن داس۔ادوائیت منگل۔بردوان یونیورسٹی 1966ء

39- بائس کوی۔ص 85-58

40- جادو ناتھ سرکار ایڈیشن، ہسٹری آف بنگال۔ڈھاکا یونیورسٹی 1972ء دوسرا ایڈیشن (پہلا 1948ء)(II) ص 358

41- مکندرم کی لڑائی کی تاریخ اور اس کی تحریر کی تاریخ پر بحث کے لئے دیکھیں سکھ موائے مکھو پادھیہ۔بنگلہ ساہتیر۔ص 68-150

42- مکندرم ص 5-4

43- ایضاً۔ص 91-85

44- ایضاً۔

45- ایضاً۔

46- کرشن داس کوی راج سری چیتانیا چریتا مرتا۔باسومتی ایڈیشن (نویں چھاپ)
ص 201-200

47- پٹن رائے چودھری۔ریونیو ایڈمنسٹریشن آف بنگال ان ارلی ڈیز آف مغل رول۔

سے جے۔ایس۔بی۔XVII(1)1951ء 61-51

48- ایضاً۔ص 58

49- مکندرم ص 85

50- ایضاً۔ص 58

51- ایضاً۔ص 201۔سپت گرام کے بپار کے لئے جہاں تمام ہندستان اور سمندر پار ملکوں سے بیوپاری آتے تھے اور اپنے جہازوں کو لے کر آتے تھے۔

52- ایضاً۔ص 73

53- رالف فچ جس کا مضمون فوسٹر کی کتاب کے ایڈیشن ارلی ٹریولیز اِن انڈیا، ہندستانی ایڈیشن 1985ء۔ص 25۔اس میں فچ نے غور کے بجائے ٹنڈا کا ذکر کیا ہے۔

54- مکندرم، ص 179

55- ایضاً۔ص 181

56- ایضاً۔ص 134

57- وہاں شطرنج کے کھیل میں اس نے سال بھر گزارا تھا۔ایضاً۔ص 134

58- ایضاً۔ص 200

59- ایضاً۔ص 201 عرفان حبیب نے اپنے نقشے میں اسے حویلی شہر لکھا ہے۔اٹلس آف دی مغل ایمپائر۔دہلی 1982ء ورق 7111۔

60- مکندرم ص 201

61- ایضاً۔

62- دیکھیں سوسان گوے کی کتاب ''انڈیا ودھ اِن دی گینجز'' دہلی 1983ء ص 117 مطبوعہ نقشہ۔

63- مکندرم 201، 1560ء کے دوران لکھتے ہوئے جے نند کالی کتا کا ذکر نہیں کرتا ہے۔ سترہویں کے اختتام کے لگ بھگ سیتل منگل میں دیکھی کالی کتا کا ذکر ہے (سیتارائن۔۔۔ بھٹاچاریہ۔کوی کرشنارام داسیر گرنتھابلی۔کولکتایونیورسٹی 1958ء، 267)

64- آئین II ص 154

65- مکندرم ص 205 اس نے ملک دراود جانے کے لئے دریا پار کی تھی۔

66- عبدالکریم، سوشل ہسٹری آف دی مسلمز اِن بنگال۔ دوسرا ایڈیشن۔ چٹا گانگ 1985ء

67- پتن رائے چودھری نے اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے تعارف میں اس کو مانا ہے۔ ص 33-32

68- جی۔ باوچون اور ایل۔ پی۔ تھامز ایڈیشن، وانج ڈانس لیس ڈیلٹاز ڈوگنگے ایٹ دیل ارراوڈی۔ 1521ء پیرس 1986ء جس میں برٹو کے مبصّر کے بارے میں بیان شامل ہے۔ (مبصّر = مترجم اور منسر)

69- مکندرم ص 91

70- ایضاً۔ ص 91-90

71- ایضاً۔ ص 91-88

72- دیکھیں مختصر بحث رائے چند چودھری کی کتاب میں ص 196۔ جس میں اس نے بنگال میں متوسط طبقے کی موجودگی کو مانا ہے یعنی اس زمانے میں اور جو کردار کے اعتبار سے موجودہ زمانے کے متوسط طبقے سے مختلف تھا۔

73- مکندرم۔ ص 87

74- اقتدار عالم خاں۔ صدارتی خطبہ، میڈویل انڈیا سیکشن۔ پروسیڈنگز آف دی انڈین ہسٹری کانگریس۔ علی گڑھ 1975ء ص 141-113

75- مکندرم۔ ص 134

76- ورنداون داس۔ ص 805-802

77- وجے گپتا۔ ص 25-121

78- کرشن داس کوی راج ص 73-71

79- زمیندار کے بارے میں پتن رائے چودھری کا نقطۂ نظر صرف مہاجن کے کردار تک محدود تھا (ص 34-32)۔ ظاہر ہوتا ہے کہ پچھمی بنگال کے زمیندار داؤد کرانی کی ہار کے فوراً

بعد اپنے ہم عصر پوربی بنگال کے زمینداروں سے مختلف عمل کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ (دیکھیں شہریا نے انداز اور 16 ویں صدی کے اواخر میں بنگال کے سماجی تغیرات پر میرا مقالہ جو اے۔رے اور چٹر جی کے اڈیشن مدھیہ یوگر بنگالی سماج و سنسکرتی۔ کولکتا 1992ء ص 86-61 پر ہے)

80- مکندرم۔ص 3-2

81- دو یجا مادھو۔1600ء سے پہلے ایس مکھو پادھیائے کی کتاب مدھیہ یوگر بنگلا میں شامل ص 158

❁❁❁❁❁

ماہنامہ بدلتی دنیا کراچی

ایڈیٹر: ہدایت حسین

جوائنٹ ایڈیٹر: پروفیسر ریاض صدیقی

رابطہ آفس: 513 یونی شاپنگ سینٹر عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی

اکبر کے زمانۂ اقتدار کے دوران سکھ تحریک

جے۔ ایس۔ گریوال

عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ گرو نانک جی نے جس سماجی مذہبی قوم کی بنیاد قائم کی وہ اکبر کے زمانہ اقتدار کے ختم تک ریاست کے اندر ایک ریاست ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود سوال اپنی جگہ ہے کہ کیا اس رونما ہونے والی پیش رفت اور اکبر کی قائم کی ہوئی مغل ریاست کے درمیان کوئی تعلق تھا یا نہیں تھا۔ سکھ مورخوں نے اس سوال پر سنجیدگی سے بحث نہیں کی ہے۔ انہوں نے صرف صورت حال کا جائزہ بادشاہ اور گروؤں کے درمیان شخصی تعلقات کے تناظر میں ہی لیا ہے اور اس امکان کی طرف نظر نہیں اٹھائی کہ اکبر کی قائم کی ہوئی سلطنت نے سکھ پنتھ کی نشوونما پر غیر شخصی یا غیر ارادی اثرات مرتب کئے ہوں گے۔

اندو بھوشن بنرجی نے مثلاً گوئندوال میں گرو امرداس کے یہاں اکبر کے جانے کا حوالہ دیا ہے۔ گرو کے درویشانہ کردار سے بے حد متاثر ہونے پر اور اس کے چاروں طرف پوترتا کی چمک دمک سے متاثر ہو کر اکبر نے گرو سے درخواست کی کہ وہ اس کی پیش کش قبول کر لیں مگر گرو نے بہت نرم لہجے میں شکریئے کے ساتھ پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد موجودہ شہر امرتسر کے اندر اور اطراف میں گرو کی بیٹی کے نام سے کئی دیہاتوں کی بخشش کو قبول کر لیا گیا تھا اور جو ایک بڑا مادی فائدہ تھا۔ مزید یہ کہ بادشاہ کے وہاں جا کر ملاقات کرنے کے واقعہ نے گرو امرداس کی حیثیت اور شہرت کو آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ عوام کی توقع سے زیادہ اس نئے مذہب اور زیادہ بلندی اس وقت ملی تھی جب اکبر گرو ارجن سے ملنے گئے تھے اور ان کی درخواست پر ایک برس کے لئے محصولات کی رقم اپنے پاس سے دی تھی۔ بنرجی کے مطابق اکبر

کی گرو جی سے دوستی اس معاملے میں بھی ان کے لئے مددگار ثابت ہوئی کہ ان کے دشمنوں نے جوشکایات پہنچائی تھیں ان کے اثرات بھی زائل ہو گئے تھے۔(1)

سکھ پنتھ کی نشوونما پر اکبر کے زیر اقتدار مغل ریاست نے جو اثرات مرتب کئے تھے ان پر تازہ نظر ڈالنے کے لئے ہمیں پہلے تو خود اس نشوونما ہی کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس کے لئے ہمیں نہ صرف اکبر کے معاصر گروؤں کے کام سے معاملہ کرنا ہوگا بلکہ اکبری زمانہ اقتدار کے وقت سے پہلے کے گروؤں کے کام کا بھی احاطہ کرنا ہوگا۔ گرونانک کے نظریئے میں سب سے اہم ایک عنصر خدا کے بارے میں ان کا تصور اور اس سے لوگوں کا تعلق ہے۔ گروانگد کی مرتبہ تحریروں میں جو گرونانک کا پہلا جانشین تھا، وحدت اور خدا کے سریانی ہونے کو یقینی مانا گیا ہے۔ بعض دوسرے خیالات کی طرح ''خدا کا ارادہ یا حکم، اس کی رحمت (ندر، کرپا، پرساد) اور شخص کی خود مرکزیت (ہاومائی) پر زور دیا گیا ہے۔ محبت اور سپردگی کے ساتھ بندگی کا مخاطب خدا ہی ہے۔ کامیابی میں، خوف میں، مصائب کے وقت اور سکون و آرام کی صورت میں صرف اسی کا نام لینا لازم ہے۔ گرونانک نے عقیدے کے جو اصول متعین کئے تھے ان کے گدی نشین پہلے گرو نے ان پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا تھا۔ گرو رام داس کی تحریروں کو پڑھیں تو نظر آتا ہے جیسے انہوں نے گرونانک کے مرتبہ صحیفے پر اپنی تشریحات قلمبند کر دی ہیں۔ دونوں ہی کی تحریروں میں خدا اسی لامنسوب حالت میں نظر آتا ہے۔ لفظوں کے ذریعہ اس کا الہام خدائی حکم، خدائی مدرک، اس کے کرم، اس کی ماورائیت اور اس کی سریانیت، مایا و ہاؤ مائی اور اس کی بندگی کے سچے راستے سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کے باوجود باتوں پر زور دینے اور تشریحات میں ایک قابل حوالہ انحراف بھی پایا جاتا ہے۔ یہ تصور کہ ہر کائناتی زمانہ (یا کال) اپنا موزوں مذہب رکھتا تھا اہم مانا گیا ہے۔ گروارجن کی تحریروں میں خدا کو کچھ نئی صفات سے منسوب کیا گیا ہے۔ وہ ہر قسم کی تشویش سے آزاد (اچنتا) ہے۔ وہ مصیبتوں سے نجات دلانے والا (دکھ بھنجن) ہے اور وہ دشمنوں کو برباد کرنے والا (ستر دھن) ہے۔ جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے خدا کی یہ نئی صفات بہت قریب سے اس تاریخی صورت حال سے جڑی تھیں جس میں رہتے ہوئے گرو ان بھجنوں کو مرتب کر رہے تھے اور جن میں یہ صفات بیان ہوئی ہیں۔

1- Evolution of the Khalsa, 2nd ed., Calcutta,1963, pp. 171 ,213-4.

گرو کے بارے میں نقطہ نظر گرونانک کے جانشینوں کی تحریروں میں خدا کے تصور کے مقابلے میں زیادہ قابل ذکر تبدیلیوں سے گزرا ہے۔ گرو انگد کے لئے نہ صرف خدا اور شبد (لفظ) جیسا کہ گرونانک کی تحریروں میں موجود ہے اہم ہوجاتا ہے بلکہ خود بطور گرونانک بھی اتنا ہی اہم قرار پایا ہے۔ اس لئے بیانات کی تشریحات جن کے اثرات گرو پر مرتب ہوتے ہیں تبدیل ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ گرو اب نجات کا ذریعہ مانا جانے لگا، گرو کے بغیر ہر سُو سوائے گھرے اندھیرے کے اور کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اس قسم کے بیانات کا گرونانک پر بھی اسی طرح اطلاق کیا جانے لگا جیسے کہ ان کے بعد کے گروؤں پر کیا جاتا تھا۔ گرو امرداس کے مطابق کوئی گرو نہیں ہے سوائے سچے گرو کے۔ جو لوگ سچے گرو کی خدمت (سیوا) نہیں کرتے ہیں وہ چاروں کائناتی زمانوں میں مصیبتوں کا بھگتان بھگتتے رہتے ہیں۔ ہمیں وہی کرنا چاہئے جو گرو کہیں اور ان کی خواہشات ہی کی تکمیل کرنا چاہئے۔ گروؤں کی اہمیت میں مزید بڑھت اس وقت ہوتی ہے جب گرو رام داس کی تحریریں مرتب ہوکر سامنے آتی ہیں۔ وہ (گرو) باپ بھی ہے ماں بھی ہے، وہ دوست بھی ہے اور رشتے دار بھی ہے، وہی ان لوگوں کے لئے اعزاز ہے جو خود اپنا کوئی اعزاز نہیں رکھتے ہیں۔ وہی سکھوں کے مابین مشترک بندھن کا ذریعہ ہے۔ گرو ارجن کی تحریروں میں گرو سچا مہاراجا ہے جو مہاراجاؤں کا مہاراج ہوتا ہے۔ اس کے سکھ گرو کے ساتھ ایک لمحہ بھی بیٹھ جانے کو اپنی سب سے زیادہ خوش بختی سمجھتے ہیں۔ اس کی عدالت، عدالت عظمیٰ ہوتی ہے اور وہی تمام انعامات واکرامات کا وسیلہ ہوتا ہے۔ اس کی نگاہِ کرم سارے گناہوں کو دھو ڈالتی ہے اور اس کی سیوا کا ہمیشہ گراں بہا انعام ملتا ہے۔ سکھوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہر لمحہ گرو کو یاد کریں کیونکہ واقعی گرو ہی خدا (پربراہم ۔ نرنجن) ہے۔ گرو ارجن بھی اپنے پیش روؤں کی طرح سکھوں کے لئے خدائی تجلّی کے گھیرے میں رہتے تھے۔

گروؤں ہی کی طرح لفظ شبد اور لفظ نام کی تشریحات میں بھی بہت واضح تبدیلیاں آتی رہیں۔ گرونانک کے صحیفے میں نام معروض ہے اور لفظ (شبد) خدا کی خود اظہاریت یا خود کلامی کا ذریعہ ہے۔ گرو انگد کی تحریروں میں لفظ (شبد) اور نام بھی گرونانک کی اپنی مقدس تحریروں کے ساتھ جوڑ دیئے گئے ہیں۔ صرف ایک ہی سچا لفظ (شبد) ہے اور وہ ہے شبد جیسی گرونانک کی بانی۔ گرو امرداس کی تحریروں میں سچے گرو کی بانی ہی سچی ہے اور وہی جرائم وقائم شبد ہے۔

(آب حیات ہے)۔پانی خدا ہے گرمکھ بانی براہم (برہما) ہے۔کوئی دوسری تحریر سوائے سچے گرو کی تحریر کے کچا پھل ہے اور کچا پھل جو مزہ دیتا ہے وہ جھوٹا ہوتا ہے۔گروامرداس نے بانی کی دوجلدیں تیار کی ہیں جو بیشتر گرونانک گروانگداور خود گروامرداس کی تحریروں پر مشتمل ہیں۔ ان دوجلدوں میں کبیراور نامدیو جیسے سنتوں وبھگتوں کی بانی بھی شامل ہے۔گرورام داس کی تحریروں میں گرو کی بانی مجسم سچ ہے اس کے علاوہ کوئی اور سچی بانی نہیں ہے۔گروارجن کے لئے گرو کی بانی مثل پھوار ہے ان کے لئے جن کی آتما پیاس سے بے تاب ہو۔اس کے لئے سچے گرو کی تعلیمات انمول جواہراور نہ ختم ہونے والا خزانہ تھے جن کو بعد کے آنے والوں نے محفوظ کیا تھا۔گروامرداس نے جو دوجلدیں مرتب کی تھیں اس میں اس نے اپنی تحریروں اور گرو رام داس کی تحریروں کو بھی شامل کردیا تھا اس کے علاوہ دوسرے کئی بھگتوں کی تحریریں بھی ان میں شامل کردی گئی تھیں۔ایک کتاب 1604ء میں مرتب کی گئی تھی جو ابواب اور ذیلی ابواب میں اہتمام کے ساتھ تقسیم کی گئی تھی۔اب یہ مقبول نام ''گروگرنتھ صاحب'' کے نام سے جانی مانی جاتی ہے اور اس کا وہی مرتبہ ہے جو خود گرو کا ہے۔گروارجن کے مطابق یہ مجموعہ خدا کا صحیفہ ہے۔

جس طرح کہ گرنتھ گرو کے ساتھ ساتھ متوازی ہوکر نمایاں ہوئی اسی طرح سکھ قوم بھی نمایاں ہوئی۔گرونانک کی تحریروں میں گرمکھ ایک شخص ہے جو خدا جیسا ہے۔گروانگد کی تحریروں میں گرمکھ کو گرونانک کے پیروکاروں سے منسوب کیا گیا ہے خصوصاً اسے اس نے اپنے پیروکاروں سے منسوب کیا ہے۔گروانگد اپنے پیروکاروں کی بہت عزت کرتا تھا۔وہ خود کو ان لوگوں کا غلام کہتا ہے جو لفظ (شبد) کو مانتے تھے۔اس کے لئے ایسے لوگ مثل خدا تھے۔وہ ان لوگوں کا غلام ہے جو خدا کی وحدت اور اس کی ربوبیت کے اسرار ورموز کو مانتے ہوں۔وہ بھی اس کے لئے مثل خدا ہی ہیں۔صرف وہی لوگ جنہوں نے خود کو گرو کے سپرد کردیا ہو جانتے ہیں کہ کل یگ کی بیرونی دنیا میں مہاراجا ہی واقعی غریب ہوتا ہے اور عالم پنڈت اصل میں احمق ہوتا ہے۔اس طرح گرمکھ اپنے تمام معاصرین میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔گروامرداس نے اپنی تحریروں میں سچی سنگت (ست سنگت) کی اہمیت کی نشاندہی کی ہے۔یہ اس کے پیروکاروں کی سنگت تھی جو گرو پوجا (گرودوار) کے لئے آتے تھے،گرو کے شبد گاتے تھے اور پیشواؤں سے ان کی گائی ہوئی بانی سنتے تھے۔ان پیشواؤں کو اس کام کے لئے گرو خود مقرر کرتا

تھا۔ مذہبی بھائیوں اور مذہبی سنگی ساتھیوں کی سچی سنگت ہی حقیقت کو سمجھنے کا ذریعہ ہوتا ہے اور اسی سے نجات کا دروازہ کھلتا ہے۔ سنگت سے لگاؤ گرو کا عطیہ ہے۔ وہ جو گرو کی طرف آنے اور شبد کو سمجھنے میں ناکام ہو وہ محض دنیوی آدمی (من مکھ)۔ سنگت اس طرح سکھوں کی اجتماعی تنظیم ہو جاتی ہے جیسا کہ گرو رام داس نے اپنی تحریروں میں لکھا ہے۔ گرو کی سنگت خدا کو پسند ہے۔ وہ لوگ جن کے پاس خوراک، لباس اور جائیداد ہو اگر سنگت سے وابستہ رہتے ہیں تو ان کی یہ اشیاء بھی ان پر جائز ہو جاتی ہیں۔ جو سکھوں کی خاطر تواضع کرتے ہیں ان کے گھر اور ان کی کوٹھیاں پاک ہو جاتی ہیں۔ وہ جن کے ہونٹوں پر خدا کا نام رہتا ہے ان کے معمولات اور معاملات پاک ہو جاتے ہیں۔ وہ جو گرو کے حضور نذرانے لاتے ہیں خیرات کے سچے معیار سے سرفراز ہوتے ہیں۔ گرو کے سکھ (گرسکھ) گرو ہی جیسا ہو جاتا ہے اور اس کے جسم میں سچا گرو حلول کر جاتا ہے۔ کسی گرسکھ سے ملنا خدا کی رحمت کی علامت ہے۔

گرو نانک نے اپنے جانشینوں کے لئے نہ صرف خیالات کے ایک مجموعے کا ورثہ چھوڑا تھا بلکہ تین نمایاں لیکن باہم مربوط مشاغل کا ایک ٹھوس ادارہ بھی چھوڑا تھا۔ یہ مشاغل ہیں اول عبادت کے لئے ایک جگہ (دھرم شال)، دوم اجتماعی عبادت (سنگت) اور سوئم اجتماعی کھانا (لنگر)۔ اس ادارے کو نہ صرف ان کے جانشینوں نے اپنے گھروں میں قائم رکھا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ دوسری جگہوں پر اس کا اہتمام کیا۔ معاصر تحریروں میں دودھ میں ابلی ہوئی چاولوں کی میٹھی کھیر کے حوالے ملتے ہیں۔ جو گرو انگد کے اجتماعی باورچی خانے میں لوگوں کو پیش کی جاتی تھی۔ اسی طرح گرو امر داس کے اجتماعی باورچی خانے میں باریک پسے ہوئے آٹے اور خالص مکھن بڑی مقدار میں موجود رہتے تھے۔ گرو امر داس کے زمانے میں اجتماعی عبادت کے مراکز اور اجتماعی باورچی خانے گوندوال کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی قائم کئے گئے تھے۔ ان جگہوں پر گرو ہی کا ایک نمائندہ مقرر کیا جاتا تھا۔ اس پر یہ ذمہ داری لگائی گئی کہ وہ مقامی اجتماعات کی تمام ضروریات کو پورا کرے اور سکھوں اور گرو کے مابین بیچ کے آدمی کا فرض انجام دے۔

مقامی اجتماعات میں تیز پھیلاؤ نے مراکز پر عام اجتماعات کی ضرورت کو جنم دیا۔ گرو امر داس نے اپنے پیروکاروں کو ترغیب دی کہ وہ بیساکھی اور دیوالی کے موقعوں پر ہر سال گوندوال ضرور آئیں۔ اس نے گوندوال میں ایک باولی بنوائی تھی۔ (زمین کے نیچے بنایا جانے والا

تالاب جس میں نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں ہوتی ہیں) جو نہانے کی رسم کی ضرورت کو پورا کرتا تھا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ گوندوال سکھوں کی یاترا کا پہلا مرکز بن گیا۔ سکھ یاتریوں کا زیادہ بڑا اور معروف مرکز امرتسر میں گرو رام داس اور گرو ارجن نے بنوایا تھا۔ یہاں رسم آشنان ادا کرنے کے لئے ایک تالاب بھی بنوایا گیا تھا اور اس کے بیچ میں عبادت خانہ بنوایا گیا تھا جس کو ہرمندر کہا جاتا ہے۔ اس تیرتھ کے اطراف ایک اور شہر رام داس پور بھی بن گیا تھا۔ گرو ارجن نے بعض دوسرے شہروں کی بھی بنیاد رکھی تھی جیسے ترن تارن اور ہر گوبند پور جو جالندھر دواب میں باری داب اور کرتار پور کے علاقے میں ہیں۔ گرو امر داس کے زمانے میں اس کے نمائندے سکھوں سے ملنے والے نذرانے جمع کر کے گرو کو دیا کرتے تھے۔ گرو ارجن کے زمانے اس کے نمائندے جو مسند کہلاتے تھے گرو کے لئے فنڈ جمع کرنے ایک سے دوسرے علاقوں کو جایا کرتے تھے۔ تا کہ وہ منصوبے جو گرو نے شروع کر رکھے تھے مکمل کئے جاسکیں۔

گرو امر داس کے زمانے میں سکھوں کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی۔ ملک کے مختلف مقامات پر چند سکھوں کے باوجود بعض ایسے دیہات تھے جہاں سکھوں کی کثرت تھی۔ اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے وہ جمنا اور گنگا کی طرف کرک شیتر اور دوسرے مقدس شہروں میں بھی گئے تھے۔ یہ غلط نہیں ہے کہ گرو امر داس کے کچھ کھتری پیروکاروں نے لاہور سے باہر کے علاقوں میں اپنی تجارتی سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ گرو امر داس کی تحریروں میں گرو کے حضور نذرانے گزارنے کی خوبیاں بتائی گئی ہیں۔ اپنی دولت اور قیمتی اشیاء کو جو لوگ گرو کی نذر کرتے ہیں وہی خدا سے قرب حاصل کرتے ہیں۔ پیروکاروں سے کہا جاتا ہے کہ وہ مکئی اور کپڑے گرو کو بھیجیں۔
جو بھی عشق کے جذبے کے ساتھ گرو کی سیوا کرتے ہیں ان کی ساری مرادیں پوری ہوتی ہیں۔

جب خدا نے کھتریوں اور برہمنوں کو نظر انداز کر دیا تو نامدیو کی آمد ہوئی۔ ان کے علاوہ خدا کے عاشق نچلی ذات کے اور بھی لوگ تھے جنہوں نے اپنی بندگی کے ذریعہ نجات حاصل کر لی تھی جیسے کبیر، جے دیو، ترلوچن، روی داس، دھنا اور سین۔

نچلی ذات کے سنتوں اور بھگتوں کی آؤ بھگت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ سکھوں میں نچلی ذات کے لوگ موجود تھے۔ گرو رام داس کو معلوم تھا کہ سکھوں میں کسان موجود تھے۔ اس لئے خشک سالی کے موقع پر وہ پریشان ہوتے تھے اور وقت پر برسات ہونے پر رب کا شکر

ادا کرتے تھے۔ وہ زمینوں کی سینچائی کے لئے استعمال کئے جانے والے ایرانی چکروں سے واقف تھے۔ ان کے علاوہ سکھوں میں دکان دار تھے، پھیری لگانے والے بیوپاری تھے، ہنرمند اور دستکار تھے اور دولت مند بیوپاری بھی تھے۔ سکھ قوم میں عورتوں کی تعداد بھی بہت کم نہیں تھی لیکن گرو رام داس کی تحریروں میں ان کی موجودگی اتنی ہی بری سمجھی گئی جتنی کی مردوں کی۔ انہوں نے نمایاں الگ پہچان کا احساس دلانے میں اہم کارنامہ انجام دیا تھا اور اپنی تحریروں میں واضح طور پر ان کو دوسروں سے الگ قرار دیا ہے۔ بے ناک کا من مکھ (بھٹکا ہوا سکھ) کو بھی نفرت قرار دیا گیا ہے، اس کا کوئی نام نہیں ہوسکتا ہے اور اس قسم کے بدمعاش رنڈی کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گرو ارجن کے اقتدار کے دوران پنجاب میں سکھوں کی تعداد خاصی بڑھ گئی تھی۔ لاہور میں بھی بہت سکھ تھے۔ اسی طرح سلطان پور لودھی سکھ مت کے بڑے مرکز کی حیثیت سے شہرت رکھتا تھا۔ چھوٹے شہروں میں جیسے پٹی ہیبت پور میں سکھ تھے۔ بہت سے دیہاتوں میں سکھ موجود تھے۔ سکھوں میں یقیناً کچھ برہمن اور اپنی ذات سے جلاوطن کئے گئے لوگ بھی تھے۔ سکھ آبادی میں بیوپاریوں، ہنرمندوں، دستکاروں، کاشت کاروں کی بھی نمایاں نمائندگی تھی۔ بیوپاری حلقوں میں کھتریوں کا کردار نمایاں تھا اور کاشت کاروں میں جاٹوں کا کردار نمایاں تھا۔ معروف سکھوں میں ایک میاں جمال بھی تھے جو ہر وقت گرو کے ساتھ موجود رہتے تھے۔ مزید کہ پنجاب میں کثرت کے باوجود سکھ پنجاب تک ہی محدود نہیں تھے۔ کابل، کشمیر، آگرہ اور دہلی میں بھی سکھ تھے۔ اس زمانے کے بارے میں یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ سکھ اکبری سلطنت کے ہر صوبے میں پائے جاتے تھے۔

اس کے باوجود سکھ پنتھ کی قلمرو میں سب خریت ہے والی حالت نہیں تھی۔ گرو نانک کے قانونی وارثوں نے جب کرتارپور پر بطور اپنے حق دعویٰ کیا تھا تو ریاستی قانون حرکت میں آ گیا تھا اسی لئے گرو انگد اپنی خوشی سے خادر (امرتسر ضلع کا مقام) چلے گئے تھے اور کرتارپور کو سری چند اور لکشمی چند کے حوالے کر گئے تھے جو گرو نانک کے بیٹے تھے۔ سری چند نے اس مقام پر جہاں گرو نانک کو جلایا گیا تھا ایک عمارت بنوا دی تھی۔ ان بیٹوں نے گرو انگد کو گرو ماننے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ گرو نانک کے جانشین بننے کا اس کا دعویٰ غلط تھا۔ اس طرح گرو انگد کے

پیروکار تنہا گرونانک کے پیروکار نہیں تھے۔

گروامرداس کو کھاور چھوڑنا پڑا تھا کیونکہ اس پر گروانگد کے بیٹوں داسو اور داتو نے دعویٰ کر دیا تھا اور اسے اپنا ورثہ قرار دے دیا تھا۔ انہوں نے خود کو بطور گروانگد کے روحانی چیلوں کے منوالیا تھا۔ گروامرداس نے بیاس ندی کے دائیں کنارے سے چند میل دور اپنا مرکز قائم کر لیا تھا جو لاہور سے دہلی کو جانے والے راستے پر واقع تھا۔ بعد میں یہ مقام ترقی کر کے شہر بن گیا تھا اور گوندوال کے نام سے جانا گیا تھا۔ وہاں گالی گلوچ کرنے والے (نندک) بھی ہیں اور وہاں باغی (بے مکھ) بھی تھے۔ گرو نے کسی کو بھی اپنا دشمن نہیں قرار دیا تھا اور ان کے سکھ مطلق طاقت رکھنے والے خدا کے سائے میں محفوظ تھے۔ ان کے دشمنوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہی سچے مہاراجا تھے۔ ان کے عبادت گزاروں کو دنیوی مہاراجاؤں کے ایجنٹ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے تھے۔ اس کے اشارے ملتے ہیں کہ گرو کے مخالفین مقامی حکام سے مدد مانگ رہے تھے۔ گرو کے خلاف ردعمل ہی اصل میں مذہب کی تبلیغ میں بڑھتی ہوئی کامیابی کا ذریعہ بن گیا تھا۔ گروامرداس نے نامزدگی کے اصول کی شدّت کے ساتھ ہمت افزائی کی تھی۔ ان کا موقف تھا کہ گرو خود خدا ہے اور وہ خدا کے چیلے ہیں۔ اس موقف کا اطلاق گرونانک اور گروامرداس دونوں پر کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی صورت حال میں یہ خدا کے احکامات ہی کا ایک جزو ہے کہ گرو کسی کو بھی گرو کے مرتبے پر فائز کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

گرورام داس کی تحریروں میں نامزد کیے گئے جانشین کے مخالفین یہ نہیں محسوس کرتے ہیں کہ بھگتی کا کرم شروع ہی سے خدا کے سچے پریمیوں پر ہی نازل ہوتا ہے۔ گرونانک مخالفت کرنے والوں کو بددعا دی تھی۔ گروانگد بھی مخالفوں کو بددعا دیا کرتے تھے۔ تیسرے گرو نے سوچا تھا کہ مخالفوں کے پاس نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں ہے۔ چوتھے گرو نے مخالفت کرنے والوں اور ان کے سنگی ساتھیوں کو معاف کر دیا تھا۔ لیکن مخالفین اپنے احمقانہ پن پر قائم تھے اور بے عزتی کا گھاٹا سمیٹتے رہے تھے۔ وہ مدد کے لئے مقامی حکام اور چودھریوں کے پاس جایا کرتے تھے۔ اس حرکت سے جو خطرہ پیدا ہوا تھا گرورام داس نے اسے محسوس کیا تھا۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کو ہدایت کی تھی کہ وہ کسی اشتعال انگیز ردعمل کا اظہار نہ کریں اور معاملات کو خدا پر چھوڑ دیں۔ سکھ جو خدا کے بندے (دیوان) ہیں ان کو دنیا پرست بندوں سے

ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے نہ سلطنت کے حکام سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔ تمام راجے، مہاراجے، بادشاہ، خان، امرا اور شق داران خدا کی طاقت کے سامنے بے بس ہیں اور وہ وہی کرتے ہیں جو خدا ان سے کروانا چاہتا ہے۔ سکھ چونکہ خدا کے دھڑے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کو زمین پر موجود دھڑوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ گرو رام داس دیو مالائی اور داستان (لیجنڈ) کو استعمال میں لاتے ہوئے سکھوں کو دوبارہ یقین دلاتے ہیں کہ ان کی حفاظت کرنے والا خدا ہے۔

وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

گرو رام داس کا خیال کہ ان کا جانشین رام داس پور پر قانونی حوالے سے گرو کے ایک وارث ہونے کا دعوے دار ہو اور اس بنا پر اسے مرکز کا کنٹرول حاصل ہو تو یہ اس کی نمایاں کامیابی کا راستہ تھا۔ گرو نانک کا پہلا جانشین گرو ارجن تھا جس کو اپنے گرو کے بعد مشنری کے مرکز پر کنٹرول حاصل ہوا تھا۔ تاہم وہ اپنے سابق گرو کا بیٹا بھی تھا چنانچہ دوسرے ورثا بھی جائیداد میں اپنے حصے کی مانگ کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ گرو ارجن کا بڑا بھائی پرتھی چندی نے غالباً مقامی حاکم سے رابطہ بھی کیا تھا کہ اسے اپنے باپ کی جگہ گدی ملنا چاہیے مگر اسے رام داس پور کی آمدنی سے ایک حصہ ملنے کے فیصلے پر اکتفا کرنا پڑا تھا۔ گرو ارجن اپنی نامزدگی کے وقت صرف اٹھارہ برس کے تھے اور بے اولاد تھے۔ پرتھی چندر نے مناسب وقت کے لئے بہت طویل عرصے تک انتظار کیا تھا مگر اپنے چھوٹے بھائی کی بلند حیثیت کو ماننے کے لئے انہوں نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ گرو ارجن کے بیٹے کی پیدائش کے بعد جو 1595ء میں پیدا ہوا تھا اور جس کا نام ہرگوبند تھا پرتھی چند کے اشتعال میں اضافہ ہو گیا تھا اور انہوں نے ہرگوبند کو نقصان پہنچانے کی بھی کوشش کی تھی۔

دوسرے مخالفوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ گرو ارجن نے اکثر اپنی تحریروں میں ان کے حوالے قلم بند کیے ہیں۔ وہ عموماً گرو کے مفادات کو نقصان پہنچانے میں ناکام ہی رہتے تھے۔ ان میں اگر کوئی گرو کے خلاف بہت سے لوگوں کے دستخط کے ساتھ حلف نامہ قاضی کو پیش کرتے تھے تو وہ جھوٹا ثابت ہوتا تھا اور اس جھوٹ کی تحریر کے لکھاری کا انجام رسوائی پر ہوتا تھا۔ ایک

شخص نے اگرچہ ہرگوبند کو زہر دیا تو وہ خود مر گیا۔ گرو ارجن کا ایک طاقتور دشمن سلہی تھا۔ اس نے جب اپنے شیطانی منصوبے پر عمل کرنا چاہا تو اسے کسی نے کلہاڑی کا وار کر کے مار ڈالا تھا۔ گرو کے مخالفین جب ان کے خلاف ریاست کے معزز حکام کو عرضیاں دیتے تھے تو ان کے چہروں پر سیاہی پھیل جاتی تھی۔ ان کی عرضی کو حکام بے بنیاد الزامات کی پوتھی قرار دے کر گرو ارجن کو حفاظت کے ساتھ گھر واپس جانے کی اجازت دے دیتے تھے۔ اس بات میں وزن ہے کہ اکبر کا گرو ارجن کے ساتھ رویہ ہمدردانہ تھا اور وہ ان کا دفاع کرتا تھا۔ عدم تحفظ کے احساس سے نبٹنے کے لئے گرو نے اپنے پیروکاروں پر زور دیا کہ وہ اپنے ایمان کو مضبوط رکھیں اور خدا پر یقین میں شک کا گزر نہ ہونے دیں۔ وہ جو خدا کی مالا جپتا ہے خوف سے آزاد ہو جاتا ہے۔ گرو کا شبد ایک دفاع کرنے والی فوج کی طرح ہر طرف اپنا کام کرتا ہے۔ جنہوں نے خدا کی بارگاہ میں پناہ لے لی ان کو کسی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اکبر کی وفات 1605ء کے وقت سکھ مغل سلطنت کے مختلف شہروں میں رہتے تھے البتہ ان کا واضح ارتکاز لاہور صوبے کے شہروں اور دیہاتوں میں تھا۔ گرو کے معزز نمائندے دور و دراز مقامات پر منعقد ہونے والے اجتماعات کی دیکھ بھال کرتے تھے اور ان کے نذرانے سال میں ایک بار لے کر رام داس پور (امرتسر) آتے تھے۔ سکھوں میں بیوپاری حلقوں کے ممبر سوداگر بھی شامل تھے، دکان دار، زراعت پیشہ کاشتکار اور دستکار بھی تھے۔ یہ حلقے گو کہ خود کفیل تھے مگر گرو نے جو تنظیم قائم کی تھی اس کے لئے اقتصادی طور پر ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کرتے تھے جن کے تعاون سے گرو باہر کی ایجنسیوں سے مالی مدد حاصل کئے بغیر اپنے منصوبوں کو پورا کرتے تھے۔

گرو نانک کے مذہبی نظریئے کو ان کے جانشینوں نے خوب بڑھاوا دیا تھا، اس میں نئی سمتوں کا اس طرح اضافہ کیا تھا کہ گرو نانک کے بنیادی اصولوں میں کوئی بدلاؤ نہ آنے پائے اور ان کے رہنما خیالات پر اثرات مرتب نہ ہوں۔ گرو نانک کی زندگی کے دوران گرو کی حیثیت سے انگد کی نامزدگی کے حوالے سے بہت سے جانشینوں کو سامنے لایا گیا تھا۔ اس وقت گرو کی اکائیت کے نقطہ نظر نامکمل تھا جس کو مکمل کر کے اس اکائیت پر اقرار کا اعلان کیا گیا۔ اب گرو بطور شخص اہم نہیں رہا تھا بلکہ اس کی حیثیت اہم تھی۔ اس کے فیصلوں کو وہی قانونی حیثیت دی گئی جو اصل گرو کے فیصلوں کو حاصل تھی۔ اس طرح جانشینوں کے دیئے گئے فیصلے بانی گرو ہی

کے مشن کی توسیع سمجھے جانے لگے اور جانشینوں نے جو بھی کام کئے وہ بانی گروہی کے کاموں کی توسیع سمجھے جانے لگے۔ گرو کے ساتھ رہنے والے کسی چیلے کی حیثیت کو گھٹانے کے حوالے سے گروہ اس سکھ فرد کے بارے میں پہلے خوب سوچ وچار کرتے تھے اور اس کے لئے جماعت کی عبادت گذار تنظیم کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ بطور ذریعہ الہام شبد اور اس الہام کا ایک حصہ گرو نانک کی بانی کو ماننے کے حوالے سے دوسرے گرو اپنی تحریروں کو گرو نانک کے متوازی رکھتے تھے۔ گرو اگرچہ نہ ہی اوتار تھے اور نہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر تھے مگر ان کا خدا سے اتنا قریبی اتحاد تھا کہ ان کے پیروکار انہیں ربوبیت کا مرکز تصور کرتے تھے۔

سکھوں کا مذہبی نظریہ جو ان کی زندگی کے معمولات اور رویوں کا مظہر تھا گرو ارجن کے مرتبہ صحیفے گرنتھ میں مجسم کیا گیا ہے۔ اب سکھ زیادہ سے زیادہ اس شعور کا اظہار بھی کرنے لگے تھے کہ ان کا صحیفہ ویدوں اور قرآن مجید کے مقابلے میں مختلف اور نمایاں ہے۔ سنتوں، بھگتوں اور صوفیوں کی تحریروں میں پائے جانے والے خیالات کو گرنتھ میں جوڑتے ہوئے جو خود گروؤں کے خیالات سے مطابقت رکھتے تھے سکھوں کا صحیفہ بھی ایک ایسا مجموعہ خیالات بن گیا جو اس زمانے میں تمام ہندستان پر چھاتے جا رہے تھے۔ اس صحیفے کی زبان بھی ایسی ہے جسے اتری ہندستان کے بہت بڑے حصے میں عام اکثریت آسانی کے ساتھ سمجھتی تھی۔ اس کا رسم الخط بھی ہندستان میں مروج دوسرے تمام رسم الخطوں کے مقابلے میں سادہ اور آسان ہے۔ یہی کتاب سکھوں کے انداز نظر کی مستند ماخذ ہے جو معاصر نظاموں میں رائج مذہبی اعتقادات اور معمولات سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔ پورے گرنتھ کی نقول بنائی جا سکتی ہیں یا ان اہم حصوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے تا کہ دور دراز مقامات کے لوگ ان سے استفادہ کر سکیں۔ گر بانی کا سننا ہر صورت میں خود گروہی کی آواز سمجھی جاتا تھا۔

نمایاں سکھ پہچان جس کی بنیاد ان کے مذہبی نظریئے پر قائم تھی پیدائش، شادی بیاہ اور موت کے موقعوں پر منعقد ہونے والی نمایاں رسومات سے ہوتی ہے۔ شادی بیاہ کے معاملات میں سکھوں کو آزادی تھی کہ وہ ذاتوں اور ذیلی ذاتوں کے قدیم ارضی تعلق سے استفادہ کریں لیکن گرو نانک کی تعلیمات کوئی ایسی بات نہیں آئی ہے جس کو جواز بنا کر اس تعلق کو صحیح قرار دیا جائے۔ اجتماعی عبادت اور اجتماعی کھانوں کے دوران برابری کا اصول کا کھلے عام مظاہرہ ہوتا تھا۔ رام داس

پور (امرتسر) بطور تیرتھ تمام سکھوں کے لئے کھلا ہوا تھا خواہ قریب کے علاقوں کے ہوں یا دور دراز علاقوں کے۔ بیساکھی اور دیوالی کے تہواروں کے موقعوں پر ایک بڑی بھیڑ جمع ہوا کرتی تھی۔ سال میں سکھوں کی دو یاترائیں گرو رام داس شہر میں ہوتی تھیں جوان کو روحانی مسرت سے ہمکنار کرتی تھیں۔ یہ یاترائیں سکھوں کو ایک وسیع برادری میں ہونے کا بھی شعور فراہم کرتی ہیں۔

اکبر کی وفات کے وقت مغل سلطنت میں سکھ پنتھ کا اپنا نمایاں اور الگ مقام تھا۔ ایک دھڑا ان کا مخالف اور دشمن بھی تھا جن کی موجودگی کا گرونانک کے سب ہی جانشینوں کو احساس تھا۔ دشمنوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی اور ان کی سازشوں میں بھی بڑھت ہورہی تھی۔ ریاست کا لاگو قانون اگر ان میں کچھ کو موقع دیتا تھا کہ وہ گروؤں کی جائیداد اور دولت پر اپنے دعوے کا مقدمہ دائر کریں تو متعلقہ حکام کی ہوس ان کے دعوؤں کو منظور کرلیا کرتی تھی۔ اکبر کی سیکولر مذہبیت کھلے عام تشدد سے گروؤں اور ان کے پیروں کاروں کو محفوظ رکھتی تھی لیکن ہر دشمن پر مکمل قابو حاصل کرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ تحفظ کی اس چھتری کے ہٹنے کا یہ نتیجہ ہوسکتا تھا کہ گروؤں اور ان کے پیروکاروں کے خلاف اشتعال کو ایندھن مل جائے۔ اکتوبر 1605ء میں اکبر کی وفات کے آٹھ مہینے بعد ہی گرو ارجن کو قتل کردیا گیا تھا جس کے لئے کہا گیا ہے کہ نئے بادشاہ کے کارندوں نے لاہور میں ان کو اذیتیں پہنچائی تھیں۔

اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ سکھ پنتھ کی نشوونما پر اکبر کے زیر اقتدار مغل ریاست نے جو اثرات مرتب کئے تھے ان کے بارے میں بات کریں۔ اکبر نے ایسے بہت سے اقدامات کئے تھے جن کے نتیجے میں ریاست کا کردار کافی بدل گیا تھا۔ اس نے وفاداری شاہ کی سیاست کا بڑی وسعت اور موثر صورت استعمال کیا تھا جس کی بنا پر بہت سے غیر مسلمان راجا مہاراجا سیاسی طور پر اس کے ماتحت ہوگئے تھے۔ اس نے منصب داری نظام میں حصہ لینے کے خواہش مند غیر مسلموں کو داخل کرنے کی کوشش کی تھی جو اس کی عام پالیسی کا اہم حصہ تھا۔ اس نے تفریق پیدا کرنے والے جزیہ اور یاترا ٹیکسوں کو بھی منسوخ کردیا تھا گائے کاٹنے کی مذمت کی تھی اور طاقت کا اطلاق کرکے ایک سے دوسرے مذہب میں لائے جانے پر بھی پابندی لگادی تھی۔ اس نے غیر مسلمانوں کے اداروں اور غیر مسلمان افراد کو ریاستی سرپرستی فراہم کی تھی۔ اس کے ان مجموعی اقدامات اور رعائتوں نے جن کا مقصد مفاہمتی فضا پیدا کرنا تھا اپنا اثر دکھایا تھا۔ ہر طرف

امن وامان تھا، جان ومال محفوظ تھے اور یہ فضا اس کی پوری سلطنت میں قائم ہوگئی تھی۔

ہندستان میں اکبر نے نسبتاً امن وامان اور تحفظ کی جو فضا بنادی تھی اس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ عام خوش حالی بڑھ گئی تھی۔ اکبر کی محصولاتی (ریونیو) پالیسی کا اہم مقصد زراعت کو بڑھاوا دینا تھا۔ اس بات کی واضح نشاندہی ہوتی ہے کہ سولہویں صدی کے اواخر کے دوران زیادہ سے زیادہ زمینیں زیر کاشت لائی جا چکی تھیں۔ منڈی کے لئے نقدی فصلیں بوئی جاتی تھیں اور زرعی پیداوار کو اشیاء بنانے والے استعمال کرتے تھے۔ اوزان یعنی ناپ تول، کرنسی کے معیار متعین کرنے کی وجہ سے اقتصادی ترقی کی رفتار بھی تیز ہوگئی تھی۔ بیوپار کو بڑھانے کے لئے اکبر نے بہت سی اندرونی محصول چنگیوں کو منسوخ کردیا تھا۔ کاروانوں کے لئے راستوں کو محفوظ بنایا گیا تھا اور تجارت کا مشغلہ بھی محفوظ تھا۔ اکبر کے زمانہ اقتدار بڑے پیمانے پر تجارتی سرگرمیوں کا احیاء ہوا تھا۔ شہروں کی تعداد اور وسعت اضافہ ہو رہا تھا۔ سولہویں صدی کے اواخر کے اکبری علاقوں میں شہری مراکز کی تعداد اور ان کے پھیلاؤ میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا تھا جس سے واضح ہوتا ہے کہ تجارت کا مجموعی حجم بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ بنائی ہوئی مصنوعات اور زرعی پیداوار کی بھی ہر طرف ریل پیل تھی۔

اکبر کی سلطنت میں لاہور کا صوبہ زراعت، مصنوعات سازی اور تجارت کے اعتبار سے ترقی یافتہ صوبوں کی فہرست میں شمار ہوتا تھا۔ مغل سلطنت کے بہت بڑے شہروں میں لاہور بھی تھا۔ ابوالفضل کا مشاہدہ ہے کہ صوبے کے بیشتر علاقوں میں زرعی زمینوں کو کنوؤں کے ذریعہ پانی فراہم ہوتا تھا۔ سینچائی کے بہت سے مصنوعی طریقے بھی رائج تھے جن کی وجہ سے کسان بہت اعلیٰ معیار کی نقدی فصلیں اگاتے تھے۔ صوبہ اپنے پہاڑی نمک کے لئے مشہور تھا اس کے علاوہ شہرت کی دوسری وجہ یہاں سے شکر، سوتی کپڑوں، شالوں اور دریوں وقالینوں کی برآمد تھی۔ لاہور شہر کابل سے دہلی تک کے تجارتی راستے پر واقع تھا اس زمانے میں پنجاب کی اقتصادی ترقی نے بیوپاریوں اور کاشت کاروں کے لئے منافع بخش مواقع پیدا کردیئے تھے۔

کھتریوں اور جٹ سکھوں کی خوشحالی کی وجہ جو اپنے گروؤں کے حضور فیاض کے ساتھ نذرانے گزارتے تھے اور ان کو اس قابل بناتے تھے کہ وہ اپنے وسیع البنیاد منصوبوں کو پورا کریں۔ اکبر کے زیر اقتدار مغل سلطنت کی ترقی تھی۔ گروؤں کی بڑھتی ہوئی دولت اور وسائل پر

ان کی دسترس نے ان کے مخالفوں میں مزید آگ پیدا کردی تھی اور وہ نامزد کیئے گئے جانشینوں کی ڈٹ کر مخالفت کرنے لگے تھے۔ اس صورت حال میں گروؤں کو ریاست کے حکام کی طرف سے جو مدد ملتی تھی وہ ان کے لئے بے حد مفید ثابت ہوتی تھی۔ اس کے باوجود مسلسل مخالفت نے سکھ خیالات اور رویوں کی نشوونما پر گہرے اثرات مرتب کیئے تھے۔ گرنتھ کی ترتیب وتدوین جس میں سنتوں، بھگتوں اور صوفیوں کی تحریریں اور کہاوتیں شامل تھیں حریفانہ کشمکش کی فضا سے محفوظ نہیں رہ سکی تھی اور سکھ قوم ہی کے اندر بغاوت کے واقعات رونما ہوئے تھے۔

گروؤں کی مادی دولت اور مالی آزادی میں اگر ریاست کی خوشحالی جھلکتی تھی تو مادی وسائل پر کنٹرول کے حوالے سے تشویش نے جس بغاوت کو ابھارا تھا وہ سکھ نظریئے، ان کے تصور خدا، گروئیت کے نظریئے، سکھوں کی اہمیت اور گرنتھ کی ترتیب وتدون میں خاص قسم کی تبدیلی بھی لا رہی تھی۔ یہ تھے مختصراً مگر جامع وہ نشوونما کے پہلو جنہوں نے سکھ پنتھ کو ریاست کے ایک ریاست کا کردار عطا کردیا تھا۔ گرو ارجن کی موت پر گرو ہرگوبند کا ردعمل محض اکبر کی وفات کے وقت ان کی حیثیت کے حوالے سے منطقی تھا جیسے کہ بھائی گرو داس نے وضاحت کی ہے کہ گرو ارجن کے جانشین نے سخت کیکر کے درخت کا ایک گھیرا سکھ مذہب کے کم عمر پودے کے گرد کھڑا کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ اسے مخالفت کی طوفانی ہواؤں سے بچایا جا سکے جو کسی بھی سمت سے آ رہی ہوں اسے ہم نہایت موزوں استعارہ کہہ سکتے ہیں جس سے مراد سکھ پنتھ کی پرامن نشوونما سے جس کے لئے اس کی عسکریت کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

منتخب کتابیات

آدی سری گرو گرنتھ صاحب جی۔ (سری دم دمی بیر، مختلف مطبوعہ ایڈیشن)

بنرجی، اندو بھوشن، ایولوشن آف دی خالصا، جلد (1) الف 3، مکھرجی اینڈ کمپنی کولکتا 1963ء (دوسرا ایڈیشن)

کننگھم، جے۔ ڈی۔ اے، ہسٹری آف سکھس، لندن 1849ء

گنڈا سنگھ ایڈیشن، ماخذ تواریخ سکھاں۔ امرتسر 1949ء

گوپال سنگھ۔سری گروگرنتھ صاحب۔انگریزی ترجمہ دہلی 1962ء
گریوال، جے۔ ایس۔ گرونانک ان ہسٹری، چندی گڑھ دوسرا ایڈیشن 1979ء
۔۔۔۔فرام گرونانک ٹو مہاراجا رنجیت سنگھ۔امرتسر (دوسرا ایڈیشن) 1982ء
۔۔۔۔دی سکھس آف دی پنجاب (II)3 دی نیو کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، کیمبرج 1990ء
عرفان حبیب، دی ایگریرین سسٹم آف مغل انڈیا۔ممبئی 1963ء
خان احسن رضا۔چیف ٹینز ان دی مغل ایمپائر ڈیورنگ دی رین آف اکبر، شملہ 1977ء
میکلوڈ، ڈبلو۔ایچ، گرونانک اینڈ دی سکھ ریلیجن، آکسفورڈ 1968ء
۔۔۔۔دی ایولوشن آف دی سکھ کمیونٹی، آکسفورڈ 1975ء
۔۔۔۔ارلی سکھ ٹریڈیشن، اے اسٹڈی آف جنم ساکھیس۔آکسفورڈ 1980ء
۔۔۔۔ٹیسچوں سورسیز فار دی اسٹڈی آف سکھزم۔مانچسٹر 1984ء
نورالحسن، تھاٹس آن ایگریرین ریلیشنز ان مغل انڈیا۔دہلی 1973ء
اے نہر رنجن دی سکھ گروز اینڈ دی سکھ سوسائٹی، اے اسٹڈی ان سوشل اینالیسس پٹیالہ 1970ء
اے۔ چودھری، پٹن اور عرفان حبیب، ایڈیشن۔ کیمبرج اکنامک ہسٹری آف انڈیا۔
کیمبرج 1984ء
سب دارتھ سری گروگرنتھ صاحب جی۔متن اور تشریحی (حواشی) 1936-1941ء
شیریں موسوی، دی اکنامی آف دی مغل ایمپائر۔دہلی 1987ء
تیج سنگھ۔سکھزم: اٹس آئیڈیلز اینڈ انسٹی ٹیوشنز، ممبئی 1937ء

✽✽✽✽✽

اکبر اور سمندری بیوپار کی قلمرو میں پرتگالیوں کا عروج

کے۔ ایس۔ ماتھیو

1556ء کے لگ بھگ جب اکبر گدّی پر براجمان ہوا تھا ان دنوں ہندستان کی پوربی ساحلی پٹی پر پرتگالیوں نے مضبوطی کے ساتھ اپنا عمل دخل قائم کرلیا تھا۔ انہوں نے بہت سے قلعے اور فیکٹریاں اس پٹی پر بنا لئے تھے۔ پچھمی ساحلی پٹی پر انہوں نے چند بستیاں بھی بسا لی تھیں۔ بحر ہند میں جہاز رانی بڑے پیمانے پر پرتگالیوں کارٹازیز نظام کو متعارف کرانے اور لاگو کرنے تک محدود تھی۔ برصغیر کے حکمراں، امراوشرفا اور بیوپاری پرتگالیوں سے اجازت نامے خریدنے کے پابند تھے اور اس خطرے کے باوجود کہ ان کے سمندری جہاز اور مال بردار جہاز قبضے میں لئے جاسکتے تھے ان کو اجازت نامے کی شرائط وضوابط کو لازماً پورا کرنا ہوتا تھا۔ سولہویں صدی کی آخری چوتھ کے لکھاری عبدالعزیز کے لفظوں میں بعض اشیاء جیسے مرچ جن کی پیداوار کا ذریعہ ہندستانی تھے ان کو پرتگالیوں سے خریدا جاتا تھا۔ (یعنی مقامی مرچ کی پوری پیداوار پرتگالیوں کو پہنچایا جانا لازم تھا)۔ اس نے مزید لکھا ہے کہ کوئی بھی جو یخنی (سوپ) بنانے کے لئے مرچ کی مانگ کرتا تھا۔ پرتگالی اسے پسی ہوئی صورت میں کپڑے کی تھیلی کے اندر بند کر کے دیتے تھے۔ یونانی کیرل کے شیخ زین الدین کے بھائی کی شکایت کو اصل میں عوام کے احساس کا ترجمان سمجھا جانا چاہئے۔ امراء کے ردعمل کا نتیجہ ہی اصل میں 1540ء میں سورت کے بیوپاری گورنر خواجہ صفر کی گجرات اور بحر ہند سے پرتگالیوں کو مار بھگانے کی کوشش کے روپ میں ظاہر ہوا تھا۔ ان کو نکال باہر کرنے کے لئے گورنر نے جو اتحاد پوربی ایشیا کے حکمرانوں سے بنایا تھا۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ امراء وشرفاء کا سمندری تجارت سے کس حد تک تعلق تھا۔

1527ء جب اس نے گجرات فتح کیا تھا تو پہلی بار اکبر نہ صرف سمندر کا مشاہدہ کرنے آیا تھا بلکہ ہندستانی تجارت اور سمندری سرگرمیوں کو جو مسائل پرتگالیوں کی وجہ سے درپیش تھے ان کا بھی اکبر نے مقابلہ کیا تھا۔ قرون وسطیٰ کے دوران گجرات ہندستان کا ایک بہت بڑا بیوپاری مرکز تھا اور مختلف مقامی قومیتوں کے لوگوں کو ان کے مزاج کے مطابق مواقع اور ماحول مہیا کرتا تھا۔ اصلاً روس کے عیسائی ملک ایاز نے دیو کے مقام پر مضبوطی سے پیر جما لئے تھے اور گجرات کی سلطنت میں ایک علاقہ کا گورنر ہو گیا تھا۔ پرتگالی بیوپاریوں کو ایک کونے تک محدود رکھنے کے لئے اس نے سمندر میں ایک قلعہ بنوایا تھا جس کو سانکل کوٹھ کہا جاتا تھا۔ دیو کے مقام کو اس سے زنجیروں کے ذریعہ جوڑ دیا گیا تھا۔ تاکہ فرنگیوں کے جہازوں کو راستہ دینے سے روکا جا سکے۔ (1) خواجہ صفر جو سورت کے گورنر تھے اور امراء کے حلقے میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی البانوی تھے جنہوں نے تین لاکھ کرڈیزوں سمیت دیو میں پناہ لے رکھی تھی۔ ان کے پاس ان کے علاوہ چھ سو ترک سپاہی، کچھ توپ خانہ، جواہرات اور ان کی اپنی عورتیں تھیں۔ 1527ء میں اس نے بہادر شاہ کی ملازمت اختیار کر لی تھی اور ساتھ ساتھ چھ لاکھ کروڈوز دیو میں لگا کر اپنی تجارت بھی کر رہا تھا۔ (2) دیو جو گجرات کے ساحل پر اہم بندرگاہوں میں ایک تھا اسے پرتگالی ہندستان میں داخل ہونے کا صدر دروازہ سمجھتے تھے اور اپنی سمندر پار تجارت کی ابتدا سے ہی انہوں نے دیو پر نظریں جما رکھی تھیں اور آخرش 1535ء میں اس پر چڑھ بیٹھے تھے۔

اکبر اور پرتگالیوں کے تعلقات کا مطالعہ بیوپار اور سمندری جہاز رانی کی بنیاد کے علاوہ مذہبی رابطوں کے تناظر سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ بیوپار اور سمندری جہاز رانی کے موضوع پر تو بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے جب کہ مذہبی تعلقات کے موضوع پر بہت لکھا گیا ہے۔ اصل مسئلے کی بہتر تفہیم کے لئے ہمیں اس پس منظر سے معاملہ کرنا ہے جو سولہویں صدی میں اس سمندری تسلّط کا ہے جس کا دعویٰ پرتگالیوں نے کیا تھا۔ اکبر نے خود بھی پرتگالیوں سے ایک کارٹاز لینے کی خواہش ظاہر کی تھی جو گجرات کے ساحل سے جانے والے شاہی جہازوں کے لئے استعمال میں لایا جاتا تھا۔ یہ جہاز ہر سال بحیرہ احمر کی اور خلیج کی طرف جایا کرتے تھے۔ ایسا کرنے میں وہ ماضی کی روایت ہی کی پیروی کر رہا تھا۔

کارٹیزیز کے مسئلے کی ابتدا کو ہم 1502ء سے تلاش کر سکتے ہیں جب واسکو ڈی گاما نے

دباؤ ڈالا تھا کہ بحر ہند میں جانے والے تمام جہاز جو پرتگالی جہاز رانوں کے سخت اور پرتشدد کاروائیوں سے بچنا چاہتے ہیں وہ پرتگالی سمندری کپتان سے اس کے دستخط (3) شدہ اجازت نامے ضرور حاصل کریں۔ امراء وشرفاء اور برصغیر کے مختلف علاقوں کے بہت سے راجاؤں مہاراجاؤں نے اس شرط کو منظور کرلیا تھا۔ تاکہ ان کے جہازوں کو پرتگالی ہتھیا کران پر قبضہ نہ جمالیں، ان کے لوگوں اور مال کو نہ پکڑلیں۔ اس سے پرتگالیوں کے علاوہ دوسری تمام متعلقہ پارٹیوں کو نقصان بھگتنا پڑتا تھا۔ اس لئے ہندستانی حکمرانوں، عربوں، مصریوں اور وینس کے لوگوں نے سولھویں صدی کی پہلی دہائی کے دوران سخت لڑائی کی مگر ان کو کوئی قابل ذکر کامیابی نہیں مل سکی۔ تقریباً تمام سفارتی کاغذات جن پر پرتگالیوں اور ہندستانی حکمرانوں کے دستخط کیئے ان میں اتفاق کیا گیا تھا کہ بحر ہند سے جانے والے تمام جہاز پرتگالی حکام کے دستخط شدہ اجازت نامے حاصل کریں گے اور اس کے عوض کسٹم ڈیوٹی کی صورت کچھ رقم دیں گے۔ (4)

گجرات کے سلطان بہادر شاہ پرتگالی ہندستان کے گورنر ندوداکنہا کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو 23 دسمبر 1534ء کا ہے اور باسین پرتگالیوں کے حوالے کردیا۔ اس نے یہ ذمہ داری بھی اپنے کاندھوں پر لے لی کہ گجرات کے کسی حصے سے پوربی ایشیا کو جانے والے جہازوں، ہندستان سے باہر کسی علاقے کی طرف جانے والے جہازوں اور باہر سے ہندستان آنے والے جہازوں کو دیکھے گا کہ ان کے پاس پرتگالی اجازت نامے ہیں یا نہیں ہیں۔ اسی سلطان نے 25 اکتوبر 1535ء کو ایک اور معاہدے پر دستخط ٹھونک دیئے اور پرتگالیوں سے کارٹیز یز لینے کی شرط بھی مان لی۔ یہ معاہدہ اس وقت کیا گیا تھا ایک قلعہ بنوانے کے لئے دیو پرتگالیوں کے حوالے کردیا گیا تھا۔ (5) وہ جہاز جو پرتگالی اجازت ناموں کی خلاف ورزی کرتے تھے پرتگالی ان کو پکڑ کر ضبط کرلیتے تھے۔ ہندستانیوں کے لئے یہ صورت حال اذیت ناک تھی مگر کیا کرتے وہ بے چارے کیونکہ پرتگالیوں کی سمندری طاقت کا موثر انداز میں مقابلہ کرنا محال تھا۔ ملک ایاز کے زمانے سے جو تبدیل ہونے والی صورت حال پیدا ہوگئی تھی ان کا مطالعہ معاصر لکھاریوں نے کیا تھا اور انہوں نے لکھا تھا کہ ملک ایاز کے زمانے میں کسی بھی پرتگالی جہاز کو گجرات کے ساحل تک آنے کی ہمت نہیں تھی جب کہ اس کی موت کے بعد ہندستان کا کوئی جہاز پرتگالی اجازت نامہ حاصل کئے بغیر گجرات کے ساحل سے اپنا قدم آگے نہیں بڑھا سکتا

تھا۔(5) ان تمام متعلقین کے نمائندے کی حیثیت سے جن کو پرتگالیوں کے ہاتھوں جو بحر ہند میں جہازوں کی آوت جاوت قابو حاصل کرنے کی کوشش میں جٹے ہوئے تھے، پہلے سے طے کئے گئے بہادر شاہ کے قتل سے اچھی طرح واقف تھے۔(8) ان میں بعض تذکرہ نگاروں کا خیال تھا کہ سورت میں قلعہ خداوند خاں نے بنوایا تھا جس کے بعد میں اکبر کے حکم پر مرمت کی گئی تھی تاکہ سورت سے پوربی ایشیا جانے والے جہازوں پر پرتگالیوں کے حملوں اور قبضے کو روکا جا سکے۔ گجرات کو اپنے کنٹرول میں لانے کے ارادے سے اکبر نے سورت کا محاصرہ کیا تھا جہاں پہلی بار پرتگالیوں سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔(10) اس قسم کی دوستانہ ملاقات کو غالباً اکبر نے ضروری سمجھا تھا تاکہ مکہ کے لئے جانے والے حجاج کو سہولت ملے اور ان جہازوں کو جس کو پرتگالی ملاح چلاتے تھے اور جن میں حجاج سفر کر رہے ہوتے تھے کوئی نقصان کا خطرہ باقی نہ رہے۔ سورت میں پرتگالیوں سے دوستانہ تعلقات بنانے کے بعد اکبر غالباً 8 مارچ 1573ء کو اتر کی طرف چلا گیا تھا۔ اس نے بھڑوچ اور ممبئی کے راستے احمد آباد کی طرف کوچ کیا تھا۔ ایک معاصر پرتگالی لکھاری کے مطابق پرتگالیوں اور اکبر کے درمیان تعلقات اتنے دوستانہ ہو گئے تھے کہ اس نے کمبے کے ایک پرتگالی بیوپاری سے پرتگالی لباس حاصل کیا تھا اور اسے پہنا تھا۔ اس نے جب بندرگاہ کے شہروں سورت، کمبے اور بروچ پر قبضہ کر لیا تھا تو کمبے کے پچاس ساٹھ پرتگالی بیوپاریوں نے اس سے درخواست کی تھی کہ کمبے میں آنے والے درآمدی مال پر جو کسٹم ڈیوٹی لگائی جاتی ہے اسے معاف کر دیا جائے۔ بادشاہ نے پرتگالیوں کی خوشنودی کا خیال کرتے ہوئے ڈیوٹی معاف کر دی یا کہ ان کو ڈیوٹی سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا۔ یہ بتایا گیا ہے کہ کمبے کے کپتان کو پرتگالی ہر سال تین لاکھ کروزیڈور ڈیوٹی کی مد میں ادا کیا کرتے تھے۔(11) دوستانہ مراسم قائم ہو جانے کے بعد اکبر نے ایک فرمان (18 مارچ 1573ء) غالباً بروچ سے جاری کیا تھا جس میں گجرات صوبے کے حکام، کپتانوں، گورنروں اور دوسرے متعلقہ عملے کو جو خصوصاً سورت، بروچ، نساری اور ولیدورا میں کام کرتے تھے ہدایت کہ وہ پرتگالیوں ان کے علاقوں جیسے کہ دمن میں پریشان نہ کریں۔ اس نے مزید بتایا کہ پرتگالی وائسرائے ڈوم انٹونیو نے اس کے پاس اپنے سفیر انٹوں یو کابل دوستانہ تعلقات کی پیش کش پیغام کے ساتھ بھیجا تھا۔ یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ اول الذکر مقامی حکام مالابار کے سمندری ڈاکوؤں کے ساتھ

ہمدردی کا اظہار نہ کریں بلکہ اس کے برعکس پرتگالیوں کی مدد کریں۔ اگر پرتگالیوں کے غلام گجرات کے مغل علاقے میں کہیں بھی پناہ لیں تو مروجہ قواعد وضوابط کے تحت ان کا فیصلہ کیا جائے اور انہیں ان کے مالکوں کو واپس کر دیا جائے۔ (12)

دوسری طرف پرتگالیوں نے اپنی خیر سگالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مکہ جانے والے اکبر کے خاندان کے لوگوں نے اجازت نامے جاری کر دیئے تھے۔ بادشاہ کے حکام کی درخواست کے تناظر میں اینٹونیو کاربال نے کارٹاز کے ساتھ اپنے جہاز بھی دیئے تھے۔ ان سے یہ درخواست بھی کی گئی تھی کہ وہ اجازت ناموں میں اس خصوصی جہاز کے عملے کو خصوصی توجہ دینے کے لئے ہدایت کریں اور بحیرہ احمر کی بندرگاہ موچا کی طرف سفر کرنے والے اہم لوگوں کی دیکھ بھال کریں۔ کاربال نے فوراً اس کے لئے احکامات جاری کر دیئے۔ مزید یہ بھی طے پایا تھا کہ ہر سال بادشاہ کی خواہش کے مطابق سورت سے مکہ جانے والے ایک جہاز کو مفت اجازت نامہ (کارٹاز) جاری کیا جائے گا اور اجازت نامہ رکھنے والے جہاز کو گجرات کے ساحل پر واپس آنے کے بعد کسٹم ڈیوٹی سے مستثنیٰ رکھا جائے گا۔ یہ طریقہ اکبر کی موت کے بعد بھی جاری رہا تھا اور یہاں تک تھا کہ جہانگیر اور اس کے جانشینوں کو بھی باقاعدگی سے مفت اجازت نامے دیئے جاتے تھے۔ (13)

اجازت جو اس طرح جاری کیا جاتا تھا ان حالات کا حوالہ بھی رکھتا تھا جن کے تحت وہ جاری ہوتا تھا۔ اس میں جہاز کا نام اور ٹنوں کے حوالے اس کا وزن، کپتان کا نام اور اس کی عمر، جانے والے اور واپس آنے والے بندرگاہوں کے نام اور روانگی کی امکانی تاریخ درج کی جاتی تھی۔ جہاز میں جتنا اسلحہ اور ساز وسامان ہوتا تھا اس کا بھی حوالہ قلمبند کیا جاتا تھا۔ جو اشیاء لے جانا منع تھیں ان کا بھی ذکر ہوتا تھا۔ اجازت نامے کے آخر میں لکھنے والوں کے نام، اجازت جاری کرنے والے حاکم کا نام اور اجازت جاری کرنے کی تاریخ بھی درج ہوتی تھی۔

پرتگالیوں کی طرف سے بادشاہ اکبر کو جاری کئے جانے والے اس قسم کے کارٹاز (اجازت ناموں) کے مالیاتی اثرات قابل ذکر بھی اور قابل غور بھی ہیں۔ رائج شرائط وضوابط کے مطابق جن پر گجرات کے سلطان اور پرتگالی حکام دونوں نے اتفاق کیا تھا تمام اور ہر قسم کے گجرات سے جانے والے اور گجرات آنے والے جہازوں پر لازم تھا کہ وہ دیو کے کسٹم ہاؤس

اطلاع درج کروائیں اور کسٹم کی شرح کے مطابق رقم ادا کریں۔ دیو کسٹم گھر کے محصولات سب سے زیادہ نیلامی بولی لگانے والے کو اس کی انتظامی نگرانی کے لئے اسے سونپ دیئے جاتے تھے۔اس لئے بندرگاہ پر مقرر ریونیو لینے والے یہ جانتے ہوئے کہ بادشاہ کو مفت اجازت نامہ دیا جاتا تھا ان پر سالانہ واجب الادا رقم میں سے اٹھارہ ہزار پارداوز منہا کر دیتے تھے۔ (پارداوز = پرتگالی کرنسی)۔وہ باقی رقم کی مانگ کا کسٹم ہاؤس کے کھاتوں سے تفصیل پیش کر کے جواز مہیا کرتے تھے۔اس طرح ہندستانی پرتگالیوں کی مالیات کو اٹھارہ ہزار پاردواز کا گھاٹا ہوتا تھا جس کی صرف وجہ مفت اجازت نامے کا اجرا تھی۔ حساب سے معلوم کیا گیا کہ اس گھاٹے کی وجہ سے پرتگالیوں کی آمدنی میں ہر سال مزید پانچ ہزار پارداوز کا گھاٹا ہو رہا تھا۔

کمبے میں رہنے والے جو اپنے جہازوں میں موچا جاتے تھے اور جن کی تعداد بارہ اور پندرہ کے درمیان ہوتی تھی ان پر لازم تھی کہ دیوا واپس آ کر کسٹم ڈیوٹی جمع کروائیں۔اس حقیقت کے تناظر میں کہ اکبر کا جہاز موچا سے واپسی پر کسٹم محصولات کی ادائیگی سے مستثنیٰ کیا گیا تھا کمبے کے بیوپاریوں نے جہاز میں سونے کا قیمتی مال، بروکیڈ، کورل اور دوسری اشیاء بھی موچا میں بھرنا شروع کر دی تھیں اور یہ حرکت پرتگالیوں کے مفادات سے لگا نہیں کھاتی تھی کیونکہ دیو کا کسٹم گھر (یا چنگی چوکی) ان ہی اشیاء محصولات کی بھاری رقوم پاتا تھا اس حرکت سے ہونے والے گھاٹے نے چنگی چوکی پر بوجھ بڑھایا تھا اور اس کے نتیجہ میں ہندستانی پرتگالیوں کو بھی مالی گھاٹا بھگتنا پڑتا تھا۔(14)

کبھی کبھی بحیرہ احمر سے جہازوں کے ذریعہ لایا جانے والا ساز و سامان جن کے پاس پرتگالیوں کے جاری کئے گئے جو مفت اجازت نامے 1573ء کی باہمی مفاہمت کے حوالے سے دیئے جاتے تھے متوقع حساب کے مقابلے میں کہیں زیادہ گھاٹا دیتے تھے۔جدہ سے بحیرہ احمر کو روانہ ہونے والے پانچ جہاز جن میں مختلف اشیاء بھری ہوئی تھیں۔اگست 1577ء کے مہینے میں گوا پہنچے تھے۔دیو کے ریونیو وصول کرنے والے حکام کی اطلاع پر پرتگالی حکام نے جن کو آمدنی میں گھاٹا ہو رہا تھا ان جہازوں کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا اور ان کو پکڑ کر ان پر قبضہ کر لیا تھا تا کہ یہ معلوم کریں کہ ان کے پاس اجازت نامے ہیں یا نہیں ہیں۔(15) بعد میں ایک اور شاہی جہاز بھی گوا میں دیکھا گیا تھا جسے پرتگالیوں نے پکڑ لیا تھا۔وائسرائے نے فرناؤ مرانڈا

کو حکم دیا کہ وہ جا کر معاملات سے نبٹیں۔ یہ جہاز پرتگالیوں کے جاری کئے گئے مفت پاس لے کر آ رہے تھے لیکن دیو کے ریونیو وصول کرنے والوں نے ان اجازت ناموں کی صحت پر شک کا اظہار کیا تھا۔ جدہ سے واپس آنے والے جہازوں کو گوا کی سمندری پٹی میں لایا گیا اور پرتگالی جہازوں نے ان کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ریونیو وصولنے والوں نے زور دیا کہ ان جہازوں کو دیو کی چنگی چوکی پر بھیج دیا جائے۔ ان کی دلیل یہ تھی معاہدے کے شرائط وضوابط کے مطابق ان جہازوں سے وصول ہونے والی ڈیوٹی پر ان کا حق ہے۔ اس صورت حال میں پھنسنے کے بعد براز ڈی ازیویدو نے وائسرائے فیصلے کا انتظار کیا۔ اس دوران کسی راؤ نامی شخص نے جو گجرات میں مغلوں کا گورنر تھا اپنا سفیر پرتگالی وائسرائے کے پاس بھیجا اور اس سے اکبر کے نام پر پکڑے گئے جہاز کے لئے انصاف طلب کیا۔ اس کے ساتھ ہی گورنر نے سورت سے چند جہازوں کو شاہی جہازوں کی مدد کے لئے بھیجنے کی تیاری کی۔ وائسرائے نے فرانسسکو پائس مال سے بھرے جہازوں کو گوا لانے کے لئے بھیجا۔ آخر میں تفصیلی بات چیت کے بعد جدہ سے پہنچنے والے مال بردار جہازوں کو شاہی نمائندے کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ پرتگالی لاک بک کے اندراج کے مطابق ان جہازوں میں چھ لاکھ کروزادوز کا سونا چاندی بھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کورل۔ بروکیڈ اور دوسری اشیاء بھی تھیں۔ (16)

موچا سے واپس آنے والے گجراتی جہازوں کی پرتگالیوں کے پکڑنے کی خبریں ہندستان کے مختلف حصوں میں پھیل گئی تھیں۔ مالا بار ساحل پر شیخ زین الدین یون نانی نے جو سولہویں صدی کی آخری چوتھ کے لکھاری تھے۔ بیان کیا ہے کہ 1577ء میں پرتگالیوں نے بہت سے گجراتی جہاز پکڑ لئے تھے۔ ان پکڑے گئے جہازوں میں چند اکبر کے بھی تھے جن میں بے حد قیمتی مال بھرا ہوا تھا۔ اس واقع کی بنا پر اکبر اور پرتگالیوں کے درمیان تعلقات میں عارضی وقفے کے لئے تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ بعد تعلقات دوبارہ بحال ہو گئے تھے اور مال بردار جہاز بھی چھوڑ دیئے گئے تھے۔ کوئی بھی جو بیوپار میں جتا ہوا تھا اور سمندر کے آزاد استعمال کا حامی تھا یہی چاہتا تھا کہ اکبر ہندستانی بندرگاہوں سے پرتگالیوں کو نکال باہر کر دے۔ (17)

اکبر اور پرتگالیوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کے باوجود یہ افواہیں ہر طرف تھیں کہ پرتگالی سورت سے پوربی ایشیا جانے والے جہازوں کو پریشان کرتے رہیں گے۔ بادشاہ جب

اودے پور سے گذر رہا تھا تو اس کو بتایا گیا تھا کہ جہازوں پر مسافر جو روانگی کے لئے تیار ہیں ان کو پرتگالیوں کے ممکنہ خطرے سے ڈرایا گیا ہے۔ فوراً گجرات کے ایک طاقتور حاکم قلیج خاں سے کہا گیا کہ وہ ان کی روانگی کو یقینی بنائے اور ایسے اقدامات کرے کہ سمندری سفر سورت سے محفوظ حالت میں شروع ہو۔ یہ حقیقت کہ مسافر دو جہازوں سلامی اور الٰہی پر سفر کر رہے تھے اور اس وقت تک قلیج خان سورت نہیں پہنچ سکا تھا بعد میں جب وہ پہنچا تو پتہ چلا کہ افواہیں بے بنیاد تھیں۔ (18) اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ پرتگالیوں کے ارادوں کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں عموماً تشویش تھی۔

اکبر نے فروری 1580ء میں قطب الدین خاں کو مقرر کیا کہ وہ مالوہ اور گجرات کے حکام کی مدد سے پرتگالیوں کے خلاف فوجی کاروائی کی شروعات کرے۔ دکن کے حکمرانوں پر بھی زور دیا گیا تھا کہ وہ پرتگالیوں کو نکال باہر کرنے کے مشترک مقصد کے لئے اس لڑائی میں حصہ لیں ان کو یہ بھی باور کرایا گیا تھا کہ یہی موزوں موقع ہے جب وہ بادشاہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلا سکیں گے اور پھر ان کی رعایا شاہی حملوں سے بچی رہے گی۔ (19)

اکبر کا خیال تھا کہ فرنگی جو مکہ جانے والے قافلوں اور بیوپار کے لئے سنگین خطرہ بنے ہوئے ہیں بحر ہند سے نکال باہر کئے جانے چاہئیں۔ (20) اکبر جیسے مہان طاقتور بادشاہ کا پرتگالیوں سے اجازت نامے حاصل کرنے کے عمل کو رسوائی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ لوگوں کا موقف تھا کہ شاہی جہازوں کے لئے پرتگالیوں سے اجازت ناموں کا حصول بادشاہ کے مقام اس کی شان اور اس کے وقار کو مجروح کرتا ہے۔ (21) ردعمل اتنا شدید تھا کہ اکبر نے مکہ جانے والے قافلوں ہی کو روک دیا تھا۔ (22) یہ بتایا گیا ہے کہ بادشاہ کے حکم پر ایک فقیہہ نے حج کے قافلوں کی روانگی کو ممنوع قرار دینے کا فتوی اس بنیاد پر جاری کیا تھا کہ جب ایران کے ذریعہ جانے کے راستے میں مسافروں کو شیعوں (قزلباشی) کے ہاتھوں اس قدر مصیبت بھگتنا پڑی تھی اور سمندری سفر کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ پرتگالیوں سے اجازت نامے حاصل کئے جائیں جن پر حضرت عیسیٰ اور مریم کی تصاویر کی چھاپ ہوتی تھی اور جسے مسلمان بت پرستی کا عمل سمجھتے تھے۔ (23) اکبر نے اگرچہ مالوہ اور گجرات کے اپنے حکام کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ دکن کے حکمرانوں کی مدد سے پرتگالیوں کو نکال باہر کرنے کے لئے ضروری اقدامات کریں ریکارڈ کسی

موثر مہم کا حوالہ پیش نہیں کرتا ہے۔ اس کے برعکس اکبر کے جانشینوں حتیٰ کہ جہانگیر اپنے ہرکاروں کو اجازت نامہ حاصل کرنے کے لئے پرتگالیوں کے پاس بھیجتے تھے۔(24) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1573ء سے جب اکبر نے پرتگالیوں سے رسمی تعلقات بنا لئے تھے اور اجازت نامے حاصل کرنے کو منظور کرلیا تھا تو یہ طریقہ اس کی زندگی اور اس کے بعد بھی جاری رہا تھا۔ خواہ اسے کتنا ہی نقصان دہ کیوں نہ سمجھا جاتا ہو۔

ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اکبر نے اپنے زمانہ اقتدار میں پرتگالیوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے تھے اور ان سے نہ کوئی سنگین پنگا لیا تھا اور نہ ان کی سمندری طاقت کو چیلنج کیا تھا۔ یقین کے ساتھ یہ کہنا آسان نہیں کہ سمندری طاقت کے محاذ پر اکبر کی کمزوری نے اسے دوستانہ تعلقات کو ترجیح دینے پر مجبور کیا تھا۔ اس کی حیثیت جیسا ایک حکمراں اگر ضروری سمجھتا تو ایک سمندری طاقت کو ترقی دے سکتا تھا۔ مذہبی تفریق کے اجتماعی تناظر میں اس کے طریقہ کار کے ڈھانچے میں غالباً وہ کوئی ایسا سنگین اقدام نہیں کرنا چاہتا تھا جو پرتگالیوں میں اشتعال پیدا کرنے کی وجہ بن جائے جو کہ کیتھولک تھے گو کہ ہم یہ بھی دلیل مان سکتے ہیں کہ اکبر نے پرتگالی مشنریوں کی اس لئے آؤ بھگت کی تھی کہ اس کے جہازوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ دکن کے اندر موجود پیچیدگیاں بھی ایک مجبوری ہو سکتی ہے جس کے تناظر میں بادشاہ نے پرتگالیوں سے معاملات کو ترجیح دی تھی۔

حوالہ جات

1- سکندر محمد، الیاس منجھو گجراتی۔ مراۃ سکندری مترجم فضل اللہ لطف اللہ فریدی۔ دہلی (طبع ثانی) 1990ء ص 84

2- ایم۔ایس۔ایس۔ آرکائیونیسیونل دا توری ڈوٹومبو (بعد میں اے۔این۔ٹی۔ٹی) لزبن۔ کارٹاس ڈوس وائسیریز مارکو یونیکو نمبر 24۔ کے۔ایس۔ ماتھیو۔ خواجہ صفر دی مرچنٹ گورنر آف سورت اینڈ دی انڈو پرتگیوز ٹریڈ اِن ارلی 16 تھ سنچری۔ جووائس۔ الیرانٹے۔اے۔ٹی زیریا داموٹو اِن میموریم (1) لزبوا۔ 1987ء میں ص 328-319 پر ہے۔

3- گسپر کوریا، لیند اس دا انڈیا (1) کوائمبر 1۔ 1922ء ص 298

4- سماؤ پوتل ہو۔ اوٹومبو ڈوایسٹا دو دا انڈیا۔ روڈرج جوز ڈی لما فیصلو ایڈیشن میں شامل، سب سی ڈیوز پارااے ہسٹوریا ڈوانڈیا پورٹو گیز۔ لزبوا 1988ء ص 148-134

5- ایضاً۔ فولیو 180 وی۔

6- منجھو لکھتا ہے "ملک سرکار کے دوران فرنگی کے لئے گجرات میں داخل ہونا ناممکن تھا اب بہرحال ایسی تبدیلی آئی کہ فرنگی سے اجازت نامہ حاصل کئے بغیر کوئی جہاز گجرات کی کسی بندرگاہ سے روانہ ہونے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ صرف سورت کی بندرگاہ آزاد تھی۔ اس کا سہرا سورت کے سرکاری عملے کی بہادری کے سر جاتا ہے۔ مراۃ سکندری ص 85-84

7- سمندری محاذ آرائی کی تفصیلی معلومات کے لئے دیکھیں ڈیوگوڈی ٹیو، عینٹر یز ڈی ربس اے لوسیتانس اِن انڈیا اپد دیوم گیسٹس انوسلوٹس نوسٹرائی، ایم۔ڈی۔ XLVI کوئمبرا 1548ء۔ گویٹرٹ ایڈیشن۔ لزبوا۔ 1973ء

-8 ابوالفضل۔ اکبر نامہ (1) مترجم ایچ۔ بیورج۔ دہلی 1977ء ص 324-322۔ بدایونی۔ منتخب التواریخ III ص 458

-9 بدایونی، منتخب التواریخ (1) ترجمہ و ترتیب جارج ایس۔ اے رینکنگ۔ دہلی، تاریخ طباعت ندارد ص 150

-10 معاصر فارسی تذکرہ نگاروں نے یہ فرض کیا ہے کہ اکبر کے خلاف لڑائی کے لئے مرزاؤں کی دعوت پر پرتگالی سورت آئے تھے لیکن جب ان کو پتہ چلا کہ اکبر کے پاس ایک لشکر جرار ہے تو انہوں نے سفارتی آداب کا مظاہرہ کیا اور پرتگالی گورنر نے اپنا سفیر اکبر کے پاس بھیجا اور قیام امن و دوستی کی مانگ کی۔ بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ اکبر نے خود ایک سفیر گوا بھیجا تھا جس کے ذریعہ اس نے پرتگالی گورنر سے کہلوایا تھا کہ وہ کچھ لوگوں کو اس سے ملنے کے لئے سورت بھیجیں۔ گوا میں وائسرائے کی طرف سفیر بھیجنے کا یہ اقدام اس لئے بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے اپنے حرم کے کچھ لوگ، اس کی ماں اور دوسرے رشتے دار زیارت کے لئے مکّہ جا رہے تھے۔ دیو نے گو غالباً جس ماں کا حوالہ دیا ہے اکبر کی سوتیلی ماں حاجی بیگم تھیں جن کے ساتھ مریم مکانی (اکبر کی اپنی ماں) اور گلبدن بیگم تھیں۔ ابوالفضل اکبر نامہ III ص 37 دیو گوڈی کاسٹے، دا ایشیا ڈکاڈس 1786ء ص 87-64

-11 ایضاً۔ ص 67-66

-12 دیوگو دو کیٹو جس کو بعد میں پرتگال کے بادشاہ ڈوم فلپ نے آرکیودار مقرر کیا تھا (گوا میں) گوا میں کسی کے لئے اکبر سے فرمان حاصل کیا تھا اور اسے وائسرائے ڈوم فرانسسکو کو دکھایا تھا۔ بعد میں اسے آرکیو میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔ کیٹو کے بقول یہ فرمان بہت اعلیٰ درجے کے کاغذ پر لکھا گیا تھا اور اس پر اکبر کی مہر ثبت تھی۔ اسے تعجب ہوا کہ کس طرح یہ دستاویز گوا میں ایک نجی شخص کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس شخص کے مزاج کے بارے میں قطعی معلومات نہیں تھیں۔ نہ اس کا نام معلوم تھا۔ پرتگالی میں فرمان کا مکمل ترجمہ کو یٹو ڈیکاڈا نے مہیا کیا ہے۔ ص 84-82

-13 جہانگیر کے حکم پر بھیم جی پاریکھ کو جاری کئے جانے والے اجازت نامے میں جو 18 مئی

1620ء کو جہاز مبارک شاہی کے لئے تھا ہر سال مفت اجازت نامے جاری کرنے کی روایت کا حوالہ لکھا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا محرک پرتگالیوں اور بادشاہ جہانگیر کے درمیان دوستانہ تعلقات ہیں۔ ایم۔ ایس۔ ایس۔ ہسٹاریکل آرکیوز آف گوا۔ کوڈکس نمبر 1043۔ ایف۔ ایل۔ 50

14- دیو گودو کو یٹو۔ ڈیکاڈا۔ IX ص 87-86

15- ایضاً۔ X۔ حصہ اول ص 88-287

16- ایضاً۔ ص 304-300

17- ڈیوڈ لوپس۔ ایڈیشن، ہسٹر وریا ڈوس پورٹیو گیز نو مالابار پورز نادم مینسکر پٹو عرابے ڈوسکیولو XVI لزبوا۔ 1898 ص 83۔ جس طریقے سے اجازت نامہ جاری نہ کئے جانے والے جہازوں اور بیوپاریوں کے ساتھ سلوک کیا جاتا تھا اور ہندستانیوں کو رسوا کیا جاتا تھا عربی ارجز: فتح المبین مصنفہ عبدالعزیز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس نے بادشاہوں کو اکسانے کے لئے لکھی تھی کہ وہ پرتگالیوں کے خلاف لڑائی برپا کریں اور ہندستانیوں کے مصائب کو ان کی نظر کے سامنے لائیں جو بحر ہند پر پرتگالیوں کے تسلّط نے پیدا کئے ہیں۔ اوریجنل عربی مسودہ کا او۔ آر۔ نمبر 1044 ہے، حصہ VI ہے فولیو 73-152، انڈیا آفس لائبریری۔ ایم۔ اے۔ سعید خان نے اسی کا ترجمہ کیا ہے جو پی ایم جوشی و ایم۔ اے۔ نعیم ایڈیشن میں ہے ''اسٹڈیز ان فارن ریلیشنز آف انڈیا فرام دی ارلیسٹ ٹائمز ٹو 1947ء حیدرآباد۔ 1975ء ص 182-169

18- ابوالفضل۔ اکبرنامہ III ص 275

19- ایضاً۔ ص 410-409

20- ایضاً۔ ص 757

21- ڈیوڈ لوپس۔ ص 96

22- ایضاً۔

23- بدایونی۔ جلد 2 ص 206۔ ڈیوڈ لوپس۔ ص 96۔ بلوچ مان اس حقیقت کی تردید کرتا ہے کہ اکبر نے 990ھ سے پہلے مکہ جانے والے قافلوں کو روک دیا تھا اور کہتا ہے کہ

ص244 پر دیئے ہوئے ایلیٹ کے اقتباسات غلط ہیں۔ (ابوالفضل۔ آئین اکبری دہلی 1977ء جلد (1) ص 181 الیف۔ این۔ ابوالفضلؔ کے مطابق بادشاہ نے اس وقت تک حج کے قافلوں کو نہیں روکا تھا۔ یہ ایک کہانی ہو سکتی ہے جس کو خان جہانؔ نے بڑھاوا دیا تھا جو ان واجبات سے بھاگنا چاہتا تھا جو اسے اپنی دولت کے عوض ادا کرنا تھے۔ بدایونیؔ نے مزید لکھا ہے کہ مخدوم الملک نے اس خیال سے کہانی کو بڑھاوا دیا تھا کہ قانونی واجبات کی ادائیگی سے بھاگ سکے۔ بدایونی۔ (II) ص206

24- حاشیہ 13 میں حوالہ دیکھیں۔

❁❁❁❁❁

دستاویزات

اکبر کا ایک فرمان 1558ء

سید ظہیر حسین جعفری

حال ہی میں ہندستان کے نیشنل آرکائیوز نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے پروفیسر ابوبکر کی بیوی بیگم امینہ سے خاندانی دستاویزات کا ایک پلندہ حاصل کیا تھا۔ ان کے آباواجداد مغل اقتدار کے دوران طویل عرصے تک دہلی صوبے کی سرکار سنبھل جو پرگنہ چاندپور میں تھی قاضی اور خطیب کی حیثیتوں پر فائز رہے تھے۔ (1) یہ دستاویزات تین صدیوں کے زمانے کا احاطہ کرتی ہیں اور جن کا خصوصی موضوع جائیداد کے تنازعات، مدد معاش کے سرمائے کی تقسیم ان کے ورثاء میں اور زمینوں کی گرانٹ کے کچے اور پکے فرمانوں اور پروانوں سے متعلق ہیں۔ اکبر کے زمانہ اقتدار کے حوالے سے یہ کچھ کاغذات ہیں جو کڑوڑی تجربے کے زمانے (ابتدا 75-1574ء سے ہوئی تھی) کے دوران کے ریونیو (یا محصولاتی) بندوبست پر روشنی ڈالتے ہیں۔ آئمہ دار حضرات اس زمانے کے دوران جن مسائل سے دوچار ہوتے تھے ان کے بارے میں بھی بین السطور معلومات یہ کاغذات فراہم کرتے ہیں اور جس کے نتیجے میں آخرش ہر پرگنے میں بعض آئمہ دیہاتوں میں مدد معاش زمینوں کے ارتکاز کی ضرورت ہوئی۔

موجودہ نوٹ میں، میں صرف ان دستاویزات کی ابتدائی دستاویز کی طرف توجہ دلاؤں جو ایک فرمان کی صورت میں اکبر نے صفر 966ھ یعنی 13 نومبر۔ 11 دسمبر 1558ء میں جاری کیا تھا۔

میں پہلے فرمان کا ترجمہ پیش کروں گا جس کا نیشنل میوزیم آرکائیوز میں 2719/1 نمبر ہے۔

حمد۔ وہ کسی ضرورت کا محتاج نہیں ہے۔ ''ھوالغنی''

(ظفریٰ)۔ جلال الدین محمد اکبر پادشاہ غازی کا فرمان

(دائیں طرف دو آدھی سطروں کے اوپر گول مہر)

(مہر کے بیچ میں لیجنڈ) جلال الدین محمد اکبر پادشاہ غازی ولد محمد ہمایوں پادشاہ غازی۔

(کنارے پر امیر تیمور تک آباؤ اجداد کے نام)

فرمان کا متن

''پرگنہ چاند پور کے وجھداروں کو اطلاع ہو کہ مولانا احمد خطیب شاہی دربار آئے اور عرض گزاری کہ متعلقہ پرگنے کے قصبے کی حدود میں جو موروثی زمین ان کی تحویل میں ہے اس کے حوالہ عرضی گزار اور وجیہہ الدین کے درمیان تنازعہ ہے اور اس متعلقہ تنازعہ کو اسلام کے قاضیوں اور سمبھل خطے کے معتبر علماء کے سامنے رکھا گیا تھا۔ انہوں نے عرضی گزار کا حصہ اسے دیا تھا لیکن اب متعلقہ شخص وجیہہ الدین دستور (یعنی فیصلے) سے انحراف کر رہا ہے۔ عرضی گزار نے جو کچھ بیان کیا ہے اگر وہ سچ ہے تو ان پر قانون کے مطابق (مخاطب کئے گئے حکام پر) کہ وہ اسلام کے قاضیوں اور سمبھل خطے کے معتبر علماء کے جاری کئے گئے فیصلے پر عمل درآمد کا اہتمام کروائیں جن کی طرف سے عرضی گزار کے پاس ایک مظہر (بیان عامہ) ہے اور دوسرے متعلق (وجیہہ الدین) فیصلے (دستور) سے انحراف کی اجازت نہ دی جائے۔ تاریخ صفر 966ھ کو قلمبند کیا گیا۔

صفحہ کے پیچھے (ضمن) پر دو مہریں ہیں ایک عالم شیخ النصار ولد شیخ خضر کی اور دوسری شیخ میر عیسیٰ بابا ولد عبداللہ۔ بدقسمتی سے زیر وکس کی گئی دستاویز کی نقل جو اس کے نیشنل آرکیوز میں پہنچنے سے پہلے لی گئی تھی اتنی صاف نہیں ہے کہ اسے پیش کیا جائے لیکن اصل متن کو پڑھنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی۔

متن کا منشا واضح ہے۔ درج ذیل نکات بہر حال توجہ کے متقاضی ہیں۔

1۔ ان دنوں چاند پور پرگنہ خطہ سنبھل کا ایک حصہ تھا۔ یہ اس اہمیت کی بھی نشاندہی کرتا

ہے جو بابر نے سرکار کی حیثیت سے دے کر سنبھل کو تفویض کی تھی۔(2) بعد وہ اکبر کے صوبہ دہلی ایک سرکار ہو گیا تھا۔(3)

2- جن حکام کو فرمان میں مخاطب کیا گیا ہے ان کے وجہدار کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے جو اکبر کے زمانے کے زندہ رہ جانے والے فرمانوں میں ایک نادر مثال ہے۔ یہ اصطلاح بابر نامہ میں اپنے استعمال کی یاد دلاتی ہے جس کے معنی وجہہ رکھنے والے حکام یعنی جن کو تنخواہ کے عوض علاقائی حدود دے دی گئی تھیں۔(4) اصطلاح وجہہ ان معنوں میں چودھویں صدی کے نصف آخر کی تاریخ سے تلاش کی جاسکتی ہے۔(5)

اکبر کے ابتدائی برسوں کے دوران وجہدار کے معنی اصطلاح جاگیردار یا جے گیردار ادا کرنے لگی تھی۔(6) اس فرمان میں سابق اصطلاح (وجہہ دار) کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک یعنی 1558ء میں اصطلاح جاگیردار زبان زدِ خاص و عام نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس وقت تک وجہہ دار پوری طرح متروک ہوا تھا۔

3- گوکہ مولانا احمد اور وجیہہ الدین کے درمیان تنازعہ ورثے کی زمین سے متعلق بتایا گیا ہے اس میں شک کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے کہ یہ زمین دفتر خطیب کے ساتھ منسلک تھی جس کا کچھ حصہ تنازعے کے دوسرے فریق وجیہہ الدین کے بھی تحویل میں تھا۔ اس کی سند 15 ربیع (II) (ربیع الثانی) 84-982ھ/ اگست 1574ء کا وہ اقرار نامہ ہے۔ خطیب کے فرائض کی تقسیم کے مسئلے پر وجیہہ الدین اور شیخ احمد کے درمیان ہوا تھا۔ یہ طے پایا تھا کہ عیدالفطر کا خطبہ سید وجیہہ الدین دیں گے جبکہ عیدالاضحیٰ کا ان کے باپ شیخ احمد دیں گے۔ جمعہ کے خطبات میں پہلے سے رائج طریقہ کار کے مطابق دونوں فریق حصہ دار رہیں گے۔ اسی طرح دفتر آئمہ خطابت کی تحویل میں موجود دو سو بیگھہ زمین کو بھی اب دونوں دعوے داروں کے درمیان برابر برابر بانٹ دیا گیا تھا۔(7)

4- زیر نظر فرمان کے اجراء سے کچھ پہلے جس انداز سے شیخ احمد اور وجیہہ الدین کے درمیان تنازعہ طے کیا گیا تھا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ مقدمہ فیصلے کے لئے سیکولر حکام کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا بلکہ قاضیوں اور سنبھل و چاند پور کے علماء کی جماعت کے سامنے لایا گیا تھا۔ اس لئے امکان ہے کہ یہ ایک غیر سرکاری۔ غیر نمائندہ جماعت ہوگی جس نے معاملے

طے کرانے کا اہتمام کیا تھا جس کو فرمان میں لفظ دستور سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ لفظ عام طور پر قاضیوں کے عام سے فیصلوں کے لئے مستعمل نہیں تھا۔ وقت بیتنے کے ساتھ اس قسم کا غیر سرکاری۔ غیر نمائندہ طریقہ کار کو زیادہ سرکاری ورسمی اور قانونی ذریعہ ہٹا دیا گیا تھا۔ چنانچہ سابق کاروائی میں جو 1558ء میں یا اس سے پہلے ہوئی تھی مرکز کے حکام کے انتظامی کنٹرول سے محروم رہی تھی۔

5- فرمان تحریر کے دیوانی قسم میں نیم شکستہ خط جو اکبر کے ابتدائی فرمانوں کے مستعمل تھی لکھا گیا تھا۔ کاغذ کے پیچھے (ضمن) کسی حاکم کی کوئی پہچان میں آنے والی مہر یا پڑھنے میں آنے والا سرکاری اندراج نہیں ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مقدمہ کی کاروائی دفتر صدر نے نہیں کی تھی (صدر = وزیر برائے ریونیو گرانٹس)۔ بعد کے زمانے میں اس قسم کی کاروائی کا تعلق دفتر صدر سے کر دیا گیا تھا۔

6- یہ فرمان بیرم خان کی نائب السلطنتی کے دوران جاری کیا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بطور بادشاہ کے وکیل کے اپنے اقتدار و اختیار میں مختار کل تھا۔ لیکن فرمان پر کہیں بھی اس کا نام نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیرم خان کا اختیار رسمی طور پر شاہی احکامات میں منعکس نہیں کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے رسمی تعلق کو ماننے کا فقدان جزواً غالباً بتاتا ہے کہ کیوں اکبر کے ساتھ بعد کے محاذ آرائی میں نائب سلطنت کی حیثیت کو جلد ہی نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

حوالہ جات

1- اتر پردیش کے بجنور اور مراد آباد ضلع میں سنبھل اور چاند پور مشہور شہری قصبات ہیں۔

2- بابر نامہ۔ ترکی متن ایڈیشن ایجی مانو کو یوٹو۔ 1995ء ص 470 انگریزی ترجمہ اے۔ ایس۔ بیورج 11 ص 521

3- آئین اکبری میں چندر پور کو سنبھل سرکار کا ایک پرگنہ بتایا گیا ہے۔ اس سرکار کی حدود میں دستور کے حلقہ کا مرکز واقع ہونا اہم تھا۔ دیکھیں عرفان حبیب۔ ایٹلس آف دی مغل ایمپائر دہلی 1982ء کاغذی چادر 8اے۔ 78+29

4- بابر نامہ ایڈیشن۔ مانو ص 553۔ بیورج کا زیر غور وظیفہ یاب (ترجمہ II ص 617) مشکل ہی سے دوست ہوگا دیکھیں مزید اقتدار عالم خاں، دی مغل اسائمینٹ سسٹم۔ میڈیول انڈیا (1) ایڈیشن عرفان حبیب۔ ممبئی 1992ء ص 68-67

5- عرفان حبیب، کیمبرج اکنامک ہسٹری آف انڈیا میں (1) کیمبرج، 1982ء ص 74-73

6- عرفان حبیب انڈین اکنامک اینڈ سوشل ہسٹری ریویو میں IV(3)1967ء ص 209۔ انہوں نے ایک فرمان دیکھا جو اکبر نے 64-1563 میں جاری کیا تھا اور جو اصطلاح وجیہہ دار کے استعمال کی سب سے پہلی دستاویز ہے۔

7- دیکھیں۔ این اے آئی 2/2919

رام داس اور ماسٹر دیر کے حق میں
اکبر کے ابتدائی فرامین

پروفیسر عرفان حبیب

جنوری 1996ء میں میرے دوست فیکلٹی آف سوشل سائنسیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈین عبدالفضل عثمانی نے اکبر کے تین فرامین کی زیروکس نقلیں دی تھیں جس کے اصل متون جیسا کہ انہوں نے بتایا ضلع آگرہ کے شہر فیروزآباد کے کسی بیوپاری کے تحویل میں ہے جو ان کو کسی کو بھی دینے پر راضی نہیں ہے۔ زیروکس سے نکالی گئی نقول پروفیسر عثمانی نے سینٹر آف ایڈوانس اسٹڈیز اِن ہسٹری، علی گڑھ کی لائبریری کو بھی عطیہ کیا ہے۔ اس کے گہرے جائزے کے بعد مجھے یقین ہوا کہ ایک چوتھا فرمان بھی لازماً ہوگا۔ جس کی بدقسمتی سے ایک پٹی ہی زندہ رہ گئی ہے جو عنوان (طغریٰ) اور متن کی پہلی سطر میں کاروائی کے حصے پر مشتمل ہے۔

تین فرمان جو بہتر طور پر محفوظ رہ گئے ہیں (سوائے پہلے کے لئے جس میں بائیں طرف اور نیچے پھاڑ دیا گیا حصہ ہے) بہت دلچسپ ہے، کیونکہ دونوں اپنی اپنی ابتدائی تاریخوں (1561، 1562 اور 1569ء) اور مواد کی ماہیت کے اعتبار سے اہم ہیں۔ ان تمام تین فرمانوں کا ترجمہ اس تحریر کے آخر میں منسلک ہے جس کے ساتھ ہی دستاویزات کے سامنے کے حصوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

سب ہی یعنی تینوں فرمان ایک ہی شخص کے حق میں جاری کئے گئے تھے جو پرگنہ چنواس کا باسی رام داس تھا۔ یہ جگہ ضلع آگرہ میں شہر فیروزآباد کے پاس دریائے جمنا کے بائیں کنارے

پرواقع ہے۔ ضلع آگرہ اتر پردیش میں ہے۔(1) فرمان نمبر دو (1562ء) میں جس طرح رام داس کا حوالہ دیا گیا ہے ''استاد رام داس رنگریز'' پتا ہے کہ وہ استاد رنگریز تھا۔ اصطلاح استاد بہت قریب سے اس اصطلاح کو نمایاں کرتی ہے جو معنی کہ انگلستان کے ہنرمندوں کی روایت میں مستعمل ہیں۔ اس کے الوفا یا تنخواہ کا فرمان نمبر 1 (1561ء) میں حوالہ بتاتا ہے کہ ان دنوں وہ بادشاہ کی ملازمت میں تھا۔ یہاں ہم ابوالفضل کے تبصروں کو دہرانا چاہیں گے جس کے مطابق اکبر کو کپڑوں کے رنگنے سے بے حد لگاؤ تھا۔(2) یہی لگاؤ جزواً وضاحت کرتا ہے اس غیر معمولی توجہ پر جو رام داس کو بطور ماہر ہنرمند بادشاہ کی طرف سے ملی تھی جب وہ اس کی ملازمت میں تھا۔ 1569ء تک ہم دیکھتے ہیں کہ رام داس سبکدوش ہو چکا تھا اور امکان ہے کہ سٹھیا گیا تھا۔ اس پر ایک ایسے شخص نے جنون کا الزام لگایا تھا جس کے ساتھ قرض کی واپسی کے لئے دعوے میں وہ قانونی چارہ جوئی کے مراحل میں بندھا ہوا تھا مگر فرمان نمبر تین جن مواد سے یہ حقائق برآمد ہوتے ہیں بتاتا ہے کہ فنکار کا شاہی استاد اسے اب بھی یاد کرتا تھا اور جو مدد وہ تلاش کر رہا تھا اسے مہیا کی تھی۔ اب ہم فرداً فرداً ایک ایک فرمان کے مواد کا جائزہ لیں گے۔

(II)

مغل انتظامیہ کی تاریخ کے لئے فرمان نمبر (I) منفرد دلچسپی کا حوالہ ہے۔ جہاں تک کہ ہمارا موجودہ علم جا سکتا ہے، یہ جاگیر کی تفویض کا سب سے پہلا حکم نامہ ہے جو زندہ رہ گیا ہے گو کہ دستاویز کے آخر میں اس سال ضائع ہو گیا ہے پھر اس فرمان ربیع تخاکوئی ال کی ابتدا کے حوالے سے تاریخ کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ترکی سال تخاکوئی ال ربیع اور خریف کے موسموں کے مترادف ہیں اکتوبر 1560ء سے ستمبر 1561ء تک جیسا کہ فرمان (II) مورخہ 20 رمضان 969ھ/ 24 مئی 1562ء سے ظاہر ہوتا ہے جو متعلقہ ترکی سال اِٹ اِل کے ربیع اور خریف موسموں کا حوالہ ہے۔ فرمان (I) میں ضائع ہو جانے والا ہجری سال اس لئے یقیناً 968 ہوگا یوں اس کی تاریخ اور مہینہ 21 رجب دیا گیا ہے۔ یہ فرض کر سکتے ہیں کہ وہ 7 اپریل 1561ء کو جاری ہوا تھا۔ یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ فرمان کے پیچھے دو مہروں میں سال 968ء درج ہے۔ اور

دوسرا62(9) درج ہے۔ اس طرح بھی 968ھ/ 1561ء سال اجراء ہو سکتا ہے۔ فرمان پرگنہ چنوار کے اندر جامان کے ٹپے میں ہری گاؤں تفویض کرتا ہے جس کے ساتھ پانچ ہزار تنکہ مرادی کا جامعہ رقمی رام داس کی تنخواہ (در وجہ الوفد) کے تعین میں درج ہے۔ نہ ہی جامان اور نہ ہری پور علاقے کے پرانے ایک انچی سروے کے نقشے تلاش کئے جا سکتے ہیں لیکن ہمیں فرض کر لینا چاہئے کہ دونوں ہی چنوار سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔ ابوالفضل کے یہاں جامعہ رقمی ایک متعین علاقے کی ریونیو آمدنی کا تخمینہ بتائی گئی ہے جو اکبر کے ابتدائی زمانے میں تنخواہ کی ادائیگی کے لئے متعین کی گئی تھی۔(3) زیر نظر فرمان ظاہر کرتا ہے کہ 1561ء میں یہ اصطلاح مغل انتظامیہ میں واقعی مستعمل تھی اگر اس کا استعمال اس سے پہلے بابر کے فرمان مورخہ 13 ذیقعد 933ھ/ 11 اگست 1527ء میں بھی ملتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ پرگنہ وٹالا (پنجاب میں بٹالہ) کے ایک گاؤں کی جامع رقمی دو ہزار تنکہ سیاہ ہے۔(4) اس لیے ہمیں کرنسی جس میں جامع رقمی بابر کے فرمان میں اور فرمان (I) میں دی گئی ہے توقف کرنا چاہئے۔ اول الذکر میں تنکہ سیاہ کے معنی یقیناً لودھی کے زمانے کا ایک ارب تنکہ تھا۔ جہاں میں حساب کر سکا ہوں اب تک تنکہ مرادی کا اولین استعمال اکبر کے فرمان مورخہ 29 ربیع الاول 975ھ/ 3 اکتوبر 1567ء میں ہوا تھا۔(5)

زیر نظر فرمان ان کو چھ برس پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ ایک اور فرمان میں بھی یہی صورت ہے جس کی تاریخ یا تو 975ھ/ 1568ء یا 985ھ/ 1577ء متعین کی جا سکتی ہے۔(6) یہ ممکن ہے کہ اصطلاح مرادی کو اکبر (؟) نے وضع کیا تھا جو خالص تانبے کے تنکے کے لئے مستعمل ہوا تھا۔ اس کو سور حکمرانوں نے متعارف کرایا تھا اور اکبر نے اس کے ڈھالنے کے سلسلے کو جاری رکھا تھا تاہم اس کے تانبے کی صورت پہلے والے کے سیاہ روپ سے متضاد تھی اکبر کے زمانہ اقتدار کے آخری برسوں میں جو شرح لاگو تھی (ایک روپیہ = بیس تنکا) اس کے مطابق پانچ ہزار تنکے دو سو پچاس روپیوں کے برابر ہوں گے۔

اس طرح رام داس کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ اس کی سالانہ تنخواہ پانچ ہزار تنکے (250 روپیہ) تھی جس کے لئے اسے ہری پور گاؤں کا ریونیو (واجبی) جمع کر کے اس میں سے تنخواہ لینے کا حق دیا گیا تھا جس کا جامع رقمی اس رقم کے برابر تھا۔ چونکہ رقمی کل کے بارے

میں عام خیال تھا کہ اس میں زیادتی کی جاتی تھی۔(7) اصل ریونیو جو جمع ہوتا تھا اس سے کافی کم ہوتا ہوگا۔ فرمان اکبران ابتدائی دستاویزات میں سے ایک ہے جن میں اس قسم کی عطا کو پانے والے کے لئے جاگیردار کی اصطلاح استعمال ہوئی تھی۔ یہ اصطلاح پہلے بھی اکبر کے فرمان مورخہ 1 ربیع الاول 967ھ/ 1 دسمبر 1559ء میں ملتی ہے۔(8) ہمارا فرمان (I) مورخہ 17 اپریل 1561ء اس کے بعد کی پہلی دستاویز ہے جس میں یہ اصطلاح آئی ہے۔ 1961ء میں اقتدار حسین صدیقی نے تجویز کیا کہ اصطلاحات جیسے کہ جاگیر اور جاگیردار صرف اکبر ہی کے زمانے میں اختیار کی گئی تھیں۔(9) اب ہمارا زیر نظر فرمان (I) اور زمانہ اکبر کے ابتدائی سالوں کے دوران دوسری دستاویزات ہمیں موقع دیتے ہیں کہ ہم کس طرح یہ اصطلاحات مروج ہوئی تھیں ان کی از سر نو صورت گری کریں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ابتدائی دستاویزات اصطلاح جاگیر استعمال نہیں کرتی ہیں بلکہ صرف جے گیردار استعمال کرتی ہیں۔ بعد کی اصطلاح صرف جے گیرودار کا مخفف ہو سکتی ہے۔ اس کا واضح تلفظ جے گیردار (جے میں حرف یا کی واضح نشاندہی ہوتی ہے) اوپر کے حوالے کے فرمان سال 1559ء میں ہے۔ ہمارے فرمان (I) 1561ء میں بھی بالکل ایسا ہی ہے اور اسی طرح ورنداون کے گوپال داس کے حق میں جاری کئے گئے فرمان مورخہ 5 جمادی الثانی 972ھ/ 8 جنوری 1565ء میں بھی ہے۔(10) صرف بلگرام کے کسی زمیندار کے فرمان میں (جمادی الاول 971ھ/ 17 دسمبر 1563ء تا 15 جنوری 1564ء) میں ہمیں مزید مختصر تلفظ جاگیردار ملتا ہے۔(11)

فرمان (II) اس گاؤں کے مقدمان (سربراہوں)، رعایا (کسان) اور مزارعان (کاشت کار) کو مخاطب کرتا ہے کہ وہ اسے (جاگیر رکھنے والے کو) اپنا جاگیردار مانیں۔ دستاویز چونکہ خود اس عطا کو جاگیر نہیں بلکہ وجہ الوفا کہتی ہے اس لئے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اس وقت لفظ جاگیر سرکاری استعمال میں نہیں آتا تھا حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ کسی علاقے کے ریونیو وصول کرنے کے مجاز کو عموماً جاگیردار کہا جانے لگا تھا۔ یہ قسم پہلے عام استعمال میں ظاہر ہوا اس کا سرکاری استعمال بعد میں ہوا۔

لفظ جاگیر کی عام استعمال میں مقبول جے گیردار کی پیدائش سے نکلی بہر حال فطری ہے۔

وہ لمحہ جب لوک علم صرف بھول کہ جے گیردار میں جزو گیراور دار ہم معنی ہیں اور زمین کے مالک کے لئے لفظ جاگیراختیار کرلیا جس کے معنی علاقہ نہ کہ شخص کے ہیں۔ یہ اصطلاح پہلے بھی استعمال میں آئی ہوگی لیکن تلفظ جاگیر کی حیثیت سے یہ اصل میں اکبر کے دور کی جاگیروں 75-1574ء کے عارف قندھاری کے بیانیوں میں ملتی ہے اور عارف اپنے بیانیہ کا یہ حصہ 988ھ/ 81-1580ء میں لکھ رہا تھا۔(12)اسی زمانے میں اپنے خطوط جوابوالفتح گیلانی نے 989ھ/ 1581ء میں لکھے تھے اس لفظ یعنی جاگیر کا آزادانہ استعمال کیا تھا اور یہ استعمال علاقے کے معیاری تعین سے جڑا ہوا تھا یعنی بہ اعتبار معنی(13) اس لئے امکان ہے کہ 1570ء کے دوران یہ نیا لفظ انتظامی قلمرو میں اچھی طرح رائج ہوگیا تھا۔

(III)

رام داس کے پاس اس کی جاگیر کب تک رہی تھی۔ بعد کی اصطلاح کی پیشگی وضاحت کے تناظر میں اس کی معلومات یقین کے ساتھ نہیں کی جاسکتی ہیں۔ اس کے حق میں جاری کئے جانے والے فرمان (II) مطابق دوسرے ہی برس (20 رمضان 969ھ/ 24 مئی 1562ء) اسے بطور انعام ایک اور گاؤں میں سو بیگھ زرعی زمین مل گئی تھی۔ اسی پٹہ جامان میں تاتیہ یا تانتھ جو پرگنہ چنوار میں تھا یہ گاؤں واقع تھا۔ اس حکم کا اطلاق خریف، اِٹ اِل کی ابتدا (اپریل 1562ء) سے ہوا تھا۔ ممکن ہے اس سے جاگیر واپس لے کر یہ زمین دی گئی ہو مگر اس حقیقت کا کوئی حوالہ فرمان میں کہیں نہیں ملتا ہے۔

ریونیو (واجبی) کی وصولیابی کے عنوان سے رام داس کے نام جاری کئے گئے فرمان میں جس کی رو سے وہ سو بیگھ زمین سے وصولیابی کا حق دار تھا اور جس کا اطلاق خریف اِٹ اِل کے سال سے بعد میں سال بہ سال اس کے حق (درو جہہ) اس کے انعام پر ہوتا تھا۔ اسے دیوان مرکزی کے وہ فرائض بھی انجام دینا تھے جو اس پر لگائے جائیں۔ رام داس کو اس کے انعام ہر قسم کے مالی دعوؤں سے مستثنیٰ کیا جانا اس زمانے کے رائج قاعدہ عام کے مطابق تھا گو کہ دعوؤں کی یہ فہرست مختصر ہی تھی۔ اس عام رائج قاعدے سے باہر جو چیز ہے وہ اسے دی جانے والی رعایت ہے جو اس کے تمام انعام کو اس کے ابتدائی عطا کے تحت زراعت کی زمین کے خانے

میں کر دیا جاتا ہے۔ جو یقیناً پہلے بھی ریونیو مہیا کرتی تھیں۔ معیاری قاعدہ صرف اصل زمین کے آدھے حصے کو زراعتی زمین کے خانے میں رکھا جانا تھا۔ اور ہم اس اصول کا اطلاق شیر شاہ کے حکم ناموں میں بھی اور ورنداون کے گوپال داس کو اکبر کے احکامات مورخہ 8 جنوری 1565ء میں بھی دیکھتے ہیں جس کا حوالہ پہلے بھی آیا ہے۔(14) اس زمانے کا بیگھ چونکہ بعد کے الٰہی بیگھ کے مقابلے میں دس اعشاریہ پانچ فی صد چھوٹا تھا رام داس کو دیا گیا زراعتی رقبہ جو انعام کی مد میں تھا یقیناً نواسی اعشاریہ پانچ الٰہی بیگھ ہوگا (73ء21 ہیکٹرس)۔(15) آئین اکبری میں دیا گیا ابوالفضل کا تخمینہ کہ مالک ہر ایک الٰہی بیگھ سے کم سے کم ایک روپیہ (بیس تنکے) آمدنی (حاصل) وصول کر سکتا ہے۔(16) رام داس کی امکانی آمدنی جو اس گرانٹ سے ہوتی تھی لگ بھگ سترہ سو نوے تنکا ہوگی۔ جمع رقمی پانچ ہزار تنکے کے مقابلے میں جو رام داس کو جاگیر کے عوض دیئے گئے تھے اس کے مقابلے میں اول الذکر آمدنی کم دکھائی دیتی ہے اور اب امکان ہے کہ ختم ہو چکی ہوگی لیکن چونکہ الفضل نے اعتراف کیا ہے کہ جمع رقمی میں تھوک مبالغہ کیا تھا۔ اصل آمدنی میں دونوں ذرائع سے فرق زیادہ نہیں ہوگا۔

فرمان رام داس کو مزید رعایت دیتا ہے۔ اس میں پڑھا جا سکتا ہے کہ رام داس اس گاؤں میں پہلے ہی سینتیس بیگھ زمین کا مالک تھا۔ اس کی اپنی فصلیں (زراعت خاص) جس کو ظاہری طور پر اس کے انعام کی گرانٹ میں شامل کیا جانا چاہئے تھا۔ لیکن اس متعین رقبے پر اس کو ربیع اِٹ اِل (اکتوبر 1561ء) کے شروع سے زمین کے ریونیو کو محفوظ رکھنے کی اجازت تھی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ رنگ ریز استاد پہلے ہی آٹھ اعشاریہ سوالہ ہیکٹرس زمین رکھتا تھا جس کا ریونیو وہ ادا کرتا تھا۔ ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ اتنا بڑا زمین کا رقبہ اسے کیسے ملا تھا۔ نہ ہم اس پر زور دے سکتے ہیں کہ ساری زمین پر وہ خود اجرتی کھیت مزدوروں کے ذریعہ کاشت کرواتا تھا۔ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ رام داس ان سینتیس بیگھ زمین کا ریونیو ادا کرتا تھا (غالباً رعایتی شرح پر) اور اپنا منافع اس رقم اور اپنی تھوک آمدنی کے فرق سے جو اپنی زمینوں کو کرائے پر دے کر فصل پیدا کرنے والوں کی حصہ داری یا اجرتی مزدوروں کے ذریعہ کاشت کروانے سے حاصل کرتا تھا۔

(IV)

فرمان 3 مورخہ شوال 976ھ/ 19 مارچ۔16 اپریل 1569ء جو پرگنہ چنوار کے شق دار رائے کالا کے لئے جاری کیا گیا تھا اس قرض کی ادائیگی کا حکم ہے جو رام داس نے دیا تھا۔ قرض کی رقم تیرہ روپیہ تھی۔ تنکہ سے روپیہ کی طرف بطور ذریعہ تبادلہ بدلاؤ قابل توجہ ہے۔ قرض لینے والا شخص ذرائیا تھا۔ احتیاط کے ساتھ تشدید لگا کر جو ہجے متعین کئے گئے ہیں اور صرف علت کے نشان کا اہتمام کیا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ پڑھنے والے لفظ یا نام دریا نہ پڑھیں۔ فرمان بتاتا ہے کہ ذرائیا نے رام داس کے خلاف خلل دماغ کا الزام لگا کر قانونی ثبوت کے جائزے سے بھاگنے کی کوشش کی ہے اور قاضی کے سامنے رام داس کے بیان کو سننے کے اس کے حق کی تردید کی ہے۔ اس لئے رام داس نے شاہی عدالت سے رجوع کیا اور اس کے جمع کرائی عرضی پر یہ حکم دیا گیا کہ شق دار کو چاہئے کہ (الف) کہ درائیا سے قرض کی رقم واپس لے اور رقم واپس لے کر رام داس کو پہنچادے اور (ب) درائیا کو قاضی کے یہاں لے جائے تاکہ وہ قاضی کو یقین دلائے کہ کسی بھی قانونی کاروائی کے ذریعہ رام داس کو پریشان نہیں کرے گا۔

اس فرمان سے ہمیں اس زمانے کے عدالتی نظام کے بارے میں بھی کچھ علم ہوتا ہے۔ کسی قرض کی واپسی کا حکم عام حالت میں قاضی ہی کے فیصلے کے ذریعہ دیا جاتا تھا خواہ دونوں فریق ہندو کیوں نہ ہوں۔ اول الذکر مقدمے میں عدالتی کاروائی سے بالاتر جا کر بادشاہ کی مداخلت یوں ضروری جانی گئی کہ درائیا نے قرض کی واپسی میں ریونیو کلکٹر کے اختیار کا سہارا لیا تھا جو خود بھی ہندو تھا۔ فرمان مزید قاضی کو بتاتا ہے کہ رام داس کو کسی قانونی کاروائی سے جو درائیا کی طرف سے مستثنیٰ قرار دیا جانا تھا۔ ایک پسندیدہ ملازم کے کوئی بھی عدالت کی آزادی کی طرف سے آنکھیں بند کرنے کا مجاز تھا۔

اتفاق سے فرمان ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ان سالوں کے دوران شق دار کا عہدہ کوئی اہم حاکم ہی کو ملتا تھا جو پرگنہ کی سطح پر ذمہ دار جانا جاتا ہو اور جو ریونیو جمع کرنے اور امن وامان کے قیام دونوں کی ذمہ داری پوری کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ بعد میں جب کروڑی کی اصطلاح شاہی ریونیو کلکٹر کے لئے رائج ہوئی تھی، شق دار زیادہ کم تر درجے کے حاکم کے لئے استعمال میں

آنے لگا تھا۔(17)

(V)

خاصی ابتدائی تاریخوں کے یہ فرامین (پہلا فرمان اقتدار واختیار پر بیرم خاں کے ہاتھوں سے اکبر کا کنٹرول حاصل کرنے کے صرف ایک برس بعد جاری ہوا تھا) ایک ماخذ کی حیثیت سے اکبر کی بعد کی مذہبی پالیسی پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ امبر کے راجا بھارمل کو اکبر کے حکم سے اوائل 1562ء میں مغل امراء میں شامل کئے جانے کو خاص طور پر اہمیت دی گئی تھی۔(18) لیکن ہمارا فرمان (1) بتاتا ہے کہ اکبر نے اپریل 1561ء میں ایک جاگیر ایک استاد ہندو دستکار کو جس کا تعلق شاہی انتظامیہ سے تھا عطا کی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ شاہی خدمات انجام دیتے تھے ان کے عقاید کو برداشت کرنے کی خصوصیت کی تشکیل اکبر کے مزاج میں اسی زمانے میں ہو چکی تھی۔ اتفاقاً فرمان 2 مورخہ 24 مئی 1562ء اس سے بھی پہلے کا معلوم فرمان ہے جو ایک ہندو کو اکبر کے حکم سے ریونیو کی گرانٹ دیئے جانے سے متعلق ہے۔

مذہب کی طرف سے اکبر کا غیر رسمی رویہ اس مہر سے بھی محسوس کیا جا سکتا ہے جو عدالتی اور نیم عدالتی معاملات کے لئے جاری کئے جانے والے فرمانوں کے لئے منتخب کی گئی تھی۔ یہ مہر اس ایک فرمان پر ہے جو دسمبر 1563ء۔ جنوری 1564ء میں بلگرام کے کسی زمیندار کے حق میں جاری کیا گیا تھا البتہ مہر بالکل واضح نظر نہیں آتی ہے کیونکہ اس کے بعض حصے بہت ہلکے ہو گئے ہیں۔(19) ہمارا فرمان III جو مارچ۔ اپریل 1569ء میں جاری کیا گیا تھا اس پر مہر کے چھاپ کا نقشہ واضح دکھائی دیتا ہے۔ ہم نے جن مہروں کی چھاپ کا پہلے مطالعہ کیا ہے ان کے مقابلے میں آخر الذکر فرمان کی صاف مہر ہمارے مطالعے میں بہتری کا ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔(20)

''راستی موجب رضائے خداست۔''

''کس نہ دیدم کہ گم شد از مرد راست۔''(21)

سچائی خدا کی منشاء کے مطابق ہے۔

میں نے کسی کو نہیں دیکھا ہے سچے مرد سے اسے کوئی نقصان پہنچا ہو۔

اس مہر کو خواہ جان بوجھ کر بنوایا گیا ہو اس میں سچ کے کردار کا اعلان ہوا ہے مگر اسلام کے ذریعہ کوئی اپیل نہیں کی گئی ہے اور نہ شریعت کا کوئی حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ مہر جنوری 1564ء سے شاہی احکامات پر ثبت کی جانے لگی تھی۔ اور یہ مہر ایک اور علامت ہے اس بات کی کہ اپنی خود مختاری اور اپنے اقتدار کی بنا پر اکبر نے غیر فرقہ وارانہ بنیاد پر استوار کی تھی۔ (22)

(VI)

ہمارے تین فرمانوں کا خط تحریر، ان پر لگی ہوئی مہریں اور اندراجات 1560ء کے زمانے کے طور طریقوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بدقسمتی سے سوائے فرمان (1) کے حمد اور طغرے کے حصے ضائع ہو گئے ہیں البتہ چوتھے فرمان کا چھوٹا سا دستیاب ٹکڑا عملی طور پر اپنے طغرے کی صورت دکھاتا ہے۔ ریونیو کے معاملات سے متعلق مختلف فرامین جو اکبری اقتدار کے ابتدائی مرحلے میں جاری کئے گئے تھے (اور اس سے پہلے بابر نے)۔ (23) ان میں حمد کا جملہ ھوالغنی ہے۔ طغرے کی تحریر میں چمک نہیں ہے جیسے کہ بعد کے زمانے میں ہوتے تھے۔ ابتدائی فرمانوں کا اسلوب بھی سادہ ہوتا تھا۔ بعد میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مہر ڈھالنے والوں نے تکون مکمل مربع اور مستطیل میں بنانا سیکھ لیا تھا۔ (24)

سب ہی تینوں فرمانوں پر لگی شاہی مہریں اپنی صورت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ فرمان 3 جو نیم عدالتی معاملات سے تعلق رکھتا ہے اس پر لگائی مہر کو دوسرے فرمانوں پر لگی ہوئی مہروں سے مختلف ہونا چاہئے تھا جس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا ہے اس پر تحریر بیت (شعر) عدالتی قسم کے فرمان کے لئے موزوں ہے لیکن فرامین 1 اور 2 میں مہروں کا فرق ہونا چاہئے واضح نہیں ہے۔ فرمان 1 پر لگی ہوئی مہر گول ہے، اس کے بیچ میں اکبر کا نام ہے۔ اس کے باپ ہمایوں سے لے کر تیمور تک آباء واجداد کے نام دائرے کے کنارے پر ترتیب کے ساتھ تحریر ہیں۔ فرمان 2 صرف ایک مختصر جملے "جلال الدین محمد اکبر پاشا غازی 967ھ پر مشتمل ہے یہ مہر اسی سال 967ھ/1559-60ء کے ساتھ بعد میں 16 اکتوبر 1568ء کو ورنداون کے جیو گوسائیں کے نام جاری کئے جانے والے فرمان پر لگایا گیا تھا۔ (25) تاہم درمیانی برسوں میں بڑی بغیر سال والی مہریں جن میں اکبر اور اس کے

آباء واجداد کے نام ہیں زمین کے ریونیو گرانٹس کے حوالوں سے 972ھ/1265ء اور 975ھ/1567ء کے جاری کیئے گئے فرمانوں پر دیکھا جاسکتا ہے۔(26)

اکبر کے بیشتر فرمانوں کی طرح جن میں وہ بھی شامل ہیں جو ابتدائی مرحلے میں جاری کیئے گئے تھے ہمارے زیرحوالہ تین فرمان معیاری نستعلیق خط میں نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ نیم شکستہ خط میں ہیں۔فرمان (I) اور فرمان (II) اگرچہ ان کے کاتب الگ الگ ہیں قابل ذکر یکسانیت ہے ان دو فرمانوں اور فرمان 3 کتابت کے اسلوب میں یقیناً فرق ہے۔فرمان 3 کی تحریر کا اسلوب فرمان جو 971ھ/64-1563ء میں جاری گیا تھا سے ملتا جلتا ہے۔آخرالذکر فرمان بلگرام کے کسی زمیندار کے حق میں جاری کیا گیا تھا۔(27) چونکہ ان دونوں فرمانوں کا عنوان عدالتی معاملات ہیں جن کا وزارت مالیات سے کوئی سمبندھ نہیں ہے اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر فرمان (1) اور (2) کا تحریری اسلوب ان فرمانوں کا جیسا ہے جن کو دیوانی میں تیار کیا گیا تھا تو فرمان (3) اور بلگرام سے متعلق فرمان اس اسلوب میں لکھے گئے ہیں جو عدالتی معاملات سے متعلق دفتروں میں ان دنوں رائج رہے ہوں گے۔

متن کی پہلی دوسطریں ہمارے تینوں فرمانوں میں نصب سطری ہیں جو سخت مغل روایت سے مطابقت کی سند ہیں۔یہ روایت فرمانوں کی کتابت کے حوالے سے فعال تھی۔

(VII)

یہ واضح ہے کہ فرمان کے پچھلے صفحے پر بیان قلمبند کرنے کا قاعدہ تھا۔اس میں ان تمام اہم وجوہ کا ذکر ہوتا ہے جن کی بنیاد پر فرمان جاری کیا جاتا تھا جس میں اصل متن کا خلاصہ شامل ہوتا تھا جن میں ان تفصیلات کا اندراج ہوتا تھا جو فرمان پر نہیں قلمبند کی جاسکتی تھیں مگر ہمارے زیرنظر تین فرمانوں کے زمانے تک اس قسم کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔اصلاً فرمان میں کنارے کے دائیں طرف نیچے ایک وضاحت لکھی جاتی تھی جس کا بیان ہوتا تھا کہ رام داس کو زمین ملنے کے بعد سے ایک مدت کے لئے حکام جس قدر بھی ریونیو جمع کرتے ہوں، چنوار کے دیوان کو چاہئے کہ اب وہ یہ ساری جمع دوبارہ اسی کو ادا کردے لیکن پچھلے برس کے بقایاجات کے خزانے کے دعوے بہرحال ناقابل رعایت ہی رہیں گے۔واضح طور پر یہ وزارت مالیات کے کسی حاکم

کی طرف سے وضاحت ہی ہے اور جو بعد کے آنے جانے والے زمانے میں یا تو فرمان کے صفحے کے پیچھے (ضمن) پر یا پھر ایک علیحدہ سرکاری حکم نامے (پروانہ) میں قلمبند کی جاتی تھی۔

ہمارے زیر نظر تین فرمانوں کے پچھلے صفحات (ضمن) پر ایسے شرفاء اور حکام کی مہریں اور سرکاری اندراجات ہیں جن کو رجسٹر میں لکھا جاتا تھا (اندراجات جیسے ''ثبت شد''۔ ''قلمی شد'' تاریخ کے ساتھ لکھے جاتے تھے)۔ فرمان 1 اور 2 میں اندراجات کے ساتھ ''فی ات تاریخ یعنی وہی تاریخ کا اضافہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرمانوں کا جائزہ لئے جانے اور ان متنی مواد کو اسی تاریخ میں مختلف رجسٹروں میں لکھا جاتا تھا۔ ان اندراجات کی تاریخ اور فرمان کے اجراء کی تاریخ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بعد تاریخوں میں فرق دیکھا جانے لگا تھا گویا دفتری عملہ سستی کا مظاہرہ کرتا تھا اور ایک سے دوسرے یا متعلقہ شعبوں تک فرمان کے پہنچنے میں دیر ہو جاتی تھی فرمان 1 اور 2 کے پچھلے صفحوں (ضمن) پر موجود بہت سی مہروں میں شرفاء کے نام ہوتے تھے جو اکبر کے زمانے میں بہت شہرت رکھتے تھے۔ چونکہ ان کو ایک دوسرے کے چودہ مہینے بعد جاری کیا جاتا تھا یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ ان فرمانوں پر اپنی مہروں کے ذریعہ بعض حکام خود کو بطور نمائندہ ظاہر کرتے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مہر میں خدا کے بندے، منعم ولد مرام ولد ناصر درج ہے جو کہ منعم خان خانِ خاناں ہے۔ وہ اس زمانے میں وکیل السلطنت، نگرانِ سلطنت یا اعلیٰ ترین وزیر تھے۔ (28)

پھر ہم دیکھتے ہیں، بندہ خدا شہاب الدین احمد خاں الحسینی۔ اس زمانے میں وہ کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور اس حوالے سے اٹکا خاں کے قتل کے جو 16 مئی 1562ء کو آدھم خاں نے کیا تھا ایک گواہ تھے۔ اس وقت شہاب الدین شاہی محل میں منعم خان اور اٹکا خان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے جو وزارت مالیات کے کام کرنے کا دن تھا اور سرکاری کام نبٹانے میں لگے ہوئے تھے۔ (29) یہ بات مزے دار ہے کہ معاملے کے طے نہ ہونے سے صرف آٹھ دن بعد انہوں نے اپنی مہریں (غالباً مشترکہ اجلاس کے دوران) ہمارے فرمان 2 پر ثبت کی تھیں جو 24 مئی کو جاری ہوا تھا۔ (30)

فرمان 2 کے پچھلے صفحے (ضمن) پر دوسرے جانے مانے حکام کی مہریں دکھائی دیتی ہیں اول مظفر خان تربتی اور دوم صادق خاں۔ اس وقت مظفر خاں کو خان کا باقاعدہ لقب نہیں ملا تھا

چنانچہ ان کو "مظفر خاقانی" لکھنا پڑتا تھا۔ (بادشاہ کا ملازم مظفر) لیکن ان کو خاں کا لقب ملنے والا ہی تھا اور دوسرے ہی برس 1563ء میں وہ وزیر مالیات ہو گئے تھے۔ (31) فرمان 3 کے پچھلے صفحے پر جو 1569ء میں جاری ہوا تھا ان کی مہر کا قصہ مختلف تھا جس میں پڑھے جانے والے الفاظ مظفر خان توچی ہیں؟ تربتی۔ صادق خاں 1562ء سے ہی اکبر کے اہم عہدیدار تھے۔ ان کو مالوہ میں آدھم خاںؔ کے کاموں اکبرؔ کو خفیہ رپورٹ پیش کرنے کا فرض سونپا گیا تھا۔ (32) ہمارے ماخذ میں 1562ء کے دوران ان کا کسی مرکزی انتظامی شعبے میں فرائض کی ادائیگی کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔

فرمان 1 کی مہر سے ایک عہدیدار پہچان میں آتا ہے وہ کمال الدین حسینؔ علی ہیں۔ یہ نام یقیناً کمال الدینؔ حسین ہو گا جو 56-1555ء میں بطور شہزادہ اکبر میں دیوان بن کر ہندستان آئے تھے۔ ان کے والد مقصودؔ علی مرزا کامراںؔ کے دیوان رہ چکے تھے۔ (33)

فرمان 3 کے پچھلے صفحے پر مظفر خاںؔ کی مہر کے بغل میں ایک اور مہر ہے جس کے قصے کو پڑھ کر معلوم کرنا بہت محال ہے لیکن لفظ قاضی الاسلام واضح ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ مہر پر عبدالنبی کا بھی نام ہو۔ عبدالنبی کو 1565ء میں صدر مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی تقرری کی سفارش مظفر خاں نے کی تھی۔ (34) ان کو 1569ء کے عدالتی معاملات کا کام بھی دیا گیا ہوگا لیکن بعد کے زمانے کی ان کی مہروں کی عبارت مختلف ہے اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالنبی کا لقب شیخ الاسلام تھا نہ کہ قاضی الاسلام۔ (35)

فرامین 1، 2اور 3 کے ترجمے

فرمان۔1

(اصل فرمان کے اِدھر اُدھر پھٹ جانے کی وجہ سے کچھ جگہوں کا متن ضائع ہو گیا۔ان مقامات کی نشاندہی ستارے ☆ کے نشان سے کی گئی ہے)

فرمان کے سرنامے پر حمد ہے مگر ظفری ضائع ہو گیا ہے۔

بیچ میں گول مہر ہے۔

جلال الدین محمد اکبر پاشا غازی ولد محمد ہمایوں پادشاہ غازی۔ جو مہر کی گولائی میں ہے

ولد ظہیر الدین محمد بابر، پادشاہ غازی ولد عمر شیخ ولد

سلطان ابو سعید ولد سلطان محمد ولد میران شاہ اور

امیر تیمور۔

متن۔

اس وقت ظل الہٰی کی تابعداری متقاضی ہے کہ عنوانِ پیش فرمان جاری کیا جائے کہ ربیع (کی فصل) کی ابتداء سے تخا کوئی اِل پٹہ جانا متعلق پرگنہ چنوار میں گاؤں ہمیر پور جس کی جمع رقمی 25 ہزار تنکے مرادی ہے تنخواہ کے بجائے اس کے دارالا وجہ اسلام کے وفادار رام داس کو تفویض کی جاتی ہے۔(36) یہ ضروری ہے کہ حکام بالا، وزارت مالیات عالیہ کے حکام اور ریونیو جمع کرنے والے اور وہ تمام لوگ جو کہی گئی سرکار میں معاملات اور امور کو کنٹرول کرتے ہیں یہ جانتے ہوں کہ (تفویض) کو اس طرح طے کریں جس طرح کہ اسے یہاں قلمبند کی گئی ہے اور کسی قسم کے تبادلے یا تبدیلی کی اجازت نہ دیں۔ یہ بھی لازم ہے کہ متقدمین، رعیت

(کسان) اور کاشتکار حضرات (مزارعین) جو اس گاؤں کے ہیں اسے (رام داس کو) اپنا جاگیردار مانتے ہوئے اپنی واجب الادا رقوم (واجبی) ہر برس دونوں فصلوں کے تعلق سے ادا کریں گے اور کسی خلاف ورزی یا غلطی کی صورت میں اسے (رام داس کو) جواب دہ ہوں گے۔ اور کسی غلطی یا حکم عدولی کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ سب کے لئے طے کیا گیا فرض ہے کہ معزز فرمان کے مطابق وہ جو کچھ بھی کہ حکم دیا گیا ہے اس سے انحراف نہ کریں۔

رجب کے مہینے میں اکیسویں دن فرمان قلمبند کیا گیا ہے۔

دائیں طرف کے حاشیے میں اوپر سے نیچے کو اندراج

☆ اندراج (شرح)۔ جو کچھ اور جتنا بھی گاؤں کا محصول (حاصل) جمع کیا جائے، چنوار کا دیوان اس کا تعین کرنے کے بعد اسے اوپر دیئے نام کے شخص (رام داس) کو ادا کرے۔ سرکار (37) کے دیوانی حکام بہر حال پچھلے برسوں کے اس گاؤں کے محصولات کے واجبات لازماً وصول کریں۔...... کے لئے تخفیف کے ساتھ......(38) اور......آفت......

ضمن

گول مہر

بندہ، منعم ولد میران ولد ناصر

گول مہر	چھوٹی گول مہر	گول مہر
بندہ محمد محسن 968	......علی ولد......62	بندہ شہاب الدین خاں الحسینی
گول مہر	گول مہر	گول مہر
محمد کمال الدین حسین علی۔ یقین......	محمد حسین	بندہ
خود۔ خدا کو	968	علی

اندراج

(1) لکھا گیا......؟

(2)اسی تاریخ میں لکھا گیا۔
(3)اسی تاریخ کو مطلع کیا گیا۔ تکونی مہر
(4)اسی تاریخ میں لکھا گیا محمد............
دوسری پانچ مہریں پڑھنے میں نہیں آتی ہیں

فرمان۔2

حمد۔وہ امیر ہے(ھوالغنی)
طغریٰ۔جلال الدین محمد اکبر پادشاہ غازی کا فرمان۔
گول مہر۔جلال الدین محمد اکبر پادشاہ غازی۔967ھ

اس وقت ظل الٰہی کی تابعداری متقاضی ہے کہ عنوانِ پیش فرمان جاری کیا گیا ہے کہ (39) ایک ہزار بیگھ کاشت کی جانے والی زمین جو پٹہ جامان پرگنہ چنوار کے گاؤں تاتیایا تانتھ میں ہے اور جوراج دھانی آگرہ کے حدود میں ہے اسلام کے مطیع انگریز استاد رام داس کے نام کی گئی ہے تاکہ وہ خریف اِٹ اِل کے شروع ہونے سے اس زمین پر واجب محصول (واجبی) وصول کرے اور اسی طرح ہر سال کے بعد کے سالوں میں وصول کرتا رہے۔ یہ اس کے انعام کے دارالوجہہ کی مدد میں ہے اور ان خدمات کے صلے میں ہے جو اس نے مرکزی وزارت مالیات (دیوانِ اعلیٰ) کے لئے ادا کی تھیں۔اس لئے لازم ہے کہ مرکزی وزیر مالیات کے حکام بالا، انتظامیہ کے نگراں ریونیو جمع کرنے والے اور ہندستان کے علاقوں کی مالیات (دیوانی) کے معاملات وامور پر کنٹرول کرنے والے (40) خصوصاً داروغہ صاحبان اور کہے گئے پرگنہ کے انتظامیہ کی نگرانی کرنے والے اس عطا کو طے شدہ سمجھیں جس کا بیان اوپر درج ہوا ہے، کسی قسم کے تبادلے کی اجازت نہ دیں اور زمین کو ناپ کر اس کی ازسرنو حد بندی (چک بستہ) اس کے اختیار میں دے دیں اور اس کو (رام داس) اور اس کے نمائندوں کو پریشان نہ کریں۔ (نمائندہ= گماشتہ ہا) اور نہ کاشت کاروں (مزارعین) کو پریشان کریں۔ان سے زمین کے محصول اور دوسرے واجبات (مال وجہات) نہ مانگیں یا ناپ کا معاوضہ (جریانہ)،

کاشت کرنے پر جبر (تکرارِ زراعت) یاناپ کرنے والے کی فیس (ضابطانہ) کی مانگ بھی نہ کریں۔ اخراجات کی تمام واپسیاں (سائیر اخراجات) اس کے لئے مستثنیٰ سمجھے جائیں اور اسے (رام داس کو) تمام حوالات سے آزاد کیا جائے۔ اس فرض سے آگاہ رہتے ہوئے متعلقہ ذمہ دار حکم کے امور سے انحراف نہ کریں اور ہر سال ایک نئے فرمان یا سرکاری حکم (پروانہ) جاری کرنے کے لئے نہ کہیں۔ مزید یہ بھی طے کر دیا گیا ہے کہ ہر جا کہ اس گاؤں میں 37 بیگھ زمین اس کی اپنی ذاتی کاشت میں ہے (زراعتِ خاص) تو جو بھی اور جتنا بھی محصول (مال) اس زمین پر ربیع کی فصل کے دوران واجب الادا ہو اس سے (رام داس) طلب نہ کیا جائے۔ متعلقہ اہل کار رقم کی رسید کا ایک اعتراف نامہ حاصل کریں (قبض واصل) تا کہ رسید کے مطابق ان کے پاس خرچ کے مد میں ادائیگی کا ثبوت رہے۔ (41)

رمضان کے مہینے کے 20 ویں دن سال 969ھ میں قلمبند کیا گیا۔

صفحہ کے پیچھے (ضمن)

گول مہر

دنیا میں معلومات حاصل کرنے کے بعد

میرانِ تربتی مظفر، تابعدار خاقان (بادشاہ) — (گول مہر)

بھگت (خدمتگار)

اندراج — صادق خان

اندراج مطلع کیا گیا۔ اسی تاریخ میں درج کیا گیا — خانِ سمن؟

اندراج

درج کیا گیا (چھوٹی مہر)

غلام دری؟ ولد محمد 968ھ

(گول مہر)

غلام منعم ولد میران

گول مہر

غلام

تکونی مہر
پڑھنے میں نہیں آتی ہے

فرمان۔3

سرنامہ پر حمد اور طغریٰ ہیں لیکن طغریٰ ضائع ہو گیا ہے۔

مربع نما مہر

جلال الدین محمد اکبر پادشاہ غازی

بیت کی مہر

راستی موجب رضائے درخواست۔کس ندیدیم کہ گم شد از مرد راست

مطیع الاسلام چنوار کے شق دار رائے کالا کو ہر گاہ معلوم ہونا لازم ہے کہ رام داس شاہی عدالت میں آیا ہے۔(42) اور عرضی گذاری کہ اس نے درائیا کو تیرہ روپیہ کی رقم دی تھی۔شخص مذکورہ نے وہ رقم واپس ادا نہیں کی اور قرض کے قانونی ثبوت کو جو زیر غور تھا اس پر رام داس نے الزام لگایا کہ وہ خلل دماغ (جنون) میں مبتلا ہے۔ وہ عرضی گذار کو ڈراتا دھمکاتا ہے اور سوالات کی جواب دہی سے پہلوتہی برتتا ہے۔(43) اس لئے یہ لازم ہے کہ وہ (شق دار رائے کالا)، جب قانونی ثبوت کو سند کا درجہ مل جائے اس شخص کا قرض عرضی گذار کو ادا کروانے کا پابند ہو گا۔اسے یعنی شخص مذکورہ کو درآئیا کو قاضی کے سامنے حاضر ہونے کا حکم طلبی دیا جائے جہاں وہ ضمانت دے کہ بعد ازاں وہ درآئیا کسی بھی قانونی کاروائی کے دوران عرضی گذار کو ڈرائے دھمکائے گا نہیں۔اس حکم کے حوالے سے متعلقہ عملہ احکامات پر کوئی سوال اٹھانے کا مجاز نہیں ہو گا۔

مہینہ شوال سال 976ھ میں قلمبند کیا گیا۔

فرمان کا پچھلا صفحہ (ضمن)

گول مہر	گول مہر
بندہ خدا	......مظفر خاں
قاضی الاسلام، عبدالنبی؟	توچی۔(تربق)
	کوئی اندراج نہیں ہے

تیسری مہر اس قدر ہلکی ہے کہ اس کا پڑھنا محال ہے

حوالہ جات

1- سروے آف انڈیا کے ایک انچی کاغذ 8 / 541 پر چنوار کو چندوار لکھا گیا ہے۔ پہلا ایڈیشن جس کا انحصار 22-1921ء کے سروے پر ہے۔ چندروار سید سے فاصلے دو اعشاریہ پچھتر میل (45ء4 کلومیٹر) پر فیروز آباد ریلوے اسٹیشن سے دہلی کانپور مین لائن پر واقع ہے۔ چندروار کے آثارِ قدیمہ کا مطالعہ اے۔فہرر نے ''دی مونومینٹل اینٹیکس اینڈ انسکرپشنز ان نارتھ ویسٹرن پروانس اینڈ اودھ الہ آباد۔ 1891ء میں 74 میں کیا ہے۔

2- آئین اکبری۔ایچ۔بلوچ مان ایڈیشن (1) کولکتا 67-1866ء ص 104-101

3- اکبر نامہ۔ببلیو گرافکا انڈیکا۔کولکتا 87-1873ء (III) ص 270 آئین اکبری (1) ص 347

4- انڈیا آفس لندن۔آئی۔او۔4438 (1) بعد کسی نے اپنے ہاتھ سے 2000 کو 5000 میں بدل دیا ہے۔

5- پرگنہ جالندھر میں مدد معاش سے متعلق ایک فرمان مولانا آزاد لائبریری۔علی گڑھ۔

6- فرمان مورخہ 5 شعبان متعلق درگاہِ اجمیر شریف جو قاضی سید امام الدین کی معین الاولیاء۔اجمیر 1312ھ/1894ء میں ص 67-66 پر ہے۔طبع ثانی بشیر الدین احمد کی کتاب فرامین سلاطین دہلی 1344ھ/1894ء ص 3-2-1۔ابوالنبی کا بطور صدر حوالہ اس فرمان کے لئے 1565ء کے سال کا تعین کرتا ہے۔

7- عرفان حبیب ایگریرین سسٹم آف مغل انڈیا۔ممبئی 1963ء ص 62-261 اور 262 این

8- فرنگی محل کی جمع دستاویزات جو سینٹر آف ایڈوانس اسٹڈیز کی لائبریری ان ہسٹری علی

گڑھ میں ہیں۔

9- لودھیوں کے تحت اقتا نظام۔ پروسیڈنگز آف انڈین ہسٹری کانگریس۔ دہلی 24 واں اجلاس 1961ء کولکتا 1963ء ص 45 اور 49-48 (این۔6)

10- مدن موہن کی لائبریری نمبر 50۔فوٹوگراف مجھے آنجہانی تاراپد مکھرجی نے بھیجے تھے۔)

11- بلگرام کی دستاویزات نمبر 7 ہسٹری میں سی۔اے۔ایس لائبریری علی گڑھ۔

12- تاریخ اکبری معین الدین ندوی، اظہر علی دہلوی اور امتیاز علی عرشی ایڈیشن رام پور 1962ء ص 198-197

13- رقعات ابوالفتح گیلانی محمد بشیر حسین کا ایڈیشن لاہور 1968ء ص 26، 27، 34، 38 لفظ جاگیر کے استعمال اوراس کی اہمیت اکبر کے ابتدائی دور میں دیکھیں اقتدار عالم خان۔ دی مغل اسائمینٹ سسٹم۔میڈیول انڈیا (1) عرفان حبیب کا ایڈیشن دہلی 1992ء ص 67-66

14- عرفان حبیب۔ایگریرین سسٹم آف مغل انڈیا۔ص 302 اوراین

15- ان متبادل پر منحصر جن کا حساب ایضاً ص 63-352 پر ہے۔ مزید دیکھیں شیریں موسوی۔ دی اکنامی آف دی مغل ایمپائر 1595۔اے اسٹیٹکل اسٹڈی۔ دہلی 1987ء ص 99-97

16- آئین اکبری (1) ص 199

17- عرفان حبیب۔ایگریرین سسٹم آف مغل انڈیا ص 76-274 اوراین۔این۔

18- اکبرنامہ (II) ص 56-155

19- بلگرام کول نمبر 7۔ہسٹری میں سی اے ایس لائبریری۔علی گڑھ۔

20- ایس۔اے۔آئی ترمذی۔مغل ڈاکومینٹس 1627-1526ء۔دہلی 1989ء ص 17

21- راہ راست نہیں جیسا کہ ترمذی نے لکھا ہے جو ہر صورت میں مصرعے کے معنی کو بے معنی کردیتا ہے۔شرف الدین علی یزدی کے ظفرنامہ میں اسی آہنگ اور بحر میں دوسری بیت نقل کی گئی ہے۔ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔کولکتا 1888ء (II) ص 21

22- ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ مہر کو ہٹا کر اس کے بجائے تکونی مہر لگائی گئی تھی۔1572ء میں سبحان

اللہ کول: فرمان (1) مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ۔

23- بآبر کا فرمان 933ھ/1527ء جو انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔آئی۔او۔4438(1)

24- بآبر کے فرمان میں بھی طغریٰ اسی طرح سادہ ہے۔آئی۔او۔(1) 4438۔اکبر کے دوسرے ابتدائی فرمانوں میں بھی یہی صورت ہے۔

25- ورنداون ریسرچ انسٹیٹیوٹ، ورنداون، فرمان اے سی نمبر 1

26- مدن موہن 975ھ کا اکبری فرمان جو مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

27- بلگرام کول نمبر 7 ہسٹری لائبریری میں سی۔اے۔ایس۔علی گڑھ۔

28- اقتدار عالم خاں۔دی پولیٹکل بائیوگرافی آف اے مغل نوبل منعم خان، خانِ خاناں۔ دہلی 1973ء ص 59 ایف۔ایف۔داد ناصر کے نام کا مہر پر نام منعم خان کے والد اور مرام ناصر کے درمیان فرق کی نشاندہی کے لئے ہے۔

29- اکبر نامہ II۔ص 174

30- منعم خاں اور شہاب الدین احمد خاں دونوں قتل کے وقوع کے بعد آگرہ چلے گئے تھے۔ ان کو ڈر تھا کہ جرم کے معاملے میں ان کے ملوث ہونے کا شک اکبر کے غصے کا باعث ہو گا۔ان کو واپس آنے کی ترغیب دی گئی تھی پھر بھی وہ دوبارہ جون 1562ء میں بھاگ گئے تھے۔اقتدار عالم خاں ص 67

31- اکبر نامہ II ص 197

32- ایضاً (1) ص 140

33- بایزید بیات، تذکرہ ہمایوں و اکبر۔ایم۔ہدایت حسین ایڈیشن۔کولکتا 1941ء ص 85-184۔کمال الدین حسین کی مہر اکبر کے فرمان 4 ربیع الثانی 983ھ/ 13 جولائی 1575ء کے ضمن پر موجود ہے۔ہسٹری لائبریری میں سی۔اے۔ایس۔علی گڑھ

34- اکبر نامہ II ص 48-247

35- دو فرمانوں پر جو 983ھ/1575ء کے ہیں ان کی مہروں کا قصہ ہے۔"عبدالنبی ابنِ احمد الحنفی، خادم علم حدیث نبوی (ہسٹری میں سی۔اے۔ایس۔علی گڑھ)۔دیکھیں

اتر پردیش ریکارڈ آفس الہ آباد، نمبر (II) 23- شیخ الاسلام کا لقب ضمن میں عبد النبی کے نام کے ساتھ فرمان 14 ربیع الثانی 976ھ/ اکتوبر 1568ء میں ہے۔ (وندراون ریسرچ انسٹیٹیوٹ۔ فرمان اور نمبر 983 سی۔اے۔ایس اِن ہسٹری لائبریری علی گڑھ میں)

36- مطیع الاسلام، کسی ہندو عہدیدار کا لقب یا کوئی اور اس اصطلاح کو بعد میں اکبر کے دفتر نے ختم کر دیا تھا۔

37- لیکن سرکار (غالباً آگرہ) اس فرمان میں پہلے نہیں استعمال کیا گیا تھا۔

38- الفاظ پڑھنے میں نہیں آتے ہیں۔

39- متن کا حصہ پھٹا ہوا اور غائب ہے۔

40- ہندستان کے ساتھ اکبر کی سلطنت کا فرق۔ (اتری ہندستان/ ہندستان) 1562ء میں دیکھیں۔

41- ترجمہ میں فرض کیا گیا ہے کہ فواہد داشت غلطی سے لکھ دیا گیا ہے۔ اصل ہو گا خواہند داشت۔

42- پہلی سطر کے آخر میں متن کا تھوڑا حصہ ضائع ہو گیا ہے۔

43- ازسوال ہیچ باشد۔

❁❁❁❁❁

سلطنت دکن 1591ء کے محصولات کا ایک تخمینہ

شیریں موسوی

مختلف پہلوؤں کے حوالے سے ایسے اعداد و شمار کی معلومات سے جو اہم اور کم سے کم ہندستان کے لئے اہم ہوں اس میں ایسی اہلیت پر دلیل ہے جس کی مثال پہلے نہیں ملتی ہے۔ وہ پہلا آدمی ہے جس نے پرگنوں کی سطح تک پہنچ کر ریونیو کے اعداد و شمار جمع کئے اور ان کو قلمبند کیا۔ اس نے عملاً پورے ہندستان کے اعداد و شمار کو اکٹھا کر کے تحریر کے ذریعہ محفوظ کیا۔ دوسرے ماخذ سے ہم جو اعداد و شمار بطور حوالہ حاصل کرتے ہیں ابوالفضل کے دیئے ہوئے اعداد و شمار سے ان کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔(1) اس لئے سب سے پہلا اکبر نامہ کا غیر مطبوعہ مسودہ ہمارے لئے کچھ دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔ اس میں ابوالفضل نے 36 الٰہی کے اپنے بیان میں خاندیش، احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈا، بیدر، اور وجے نگر کی سلطنتوں کے محصولات کے تخمینے درج کئے ہیں۔(2) 21 مارچ 1598ء کو اکبر نامہ (3) کا جو مکمل مسودہ اس نے رسمی طور پر اکبر کے سامنے رکھا تھا اس میں اول الذکر بیانیہ حصہ شامل نہیں کیا تھا چنانچہ دکن کی ریاستوں سے متعلق ان تخمینوں سے لوگ زیادہ واقف نہیں ہو سکے تھے۔(4)

شاہی کمانڈروں نے اگر چہ ابھی تک ملک کے دکن تاراج نہیں کیا ہے لیکن دکن کے ہر حکمراں (5) کی حدود کی جمع جن کا حساب ان علاقوں کے تجربہ کار حساب داروں نے رکھا تھا چاہیے کہ حکیم مستی اور دوسرے اس کو یہاں قلمبند کیا جا رہا ہے۔ دکن کا ایک تنکہ پورے ہندستان کے آٹھ تنکوں کے برابر ہوتا ہے جو 16 دام بنتا ہے۔ اس روپیہ کے حوالے سے (دکن کا تنکہ) ملک خاندیش کی جمع ڈھائی کروڑ ہے۔ جو چالیس کروڑ دما کے برابر ہوئی۔ احمد نگر کا (6) نظام

الملک جس کا کہ وہ ملک ہے اس کے پورے علاقے کا ریونیو اس علاقے کا نو کروڑ تنکے ہے جو ایک سو چوالیس کروڑ دام کے برابر ہوا۔ عادل خاں جس زیر حکمرانی بیجاپور اور اس کے علاقے ہیں اس پورے علاقے کا ریونیو بارہ کروڑ تنکہ ہے جو ایک سو نوے کروڑ دام کے برابر ہے۔ گولکنڈہ کا حاکم قطب الملک ہے جس علاقے کی جمع ساڑھے تین کروڑ تنکہ ہے جو چھپن کروڑ دام کے برابر ہے۔ بیدر کا علاقہ (زیر حاکم بیدر) کی آمدنی آدھ کروڑ تنکہ یعنی آٹھ کروڑ دام ہے۔ رام راج کے رجواڑے کی جمع اس علاقے سے چار کروڑ تنکہ آمدنی دیتی ہے جو چونسٹھ کروڑ دام کے برابر ہے۔

ابوالفضل نے دکن کے ریونیو کے اعداد و شمار خاندیش، احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کے حکمرانوں کے یہاں موجود شاہی نمائندوں کی بھیجی ہوئی رپورٹ مورخہ 4 اشتر یوار (36 الٰہی) کے حوالوں کے ملنے کے بعد فوراً درج کی تھی۔ یہ رپورٹ 17 ذیقعد 999ھ/6 ستمبر 1591ء کی تھی۔

حکیم مصری کے بارے میں تفصیلات بہت کم ہی ملتی ہیں۔ وہ دکن سے تعلق رکھنے والا تنہا ماہر ہے جس کا نام ابوالفضل نے اعداد و شمار کے حوالے کے طور پر قلمبند کیا ہے۔ جو کچھ معلومات اس کے بارے میں ملتی ہیں یہاں لکھی جا رہی ہیں۔ آئین اکبری میں حکیم مصری کے لئے بتایا گیا ہے کہ وہ چار سو کے منصب دار تھے۔ (7) ان کا شمار مستند حکیموں میں ہوتا تھا۔ (8) اس کا ذکر پہلی بار اکبرنامہ کے آخری اور حتمی مسودے میں آیا ہے جب بتایا گیا ہے کہ وہ دکن سے 19 مارچ 1591ء کو لاہور کے شاہی دربار میں آیا تھا اور اس نے ابوالفضل کے مثانے کی پتھری کا کامیاب علاج کیا تھا۔ (9) ایسا نظر آتا ہے کہ وہ بعد تک شاہی دربار میں رہا تھا بادشاہ نے اسے کچھ لوگوں کے ساتھ دریائے چناب کے کنارے پر ایک شہر بسانے کے لئے موزوں علاقہ منتخب کرنے کے لئے بھیجا تھا تاکہ بادشاہ نئے شہر کا وہاں سنگ بنیاد قائم کرے (10)۔ 18 امرداد 41 ویں الٰہی، اگست 1596ء وہ شاہی دربار میں موجود تھا اور اس نے ہرن کے شکار کے دوران بادشاہ کو لگنے والے ایک زخم کا علاج کیا تھا۔ (11) اپریل 1599ء میں اسے آگرہ سے برہان پور بھیجا تھا تاکہ وہ شہزادہ مراد کا علاج کرے۔ مراد حکیم مصری کے پہنچنے سے پہلے ہی 2 مئی 1599ء کو وفات پا گیا تھا۔ (12) حکیم مصری آگرہ واپس لوٹ آئے تھے لیکن دکن سے ان کے تعلق کا اندازہ یوں ہوتا ہے کہ وہ 45 ویں الٰہی 1600-1601ء میں واپس دکن چلے

گئے تھے جہاں 16- شعبان 1009ھ/ 1601ء کو ان کی وفات ہو گئی تھی۔(13)

دکن کے علاقوں کے ریونیو سے متعلق تخمینہ جات 1591ء کچھ پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتے ہوں گے کیونکہ حکیم مصری جسے دکن سے آتے ہوئے راستے میں امیر خان غوری نے کچھ وقت تک گرفتار کر کے بند کر رکھا تھا لاہور پہنچ چکا تھا۔(14)

دکن کی ریاستوں کے یہ جمع تخمینہ جات کو جلد ہی اہمیت حاصل ہو گئی تھی کیونکہ ان علاقوں کے ریونیو ان علاقوں پر مغلوں کی فتح سے پہلے تلاش نہیں کئے جا سکے تھے۔ اسی تسلسل میں ان سلطنتوں کی اکثر سرحدوں میں تبدیلی کی وجہ سے مغل صوبوں نے ان جمع تخمینوں کا بعد کے اعداد وشمار سے موازنہ کرتے ہوئے بہت محتاط رہنا ہوگا۔

خاندیش 1600ء میں اکبر کے ہاتھ آ گیا تھا(15) اور 1601ء میں اسے ایک صوبہ بنا دیا گیا تھا اور اس میں گالنا کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ 1633ء میں نن دربار بیجا گڑھ اور سرکار ہندیہ کے حصوں کو مالوہ سے الگ کر کے خاندیش میں شامل کر دیا گیا تھا۔ 1635ء میں اس کے ساتھ بگ لانا کا الحاق کیا گیا تھا۔(16) ایڈ 27، 247 میں دیئے گئے جمع کا تخمینہ کا اسی لئے 1632ء تک صوبے کے اعداد وشمار سے موازنہ کیا جا سکتا ہے مگر 1632ء کے بعد موازنہ کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے بعد موازنہ صرف سرکار برہان پور کی جمع سے کیا جانا چاہئے جو سابق صوبہ خاندیش کا نمائندہ تھا۔

جمع داموں میں	سال(17)	حوالے
40,00,00,000	1591ء	ایڈ۔27،247 الیف 384 اے بی
45,48,04,668	1601ء	آئین اکبری(1) ص 478
29,70,18,561	1605ء	معتمد خان۔ اقبال نامہ جہانگیری (II) او۔آر۔1843 الیف 232 بی
29,70,16,586	1628-33ء	بیاض خوشبو آئی او 828 الیف 181
33,69,30,000	1685ء	دستور العمل عالمگیری۔ایڈ 6598۔الیف 118 بی

1601ء میں پورے صوبے کی جمع میں جس کا ذکر ٹنکوں میں آئین اکبری میں ہے۔

1,26,47,062 تھی اور ہر پرگنہ کے لئے اعداد میں دی گئی رقم 1,26,33,463 تنکہ بتائی گئی ہے۔ یہ اعداد ڈھائی کروڑ مقامی تنکوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ اس کی بنیاد 1591ء میں موصول ہونے والی رپورٹیں تھیں۔ تنکا اگر 16 دام کے برابر تھا تو آئین میں بتائی گئی جمع کو 20,23,52,992 دام ہونا چاہئے۔ ابوالفضل بتاتا ہے کہ 1601ء میں اسیر گڑھ پر قبضہ کرنے کے بعد اکبر نے تنکہ کی قیمت 16 کے بجائے 24 دام کر کے خاندیش کی جمع کو 50 فیصد بڑھا دیا تھا۔(18) اس کے بعد وہ بڑھنے والی جمع 45,48,04,668 دام بتاتا ہے لیکن اسے اگر ہم داموں میں تبدیل کریں تو یہ ایک تنکے کے 24 دام کے تناسب سے غلط اور 36 داموں کی شرح سے صحیح ہوگی۔(24x5ء1) صحیح اعداد 42,52,94,232 حاصل ہوں گے۔ یہ دوگنا اضافہ اصل میں سادہ سی کتابت کی غلطی کی دین ہے۔(19) خاندیش کی جمع کا متبادل جیسا کہ تنکا میں آئین اکبری میں دیا گیا ہے، ایک تنکا کے 24 داموں کی شرح سے ہے اس طرح اعداد 30,32,03,112 دام نکلتے ہیں جو اقبال نامہ 1605ء اور بیاض خوشبوی 1628-33ء کے اعداد سے زیادہ صحیح مطابقت رکھتے ہیں اور خاندیش سرکار برہان پور 1658ء کی جمع سے بھی مطابقت رکھتے ہیں 1591ء میں خاندیش کی بتائی جمع میں اس طرح صاف مبالغہ دکھائی دیتا ہے جو آئین اور بعد کے ماخذ میں صحیح جمع کے مقابلے میں 33 فی صد زیادہ ہے۔

1591ء کی رپورٹ میں احمد نگر سلطنت کی جمع برار کی جمع کو بھی شامل ہونا چاہئے کیونکہ مرتضیٰ نظام شاہ نے 74-1573ء میں برار کا الحاق کر لیا تھا۔(20) 1591ء کی رپورٹ کے مطابق احمد نگر کی جمع کا مقابلہ بعد کے احمد نگر اور برار کے اعداد و شمار کے میزان سے کیا جا سکتا ہے۔

جمع داموں میں	سال	حوالے
1,44,00,00,000	1591ء	ایڈ 27، 247 الف 384 اے بی
80,37,97,986	1605ء	اقبال نامہ او۔ آر 1843ء الف 119 اے
95,37,97,369	1628-33ء	بیاض خوشبوی۔ 1,828 الف 182
1,10,00,00,000	1646-47ء	لاہوری پادشاہ نامہ (II) ص 11-710
1,14,49,12,000	1658ء	ایڈ۔ 6596 الف الف 119 اے۔ بی

نوٹ: آئین اکبری صوبہ برار کے لئے جمع کا ذکر کرتا ہے مگر احمد نگر کے لئے نہیں۔ اس لئے احمد نگر کے اعداد و شمار کا یہاں استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ احمد نگر اور برار کے لئے 1591ء کی جمع خاندیش کے مقابلے میں مزید افراط میں پائی گئی ہے۔ یہ 1605ء کی احمد نگر اور برار کی جمع کے کل کے مقابلے میں 56 فی صد زیادہ ہے اور ان صوبوں کی 33-1628ء کی جمع کے مقابلے میں 66 فی صد زیادہ ہے۔

1636ء میں احمد نگر کے دکنی حصے بیجاپور میں جوڑ دیئے گئے تھے چنانچہ اوپر کے خاکوں میں آخری دو اعداد پہلے کے تین سے موازنے کے لئے بے معنی ہوں گے۔

سلطنت بیدر کے ریونیو (محصول) ہمارے سامنے فرشتہ (1606ء) کا ایک تخمینہ ہے یعنی 4,00,000 سونے کے ہون۔ (21) یہ فرض کرتے ہوئے کہ ایک ہون چار روپیہ کے برابر تھا جیسا کہ 1630ء میں تھا (22) اور ایک دام کے چالیس روپیہ کو لیتے ہوئے اس تخمینے کے مطابق بیدر کا ریونیو 6,40,00,000 دام کے برابر ہونا چاہیئے۔ یہ اعداد 1591ء میں اکبر کے دربار میں بھیجے جانے والے اعداد جمع 8,00,00,000 کے مقابلے میں ایک بار پھر نمایاں حد تک کم ہیں۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کے لئے جو 1686ء اور 1687ء میں مغل عمل داری میں آئے تھے اور جہاں پھر سرحدوں کے حدود میں بہت تبدیلیاں کی گئی تھیں دوسری جمع اعداد کا کوئی مقابلہ کسی بھی سلطنت یا صوبے کے لئے (1680ء میں مغل سلطنت سے الحاق کے بعد) بہت مشکل ہوگا۔

1591ء کی رپورٹ جیسا کہ ابوالفضل نے حوالہ دیا ہے وجے نگر کی سلطنت کو رام راج کے علاقے کے حوالے سے بتاتا ہے کہ اس نام کے نائب السلطنت اور بادشاہ کی بہت اچھی ساکھ ہونے کی بنا پر جو 1565ء میں رکساس تنگدی کی لڑائی کے دوران ہار گیا تھا۔ 1591ء میں وجے نگر سلطنت کا حکمراں اصل میں ون کٹاپتی دیورائے دوم تھا (1614-1585ء)۔ بدقسمتی سے ہیراس نے جو مواد بڑی مقدار میں پیش کیا ہے اس میں کوئی اطلاع نہیں ہے کہ اس حکمراں کے تحت سلطنت کا ریونیو کتنا تھا جس کا مقابلہ ہم 1591ء کے اعداد سے کریں۔ (23) ان حالات میں ہم یا کوئی صرف 1591ء کے اعداد کو جو گولکنڈہ، بیجاپور اور وجے نگر کے

لئے ہیں جوڑ ہی سکتے ہیں اوران کا موازنہ اورنگ زیب کے آخری زمانے کے بیجاپور اور حیدر آباد صوبوں کی جمع اعداد سے کر سکتے ہیں، جب ان دونوں صوبوں میں وجے نگر کا بڑا حصہ بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ان کے نتائج زیر نظر ہیں:

جمع داموں میں	سال	حوالے
31,12,00,000	1591ء	ایڈ۔27،247 الیف 384 اے۔بی
3,34,71,00,065	1687-91ء	ضوابط عالمگیری ایڈ 6598 الیف الیف 130 بی۔132 بی
3,30,30,20,000	1687ء	فریزر 86 الیف الیف 57 بی۔61 بی
3,34,61,52,140	1687ء	انتخاب دستور العمل پادشاہی ایڈنبرگ نمبر 224 الیف الیف 1 بی۔3 بی

1591ء میں بیجاپور، گولکنڈہ اور وجے نگر کی جمع کا تخمینہ اس طرح صرف اسی علاقے کی 1687ء کی جمع کے مقابلے میں صرف 7 فی صد کم ہیں اور 1709ء کے مقابلے میں 11 فی صد سے کچھ ہی زیادہ کم تھی۔ان اعداد و شمار سے پتہ چلا کہ دکن کی ان سلطنتوں کے بارے میں ریونیو کی جو رپورٹ اکبر کو بھیجی گئی تھی اس میں اصل حقائق کو مبالغے کے ساتھ لکھا گیا تھا کیونکہ ہمیں سترہویں صدی کے دوران لگ بھگ 30 فی صد تک قیمتوں کے اضافے کو بھی حساب میں رکھنا ہوگا۔(24) دکن کے بغیر مغل سلطنت کی جمع میں 1595ء اور 1700ء کے دوران 44 فی صد کا اضافہ درج کیا گیا تھا۔(25)

اس طرح یہ یقینی ہو جاتا ہے کہ 1591ء کے لئے دکن کی جمع کو بہت زیادہ افراط کے ساتھ بتایا گیا ہے۔یہی وہ امکانی سبب ہوگا کہ ابوالفضل نے ان کو اکبر نامہ کے آخری حتمی مسودے میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔اس بیان پر ہماری تفتیش اسی لئے نتائج کے اعتبار سے جزواً منفی ہے کیونکہ مبالغے کی سطح کی وجہ سے وہ سولہویں صدی عیسوی کے دکنی مالیاتی ذرائع کے ماہرین اعداد و شمار کے لئے بطور حتمی سند استعمال میں نہیں آ سکے۔باوجود اس کے ان کی

اہمیت یہ ہے کہ ان سے ہم دکن کی ریاستوں مالیاتی قوت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔اس حوالے سے 1591ء تک اس اعتبار سے بہترین علاقہ سمجھا جاتا تھا۔اس کے لئے دکن کے بارہ کروڑ تنکوں کے ریونیو کا تعین کیا گیا تھا۔اس کے مقابلے میں احمد نگر کا جمع ریونیو 9 کروڑ تنکے اور وجے نگر کا ریونیو صرف 4 کروڑ تھے۔غالباً اس سے منعکس ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وجے نگر کے کاندھے پر چڑھ کر بیجاپور سلطنت میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔

حوالہ جات

1- ای۔تھامس۔ ریونیو ریسورسیز آف دی مغل ایمپائر جو دی کرانیکلیز آف کے پٹھان کنگس آف دہلی لندن 1871ء ص 52-54 کے آخر میں چھپا ہے۔ جادو ناتھ سرکار۔ انڈیا آف اورنگ زیب۔کولکتہ 1901ء ص xxxii اور عرفان حبیب۔ ایگریرین سسٹم آف مغل انڈیا۔ممبئی 1963ء ص 328 اور 399-409

2- بی آر۔لائبریری۔ایڈ 27، 247 ایف ایف 384 اے۔بی۔

3- ایس۔موسوی۔اکنامی آف مغل ایمپائر۔1593۔دہلی 1987ء ص 4-9

4- ایچ۔بیورج نے اپنے ترجمے میں ان اعداد و شمار کو لکھا ہے۔ اکبر نامہ ترجمہ۔کولکتا 1897ء ص 890-891 این۔لیکن مغل ریونیو کی شماریات کے تمام طالبعلموں نے اسے نظر انداز ہی کیا ہے۔خود مصنف نے بھی نظر انداز کیا ہے۔

5- متن میں بجائے ہرولی کے ہراوالی ہے۔ جو یقیناً کاتب کے قلم کی خطا ہے۔

6- ایم۔ایس۔میں احمد نگر۔ابوالفضل نے یہاں یہ ہجے کیوں استعمال کیے ہیں واضح نہیں ہے۔یہ غلطی بہرحال کاتب کی نہیں ہوسکتی ہے۔

7- Abu'l Fazl, Ain-i-Akbari, I, ed. Blochmann, Calcutta, 1866-67, p.230.

8- بدایونی۔منتخب التواریخ III احمد علی ایڈیشن۔کولکتا 1886-87ء ص 165

9- اکبر نامہ III احمد علی ایڈیشن کولکتا۔1873ء ص 165

10- ایضاً۔ص 600-601

11- ایضاً۔ص 712

12- ایضاً۔ص 753

13- ایضاً۔ص 783۔فیضی شیرازی نے یکم شعبان 1009ء کواس موت کا سال و دن بتایا ہے۔ بی۔آر۔ لائبریری۔ او آر۔ 619 ایف 274 اے۔ بدایونی جو اپنے بیان کو 1598ء تک لایا ہے اپنی سوانحی جلد میں اس کی موت کا بھی ذکر کرتا ہے اور مزید بتاتا ہے کہ اس کو برہان پور میں دفن کیا گیا تھا۔منتخب التواریخ۔ ببلیوگرافیکا انڈیکا۔III ص165۔تفصیلات بتاتی ہیں کہ بدایونی 1601ء تک مرا نہیں تھا۔

14- ایڈ۔247،27 ایف 483 اے۔بی۔

15- اکبرنامہ III ص779

16- سرحدوں میں تبدیلیوں کی تفصیلات کے لئے دیکھیں عرفان حبیب۔اٹلس آف دی مغل ایمپائر۔دہلی۔1952ء صفحوں پر نوٹس۔9A،14-16A

17- میں نے عموماً ان تاریخوں کو مان لیا ہے جن کے حوالے سے عرفان حبیب نے ان اعداد کا تعین کیا ہے۔ایگریرین سسٹم ص397

18- آئین اکبری (1) ص474

19- ایگریرین سسٹم۔ص406 این۔اور اکنامی آف دی مغل ایمپائر ص29-30

20- ابوالقاسم فرشتہ۔گلشن ابراہیمی۔نولکشور کانپور۔1874ء ص176

21- ایضاً۔II ص177

22- لاہوری۔پادشاہ نامہ (1) الف ص178

23- میں نے اس کے زمانے کے واقعات از سرنو بنانے میں ریو۔ہینری ہیراس کی کتاب دی آرودوڈائینسٹی آف وجے نگر (1) مدراس 1927ء کی پیروی کی ہے ص300-340 اور ص494-512

24- ایس۔موسوی۔جرنل آف دی اکنامک اینڈ سوشل ہسٹری آف دی اورینٹ جلد XXX ص90 میں روپیہ کی فراہمی، قیمتیں، ریونیو کی وصولیابی اور مغل ہندستان میں۔

25- ایضاً۔ص 89۔ میرے اعداد و شمار عرفان حبیب سے مختلف ہیں۔ ایگریرین سسٹم ص328

❁❁❁❁❁

ہندستانی کپڑوں کے موضوع پر
1603ء کی ایک ڈچ یادداشت

عشرت عالم

مغل اقتدار کے زمانے میں کپڑے کی پیداوار کو جو مرکزیت حاصل تھی اس کی نشاندہی مدرلینڈ نے بہت بہتر انداز میں کی ہے۔(1) اس نے ریشمی اشیاء، کپاس اور اون کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان صنعتوں کے بارے میں صحیح ہے۔ دوسری صنعتوں کے ہجوم میں کپڑے کی صنعت کے حریف کم تھے اور دوسری کوئی صنعت پیداوار اور قومی اہمیت کے اعتبار سے کپڑے کی صنعت کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

اس موضوع پر نومبر 1603ء کی ایک ڈچ یادداشت اس حوالے سے دلچسپ ہے۔ اسے اسٹال پاریٹ وانڈ رویلے نے تیار کیا تھا جو کپڑے کی پیداواری قسموں کا خصوصاً وہ جن کو دکنی ایشیا میں منڈی دستیاب ہونے کی توقع ہو اور بیوپار کی بنیاد مصالحہ جات کے ساتھ تبادلہ ہو۔(2)

یادداشت میں درج ذیل اشیاء کی فہرست ملتی ہے:

کین توریا، چھپا اور رنگا ہوا کھردرا کپاس کا کپڑا۔ عموماً ان کپڑوں کی لمبائی 3 لینتھوم اور چوڑائی 4 طول ہوتی تھی۔ اکثر ان کو ہرے یا لال پٹیوں میں رنگا جاتا تھا ان میں گلاب کے پھولوں کی یا دال دار کی چھاپ ہوتی تھی۔ لال رنگ کے کپڑے کو ملایا میں توریاس میں میرا کہا جاتا تھا اور اس کی بہت زیادہ مانگ بھی تھی۔ سبز پٹی والے کپڑے توریا اٹ چو کہتے جاتے تھے اور فی اکائی 3 یا 4 ریال میں خریدے جایا کرتے تھے۔ (یعنی بیس عدد) اور ان کو بند میں 150

سے 200 کٹی ،بنٹ میکس کی شرح سے بیچا جاتا تھا۔(3)2- بافت جوفی تھان 4/3 سے لے کر 4/5 ریال میں خریدا جاتا تھا اور بند میں 40 سے 80 کٹی نٹ میکس میں بکتا تھا۔ 3- کاری کم۔لال اور نیلے کپڑے۔لال کی مانگ زیادہ تھی جس کے 20 تھان 8 سے 10 ریال میں بکتے تھے۔ بندس ان کی شرح بکری 10 سے 20 کٹی نٹ میکس تھی۔4- آسمانی (اوسی نانی، اوسانی) کپڑے 3 سے 4 ریال میں خریدے جاتے تھے۔ 5- کیمائی کائن (کینائی کائین۔کان نیکن)۔سفید کپڑے سوتی جن کی لمبائی 7 اور 8 لینتھوم تھی 1/4 1 سے 1/2 1 ریال میں بکتے تھے۔بند میں ان کی شرح 30 سے 35 کٹی نٹ میکس تھی۔(4)6- مکانیس جو کان نیکن سے زیادہ بہتر ہوتا ہے لیکن کچھ قیمتی ہوتا ہے۔7- تجاونیز (شاونی) چکنا سفید سوتی کپڑا 5 لینتھوم لمبا اور 2 طول چوڑا جوفی بیس تھان 4 سے 6 ریال میں بکتا ہے۔بند میں اس کی شرح 25 سے 40 کٹی نیٹ میکس تھی۔8- شائینڈس (چندلیس۔چھینٹ) مختلف رنگوں کا ریشمی کپڑا جو بند میں فی تھان 40 سے 50 کٹی نیٹ میکس میں بکتا ہے۔ان کو سونا اور چاندی تبادلے میں حاصل کرنے کے لئے عرب ملکوں اور ایران بھیجا جاتا تھا۔سینٹ تھوم اور مائی لاپور چونکہ پرتگالیوں کے قبضے میں تھے اس لئے ڈچ اپنے کپڑوں کو کالی چیور اور آرماگان جیسی جگہوں سے بھیجتے تھے۔مال کو پالی کٹ سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔چیزوں کی فہرست زیرنظر ہے۔ 9- ڈراگون جس میں دو رنگ ہوتے ہیں یا تو لال سفید یا لال۔ ہرایا لال۔ نیلا۔ان کو فی بستہ 130 اور 150 ریال کی شرح سے بیچا جاتا تھا جس میں 160 تھان ہوتے تھے۔10- پٹازان لال یا ہرے رنگ میں بنا جاتا تھا جن کی جسامت لگ بھگ آدھ فینتھوم ہوتی تھی اور مزید ان کے بیچ میں لال یا نیلی پٹی ہوتی تھی۔اس کو فی اکائی 13 سے 16 ریال میں بیچا جاتا تھا۔بند میں اسے 30 سے 45 کٹی نیٹ میکس میں بیچا جاتا تھا۔ 11- پتی سراسی (پتی سراسا) رنگ دار کپڑے جن پر پتوں یا چڑیوں کی شکل چھپی ہوتی تھی فی اکائی 10 سے 13 ریال میں، بند میں 20 سے 30 کٹی نیٹ میکس میں بکتی تھی۔12- سارسس شئے چرامالیس جو سب سے بہترین اور چکنے کپڑے ہوتے تھے فی اکائی 60 سے 70 ریال میں بکتے تھے۔اس سے ہلکے معیار کے 40 سے 50 ریال اور بند میں 50 سے 90 کٹی نیٹ میکس میں بکتے تھے۔اسی طرح 13- سراساگو بائیر فی اکائی 70 سے 80 ریال میں خریدے جاتے تھے۔14- شلیے آئیز (چیلاس) (شیلا)

سفید چیک کا سوتی کپڑا تھا جس پر سیاہ پٹیاں ہوتی تھیں۔

ناگا پٹنم سے درج ذیل کپڑے بندا، سیرم اور دوسری جگہوں کے لئے حاصل کئے جاتے تھے۔ 15- سیلا لاوس (سیلالوس) سیاہ اور گہرے نیلے رنگ کے کپڑے جو فی اکائی 6 سے 8 ریال میں خریدے جاتے تھے۔ 16- بالا سچر (بلایٹوس) سفید، سیاہ اور نیلے کپڑے جو فی اکائی 15 سے 17 میں خریدے جاتے تھے۔ نیٹ میکس میں ان کی خریداری کپڑے کے معیار کی نسبت سے ہوتی تھی۔ 17- پولینگ (پیلانگ) لمبائی 3-2 فیتھوم اور چوڑائی 5 طول۔ فی اکائی 12 سے 15 ریال میں خریدے جاتے تھے۔ 18- ٹاولوپوکان (ٹلوپوکان) لمبائی 1/2 1 فیتھوم اور چوڑائی 1/2 4 طول فی اکائی 6 سے 7 ریال میں خریدے جاتے تھے۔ بندا میں 10، 11 یا 12 تھان نیٹ میکس کے ایک بار میں لئے جاتے تھے۔ 19- بورنیولا یا لمبائی 1/2 1 فیتھوم اور چوڑائی 1/2 4 طول فی اکائی 5 سے 6 ریال۔ ایک نیٹ میکس بار میں 12 سے 13 تھان۔

مسولی پٹنم کے کپڑے۔ 20- مادرائین (موری)۔ لمبائی 4 فیتھوم ایک سستا پٹی دار سوتی کپڑا جس کی دو قسمیں تھیں۔ اسے فی اکائی 10 ریال میں خریدا جاتا تھا۔ بند میں 6 سے 8 تھان نیٹ مکس کے ایک بار میں بکتے تھے۔ 21- ساوتارس (شوتارس) لمبائی 7 سے 8 فیتھوم تک اسے فی اکائی 20 سے 25 ریال میں اور اسے 5 تھان تک 30 سے 40 کٹی نیٹ میکس میں خریدا جاتا تھا۔ 22- سلیم پاورنیز (سالم پوریز) لمبائی 8 فیتھوم سفید سوتی کپڑا جس کے کنارے لال پٹی ہوتی تھی فی اکائی 25 سے 30 ریال میں بند میں 30 سے 40 نیٹ میکس میں خریدا جاتا تھا۔ 23- کین موگو۔ ملایا جیسا زرد سوتی کپڑا لمبائی 2 فیتھوم اور چوڑائی 1/2 3 فی اکائی 8 ریال میں بندا میں فی اکائی 1/2 1 بار نیٹ میکس میں خرید کیا جاتا تھا۔ 24- پٹامالم لمبائی 2 اور چوڑائی فی اکائی 10 سے 12 ریال اور ایک اکائی 2 سے 4 بار رینٹ میکس میں خرید کیا جاتا تھا۔ 25- کائین منڈل نیلا کپڑا سفید پٹیوں کے ساتھ لمبائی 1/2 1 فیتھوم اور چوڑائی 4 فی اکائی 7 سے 8 ریال میں خریدا جاتا تھا اور دو تھان 10 سے 20 کٹی نیٹ میکس میں بند میں بکتے تھے۔ 26- ڈسٹائیرس (دستار) لال رنگا ہوا سوتی کپڑا لمبائی 3 فیتھوم اور چوڑائی 1/2 3 فی اکائی 8 ریال میں خریدا جا سکتا تھا اور 1 اکائی 1/2 1 بار رینٹ میکس میں بکتا تھا۔

27- کائین کوبائیر (کائین گودر۔ بھورا نیلا سوتی کپڑا جس پر سفید اور نیلی پٹیاں ہوتی تھیں لمبائی 1/2 1 فیتھوم چوڑائی 5 فی اکائی، 13 سے 14 ریال میں خریدا جا سکتا تھا۔ بند میں 10 تھان ایک بارینٹ میکس میں بکتا تھا۔ 28- کیسی اوپس، آدھا سوتی آدھا ریشمی پٹی دار کپڑا لمبائی 4 فیتھوم اور چوڑائی 5 طول، فی اکائی 30 سے 35 ریال میں خریدا جاتا تھا۔ بند میں ایک تھان 40 سے 50 کٹی نیٹ میکس میں بکتا تھا۔

بنگال کا کپڑا: 29- ساتو پکوراز۔ سفید سوتی کپڑے لمبائی 6 سے 1/2 6 فیتھوم چوڑائی 5 طول، فی اکائی 16 سے 18 ریال میں خریدا جا سکتا تھا۔ اس میں 3 سے آٹھ تھان ایک بارینٹ مرگس میں بکتے تھے۔ 30- کاسابسا (خاص بازار) لال پٹیوں والا کپڑا لمبائی 8 فیتھوم چوڑائی 5 طول ایک تھان 30 سے 40 کٹی میں بکتا تھا۔ 31- گستا کائٹ گل لمبائی 5 فیتھوم چوڑائی 3 طول فی اکائی 25 سے 30 ریال میں خرید کیا جاتا تھا۔ بند میں کپڑے کا تھان 20 سے 40 کٹی نیٹ میکس میں بکتا تھا۔ 32- رام بوٹی۔ سفید سوتی کپڑا لمبائی 8 فیتھوم جور کاس سر میں ملایا اور جاوا کے پرتگالی 90 سے 100 ماس میں بیچتے تھے۔ (ایک ماس = ایک ریال)۔ 33- بھیروں۔ سفید سوتی کپڑا جو ملاکا یا مکاس سر میں فی اکائی 160 سے 180 ریال تک بکتا تھا۔

(فیتھوم = 8ء1 میٹر)۔ کوریج = ایک اکائی جو ہندستان میں مستعمل نہیں تھی۔ ہندستان کپڑے کے فروخت کی اکائی فی گز تھی جواب فی میٹر ہے۔ (اسپان = طول یا پاٹ)

حوالہ جات

1- ڈبلو۔ ایچ۔ مورلینڈ۔ انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر، این اکنامک اسٹڈی لندن 1920ء ص 184-171۔ مورلینڈ۔ فرام اکبر ٹو اورنگ زیب۔ این۔ اسٹڈی اِن انڈین اکنامک ہسٹری۔ لندن 1923ء ص 58-53

2- میمورے وان نومبر 1603ء اور ڈین ٹوئین میلجن ہینڈے۔ ورنا میلانک میٹ لنچ واڈن، اِن دور انڈی۔ یواٹ گیز ونڈرڈ کیپے این شاول (جاسیل) اوپ ہیٹ ملیشے شیری لینڈ این اِن ڈین ملیشین آرکی پل۔ اصل ہے کامروان زی لینڈ 41.جی اگلے مین رج کرچیف میں۔ ایس۔ گراوین ہج۔ دی نیدر لینڈ۔ ایک جھلی پر لکھا ہوا ہے۔ آرٹی کیلن اینڈے انسٹرکٹین روپ ڈی شپن۔ پوری یادداشت کو احتیاط کے ساتھ جی پی راو فائیر اور ایچ۔ ایچ۔ جوئین بول کی ''ڈی بنٹی کنسٹ ان نیدر لینڈ انڈ نے این ہارگیس چی ڈینس الٹریچ 1914ء مجلیج III ص XI-XXV پر نقل کیا گیا ہے۔ اس کو کسی حد تک جے۔ کے۔ جے۔ ڈی۔ جونگے نے شائع کیا تھا۔ ایڈیشن۔ ڈی۔ اوپ کومسٹ وان ہیٹ نیدر لینڈ گیزاگ اِن اوسٹ انڈے 1610-1595ء (III)۔ ایس۔ گریون ہیگ/ امسٹرڈم 1875ء ص 149۔ پٹن اے چودھری۔ جان کمپنی اِن کورومنڈل۔ 1690-1605ء اے اسٹڈی اِن انٹر ریلیشنز آف یورپین کامرس اینڈ ٹریڈیشنل اکنامیز۔ ایس۔ گریون ہیگ، 1962ء۔ اپینڈکس سی۔ ص 222-221۔ انہوں نے اس میمائیر کا استعمال کیا ہے اور اس کے ذریعہ کورومنڈل کے کپڑوں کی بعض قسموں کا مطالعہ قلمبند کیا ہے۔

3- میمائیر وان 1603ء ص XI

4- ایضاً۔

❁❁❁❁❁

مقالہ نگار

1- احسن رضا خاں۔ ہماچل یونیورسٹی، شملہ میں تاریخ کے پروفیسر
2- انی ردھارے۔ کولکتا یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ اور کلچر کے پروفیسر
3- اقبال حسین۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے سابق پروفیسر
4- اقبال غنی خان۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے ریڈر
5- اقتدار عالم خان۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے سابق پروفیسر
6- پشپا پرساد۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کی ریڈر
7- سید ظہیر جعفری۔ دہلی یونیورسٹی میں تاریخ کے ریڈر
8- سید علی ندیم رضوی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے لیکچرار
9- سوم پرکاش ورما۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر
10- سید عنایت علی زیدی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں تاریخ کے ریڈر
11- سونیتا زیدی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں تاریخ کی ریڈر
12- شیریں موسوی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کی پروفیسر
13- جے۔ ایس۔ گریوال۔ شعبہ کے انسٹیٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز کے سابق ڈائریکٹر
14- کے۔ ایس۔ میتھیو۔ پانڈیچری یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر
15- ایم۔ اطہر علی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق پروفیسر تاریخ
16- فاطمہ زہرا بلگرامی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کی لیکچرار
17- فرانسوئے نالینی ڈیلوے۔ ڈی لٹ سوبورن
18- عرفان حبیب۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے سابق پروفیسر

19- عشرت عالم۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے لیکچرار
20- نجف حیدر۔نیو کالج۔آکسفورڈ
21- ریاض صدیقی مترجم۔پروفیسر (ر) شعبہ اردو سینٹ جوزف گورنمنٹ گرلز کالج۔کراچی
اعزازی پروفیسر شعبہ اردو۔گورنمنٹ ڈگری کالج فار گرلز اینڈ بوائیز اسٹڈیم۔روڈ کراچی

نوٹ: اس کتاب میں شامل بیشتر مقالے سینٹر آف اسٹیڈی اِن ہسٹری، علی گڑھ یونیورسٹی کے منعقدہ سیمینار 1992ء میں پڑھے گئے۔